ہم فکری سے ہم راہی تک

افکار : سید جہانزیب عابدی

جلد پنجم

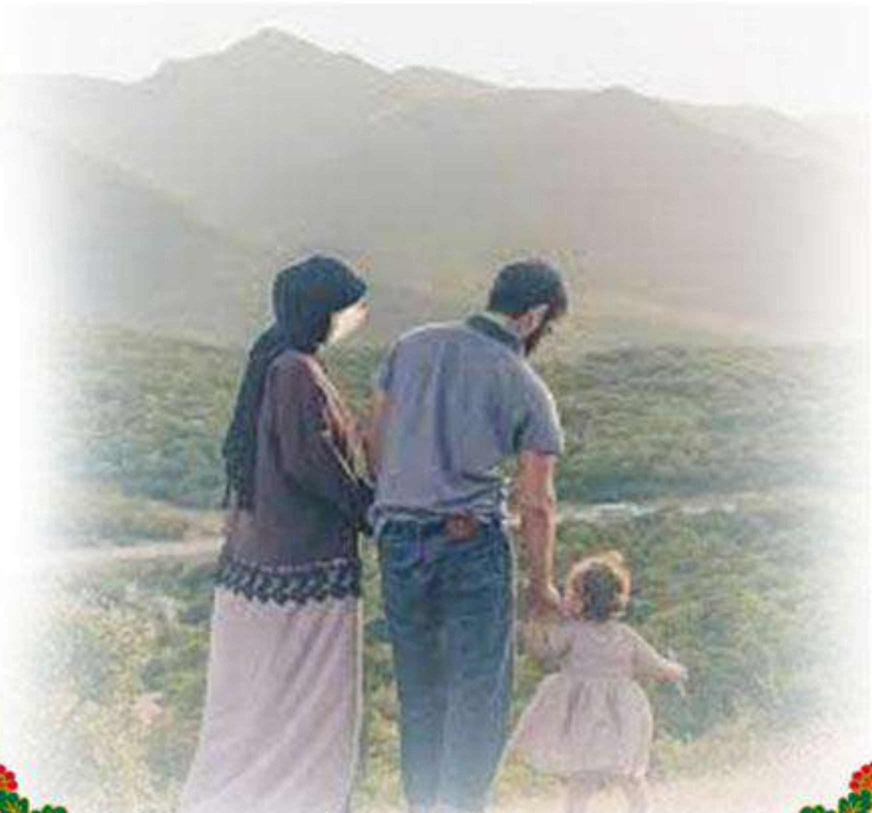

بسم الله الرحمن الرحيم

اللّهُمَّ صَلِّ عَلى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد وعَجِّل فَرَجَهُم

انتساب

اس روشنی کے نام جو ہمارے تاریک ترین اوقات میں رہنمائی کرتی ہے،

امام زمانہ عج کے لیے، انسانوں کے نجات دہندہ، خدا کی نشانی حضرت بقیۃ اللہ،

اور اپنے والدین کے لیے، جو میرے وجود کی بنیاد ہیں، ظاہری اور فکری،

سید سرکار حیدر عابدی (مرحوم) اور سیدہ رفعت عابدی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہا)

آپ کی محبت اور حکمت میرے رہنما ستارے رہے ہیں اور

ان سرپرستوں اور روحانی مربیوں کے نام جنہوں نے میرا راستہ روشن کیا، منزل کو واضح کیا۔۔۔

آیت اللہ سید حسین مرتضیٰ نقوی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے اہل خانہ، اور

حجۃ الاسلام والمسلمین سید غلام عباس رضوی (حسین آغا) حفظ اللہ تعالیٰ عنہ

نیز آیت اللہ شیخ شبیر حسن میثمی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید ظفر مہدی نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی سلمان نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ نور عالم، دامت توفیقاتہم

آپ حضرات کی تعلیمات نے زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھانے کے طریق واضح کیے،

میری پیاری بیوی سیدہ مہوش زہرہ، جن کی زحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کیلئے ایک مقالہ لکھنا پڑے،

اور میرے نوجوان بیٹے،

سید محمد حسین مہدی، مستقبل کی روشن کرنوں میں سے ایک کرن،
آپ سب کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی میرے سفر کو تیز کرتی ہے۔
میرے پورے خاندان کے لیے، لامتناہی طاقت اور محبت کا ذریعہ،
برادران حجۃ الالسلام سید شعیب عابدی، عدیل عابدی، مصطفیٰ عابدی،
بہنیں اسرا اور فرحین، اور میرے پیارے سسرالی، ماں اور باپ اور بہنیں،
اے خدا تو میرے وجود کی جڑ ہے، زندگی کے طوفانوں میں مجھے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے،
میرے ساتھ چلنے والے دوستوں اور خیر خواہوں کے نام،
آپ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میرے لیے باعث برکت ہے۔
عاجزی کے ساتھ، میں "ہم فکری سے ہم راہی تک" کتاب آپ سب کے نام کرتا ہوں۔
یہ کتاب یہ علمی و فکری لگن آپ میں سے ہر ایک کے لیے میری شکر گزاری اور پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ آپ سب میرے آسمان میں بالائی برج ہیں، زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت، حکمت اور تعاون اس کتاب کے صفحات میں بُنے ہوئے ہیں اور میں اس کام کی تشکیل میں آپ کے کردار کے لیے ہمیشہ مقروض ہوں۔
دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور اٹوٹ محبت کے ساتھ!

سید جہانزیب عابدی

فہرست

انتساب 2

کچھ کتاب کے بارے میں 9

امام وقتؑ کے ظہور کی تیاری کیسے ؟! 11

اذنِ الٰہی اور اختیار کی حقیقت: توحید کا نکتۂ امتیاز 21

خدائی قوانینِ انفسی و آفاقی کیسے انسان کیلئے فائدہ مند ہیں ؟ 25

نماز کی سیاسی اور سماجی روحانیت 32

نوجوانی میں تعلیم کیوں ضروری ہے ؟ 41

اقتصادی بائیکاٹ: دشمن سے نبرد کا پرامن ترین نمونہ 51

تولا و تبرا، تقیہ و جہاد 54

اعلی مقاصد کے حصول میں تقیہ کی اہمیت 61

الحادی یا نیم الحادی بیماریاں اور ان کا علاج 67

دوغلے مسلمان 79

خیانت کار میڈیا اور ہماری ذمہ داریاں 86

انسان کیلئے رول ماڈل کی اہمیت اور ائمہ اہلبیت ع کا کردار 90

خود مختاری یا ذہنی غلامی ؟!! 99

دنیا کے مسائل کا اصل منبع اور حل 106

رہبری پر تنقید: خود فریبی یا شعور کا امتحان؟ 113

سازشی مطالعات, نفسیاتی مسائل اور مکتب تشیع 119

حکمت متعالیہ اور انقلاب اسلامی ایران 127

علمی, فکری جنگ کی اہمیت و افادیت 132

انسانی شخصیت سے باطل کو کھرچ دینے والے ذرائع 136

چاپلوسی کے اسباب و اثرات 147

عقل کو خطاب یا احساسات کو سہارا. 153

ہر ایک سے دوستی رکھنا منافقت کی علامت ہے 156

مزاحمت و مقاومت کی اہمیت 159

سفر کی ابتداء میں مقابلہ کا فریب 162

تلاوت قرآن کے انسانی جسم و روح پر اثرات 168

دعا اور دوا ساتھ ساتھ 174

دین سے بغاوت کے اسباب اور راہ حل 179

ذھین دماغوں کی چوری, ہماری کوتاہیاں اور اس کا علاج 183

مولوی کی عدم خود شناسی اور نوجوانوں کی تشنگی 191

اسلامی احکام میں تضاد کی حقیقت 194

تبرا کی نفسیاتی، سماجی اور روحانی جہتیں 199

جدید دور میں "تولّا" کیا ہے؟ 203

فقیری میں خدا سے تجارت 208

زیاراتِ قبور اور جدید سائنس 214

دُعا مومن کا ہتھیار ہے 219

تارکِ واجبات اور مرتکبِ محرمات کو صدقہ و خمس دینا 227

فطرت کیا ہے؟.. 234

اسلامی حکومت کی مشروعیت و مقبولیت 238

فقر و غناء اور ایمان 242

صدقہ، زکات اور خمس: عبادت یا ذریعۂ معاش؟ 246

فطری دین اور انسانی فطرت.. 249

سماجی رشتے اور خدا سے رشتہ 258

مشکلات و آسانی میں خدا سے رابطہ.. 262

متنوع حالات کے طلبہ کے ساتھ والدین اور اساتذہ کا کردار 267

کربلا پر آنسو اور جنت کا وجوب 272

رہبری، مخالفتیں اور نظربندیاں.. 277

ڈپلومیسی اور منافقت: حق و باطل کے آئینے میں 280

دلوں کا اشتراک 284

حد سے زیادہ سختیاں اور سکون: نفاق کے مددگار.. 290

سیکھنے میں ذہن کا موثر پہلو 295

کرنسی اور ولی خدا کی حاکمیت 298

دین کو کامیابی کی تدبیر سمجھنا غلطی ہے 309

پسپائی کے وقت دشمن کی چال 312

روٹین کی زندگی اور تخلیقی ذہن 317

خواہش کو آزاد کر دیں 320

جدید کارپوریٹ کلچر اور فطری زندگی 323

مالداری، آسائش یا آزمائش 328

معاشرے کی انتظامی قیادت دینی کیوں ہونی چاہیے؟ 337

خدا کے دشمن، ماضی اور آج 344

انسان مجبور ہے یا مختار؟ 347

آزمائش و امتحان، خدا اور انسان کا علم 350

قرآن میں ہر شہ کا ذکر ہے، سے کیا مراد ہے؟ 356

مزاحمت اور تسلیم- کب اور کیوں؟ 362

عروج و زوال کے قانون اور مغربی معاشرہ 366

شیطان کا نیکیوں کو نیکیوں کے ذریعے روکنے کا حربہ 374

دین و مذہب انفرادی و ذاتی معاملہ نہیں ہے 381

اپنے اعمال سے شیطان کو طاقتور نہ بننے دیں! 388

حقیقت و واقعیت یا توہمات و گمان 398

دشمن کی چالاکیاں اور ہماری بے وقوفیاں 401

قیام حق کی جدوجہد میں ناامیدی حرام ہے 404

لبرل سیکیولرازم کے داخلی تضادات اور اس نظریئے سے نجات کا طریقہ 409

امام برحق سے بنا تعلق تمام عبادات بے کار ہیں 413

اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن 417

انقلابیت کب تک ؟!! 421

عقل و نقل کی نظر میں امام زمانہ عج کا وجود مقدس 427

جب دنیا باصلاحیت افراد کی ناقدری کرے۔۔۔! 440

دین سے غفلت ہر سو رسوائی کا سبب 445

کمتر ثواب سے عظیم ثواب کے حصول تک 451

صوفی ازم اور اسلام ناب محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 456

تصوف، رہبانیت اور عرفان 462

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ، جو ہمیں عقل اور فہم کے اس راستے پر لے کر آیا ہے، جو ہمیں اسلامی اصولوں اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کا مقصد، ہمارے دین کے ثبوتی دلائل کو فراہم کرنا ہے۔

یہ کتاب پندرہ، بیس سال کی فکری محنت اور مشاہدے اور اصلاح کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ مضامین زندگی کے متفرق زندہ موضوعات پر مشتمل ہیں جو اس عرصے میں زیر قلم آئے، یہ ایک خود اونچ نیچ کا سفر ہے، جس میں میری زندگی کے مختلف مراحل کا تجربہ شامل ہے، جس نے میری فہم اور تجدید کو اضافی روشنی دی ہے۔

اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک خالص فکری کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس سے اختلاف کا حق اختلاف کی اہمیت اور احترام کے باعث روا ہے ہر ایک کے پاس خود کے خیالات اور رائے کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن، حدیث، تاریخ، علمیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، ابلاغیات، اور دیگر سماجی علوم کی موٹی موٹی باتوں کو متعدد مواقع پر پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان کو اپنی زندگی میں عمل میں لاسکیں۔

یہ کتاب خصوصی طور پر نوجوانوں کیلیئے ہے، تاکہ وہ اس میں سے کام کی باتیں انتخاب کریں اور اپنے فکری جولان کو بڑھا سکیں۔ اس کتاب کی تیاری کے اسباب نے میری زندگی کو تبدیل کیا ہے، اور میری امید ہے کہ یہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی تبدیل کرے گی۔

کتاب میں جس جگہ مضامین دوسرے لکھاریوں سے لے کر اضافہ جات کیے ہیں یا ترجمہ کیے ہیں وہ مضمون میں عنوان کے ساتھ مشخص کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی امید کے ساتھ، میں آپ کو اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کتاب کو پڑھ کر، آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا راستہ تلاش کر سکیں گے اور اپنے اصولوں کو مضبوط کرنے میں کافی کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ

عابدی

zaib.abidi.pk@gmail.com

امامِ وقت عج کے ظہور کی تیاری کیسے ؟!

ایک مومن انسان کا ظہور امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کیلئے کامیابی کے پروسس کی وضاحت ایک خاص روحانی، فکری اور عملی ارتقاء کی صورت میں سامنے آتی ہے، جس میں فرد اپنی پوری زندگی کو معرفتِ امام، اطاعتِ الٰہی، اور اصلاحِ نفس کے محور پر استوار کرتا ہے۔ یہ کامیابی کسی وقتی یا دنیاوی معیار کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک بلند تر الٰہی مقصد کے حصول پر مبنی ہوتی ہے، جو انسان کو نہ صرف اپنی ذات کی اصلاح کی طرف لے جاتی ہے بلکہ اسے امامِ وقت کے ظہور کے عظیم ہدف کا فعال اور بیدار فرد بھی بناتی ہے۔

یہ عمل اس لمحے سے شروع ہوتا ہے جب انسان اپنی زندگی کے مقصد کو پہچانتا ہے، یعنی وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا جینا اور مرنا، سیکھنا اور عمل کرنا، صرف لپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ ایک بڑے الٰہی منصوبے کا حصہ ہے، جس کا مرکز امام زمانہ عج ہیں۔ یہ شعور مومن کی سوچ کو بدل دیتا ہے، اس کی ترجیحات میں انقلاب آ جاتا ہے، وہ اپنی خواہشات سے بڑھ کر امام کی رضا اور خدا کی اطاعت کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے حقیقی کامیابی حاصل کرنی ہے، تو اسے اپنی فطرت، اپنی ذمہ داری، اور اپنے وقت کی نزاکت کو سمجھ کر زندگی گزارنی ہوگی۔

کامیابی کے اس راستے پر انسان سب سے پہلے خود سے لڑتا ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات، سستی، غفلت، اور گناہوں کے خلاف ایک مسلسل جنگ لڑتا ہے۔ وہ باطن کو پاک کرنے

کے لیے دعا، مناجات، توبہ اور قرآن سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس کی نماز صرف رسم نہیں بلکہ خضوع و خشوع کا مظہر بن جاتی ہے، اس کی دعا محض الفاظ نہیں بلکہ دل کی صداقت بن جاتی ہے۔ وہ شب زندہ داری کرتا ہے، کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ امامِ زمانہ کی نصرت اُن دلوں کو نصیب ہوتی ہے جو راتوں میں بیدار اور دنوں میں حق کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔ اس مومن کی کامیابی اس کے عمل میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ علم حاصل کرتا ہے تاکہ بصیرت پیدا ہو، وہ زبان اور قلم سے حق کی بات کرتا ہے، لوگوں میں امید، اخلاص، اور انتظار کا شعور بیدار کرتا ہے۔ وہ مظلوموں کا ساتھ دیتا ہے، عدل کے قیام کی جدوجہد کرتا ہے، اور ہر اس عمل سے بچتا ہے جو ظالم نظام کی تقویت کا باعث ہو۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح ڈھالتا ہے کہ وہ اگر امام کے لشکر کا ظاہری حصہ نہ بھی بن سکے، تو کم از کم اس کے کردار، نیت اور مزاج سے یہ اندازہ ہو کہ اگر امام آج ظہور فرما جائیں، تو وہ ان کی نصرت کے لیے تیار ہے۔

یہ کامیابی وقتی تعریف یا دنیاوی ترقی نہیں بلکہ ایک ایسا باطنی شعور، ایسی زندگی کی ترتیب، اور ایسی روحانی کیفیت ہے جو انسان کو امام کے قریب کرتی ہے۔ وہ انسان جو ہمیشہ امام کے فراق میں تڑپتا ہے، دعائے ندبہ میں روتا ہے، اپنے ہر دن کو امام کی رضا کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے، درحقیقت وہی مومن ہے جو اس روحانی کامیابی کی معراج پر ہوتا ہے۔

یہ کامیابی صبر، استقامت، اخلاص، عرفان، جہاد بالنفس، اجتماعی ذمہ داری اور مسلسل تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسا مومن فرد اپنی زندگی سے ظہور کی تمہید بچھاتا ہے، وہ نور کا ایک ذرہ بن کر ظلمت کی فضا میں امید کی کرن بن جاتا ہے۔ اس کی خاموشی بھی پیغام رکھتی ہے،

اس کا کردار بھی تبلیغ بن جاتا ہے، اور اس کی نگاہ بھی نور کی ایک جھلک بن کر دوسروں کے دلوں میں امام کا انتظار جگا دیتی ہے۔ یوں ایک مومن کا کامیابی کا پروسس امام زمانہؑ کے ظہور کے لیے نہ صرف ذاتی نجات کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ اجتماعی تبدیلی کے لیے بھی ایک سنگِ میل ثابت ہوتا ہے۔

اس پروسس کی جزئیات کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ ایک مومن کے دل میں امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی معرفت کس درجہ پر موجود ہے۔ جب انسان معرفتِ امام کو صرف ایک فکری یا نظریاتی تصور نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کے طور پر محسوس کرنے لگتا ہے، تو اس کی زندگی کا ہر پہلو، خواہ وہ دینی ہو یا دنیاوی، امام کی رضا کے تابع ہونے لگتا ہے۔ یہی معرفت، کامیابی کے پروسس کی پہلی اور بنیادی اینٹ ہے۔ اس کے بعد ایک درونی انقلاب شروع ہوتا ہے، جو سب سے پہلے نیت میں تبدیلی لاتا ہے۔ وہ ہر عمل کو صرف اپنے فائدے یا معاشرتی قبولیت کے لیے نہیں بلکہ خدا کی قربت اور امام کی خوشنودی کے لیے انجام دینے لگتا ہے۔

پھر یہ تبدیلی اُس کے وقت کے استعمال میں جھلکنے لگتی ہے۔ وہ سستی، فضول مصروفیات، وقت کے ضیاع، اور لاحاصل مشاغل سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ صبح کو جلدی بیدار ہوتا ہے، فجر کے بعد ذکر اور تلاوت میں وقت گزارتا ہے، دن میں اپنے فرائض اور ذمے داریوں کو ایمانداری سے نبھاتا ہے، اور رات کو حسابِ نفس کرتے ہوئے سوتا ہے۔ اس کے شب و روز میں شعوری نظم پیدا ہوتا ہے، جو امامِ وقت کی زندگی سے جڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اس پروسس کی ایک اہم جزئیات "تزکیۂ نفس" ہے۔ مومن مسلسل اپنے اندر کے نفسِ امارہ سے جنگ کرتا ہے۔ وہ حسد، تکبر، ریا، جھوٹ، غیبت، بدگمانی، خودپرستی اور دنیا طلبی جیسے روحانی بیماریوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جہاد آسان نہیں ہوتا، اس میں ناکامیاں بھی آتی ہیں، لیکن ہر ناکامی کے بعد وہ توبہ، گریہ، اور دعا کے ذریعے دوبارہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو تنہا نہیں سمجھتا، بلکہ امام کے علم میں اپنے حال کو جانتا ہوا سمجھتا ہے، اور یہی احساس اس کے اندر اصلاح کا جذبہ بڑھاتا ہے۔

اسی اصلاحی سفر میں وہ "علم" کی تلاش شروع کرتا ہے۔ وہ دینی علوم، قرآن فہمی، اہل بیت علیہم السلام کے فرامین، اور زمانے کے فتنوں کی شناخت کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تقلید سے تحقیق کی طرف بڑھتا ہے، اندھی پیروی کی بجائے بابصیرت عمل کو اختیار کرتا ہے۔ اس کا مطالعہ اس کی بصیرت کو جِلا دیتا ہے اور وہ معاشرے میں بصیرت مند رہنمائی کے قابل بنتا ہے۔

اس کے بعد اس کا رویہ دوسروں سے بدلنے لگتا ہے۔ وہ نرم زبان اختیار کرتا ہے، لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے، محتاجوں کی مدد کرتا ہے، رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور معاشرے میں نیکی کے فروغ کا سبب بنتا ہے۔ اس کی شخصیت مہربانی، تحمل، اور عدل کا نمونہ بن جاتی ہے۔ وہ ہر اس نظام سے نفرت کرتا ہے جو ظلم و جور کو فروغ دیتا ہے، اور دل سے اس عالمی عدل کے قیام کی دعا کرتا ہے جس کے لیے امام کا ظہور مقدر ہے۔

اسی تسلسل میں وہ "انتظار" کو ایک زندہ عمل میں بدل دیتا ہے۔ اس کے لیے انتظار صرف ایک جذباتی احساس نہیں بلکہ ایک عملی اسلوبِ حیات بن جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اس

طرح ڈھالتا ہے کہ اگر آج امام تشریف لے آئیں تو وہ ان کے لشکر میں شامل ہونے کے لائق ہو۔ وہ زمانے کی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہے، فتنوں کا ادراک رکھتا ہے، اور اپنی ذات کو ظہور کی تیاری کے لیے آمادہ رکھتا ہے۔

آخر میں یہ پروسس اُس روحانی کمال کی طرف لے جاتا ہے جہاں بندہ فنا فی الامام کے درجے کو چھونے لگتا ہے۔ اس کی خواہشیں امام کی خواہشات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں، اس کے آنسو امام کی جدائی میں بہتے ہیں، اس کی امید امام کے ظہور سے وابستہ ہو جاتی ہے، اور اس کی دعا ہر وقت "عَجِّل لِوَلِيِّكَ الفَرَج" بن جاتی ہے۔ وہ امام کا سپاہی بننے سے پہلے امام کا عاشق، سچا منتظر، اور اصلاح یافتہ انسان بن چکا ہوتا ہے۔

یہ پروسس زندگی بھر جاری رہنے والا جہاد ہے، جس میں ہدف صرف یہ نہیں کہ امام آئیں تو ہم ان کا ساتھ دیں، بلکہ یہ کہ وہ آئیں تو ہم اس قابل ہوں کہ ان کے قابلِ اعتماد بن سکیں، ان کے غم میں شریک ہوں، اور ان کی حکومت کے خالص خدمت گزار ہوں۔ یہ کامیابی دراصل وہی کامیابی ہے جس کا مقصد صرف فرد کی نجات نہیں بلکہ عالمگیر عدل کے قیام کا حصہ بننا ہے۔

دنیاوی حوالے سے اس پروسس کی جزئیات زندگی کے ہر عملی میدان میں ایک باشعور اور ذمہ دار طرزِ حیات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ پروسس انسان کے تعلیمی اور پیشہ ورانہ رویے میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی تعلیم کو صرف ڈگری حاصل کرنے یا دنیاوی شہرت پانے کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ اسے ایک وسیلہ سمجھتا ہے امام زمانہ عجل

اللہ فرجہ الشریف کے عالمی مشن کی خدمت کے لیے۔ اس کا علم با مقصد، سچائی پر مبنی اور معاشرے کی بھلائی سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ جھوٹے نمبروں، نقل، یا شارٹ کٹس کی بجائے محنت، دیانت اور خلوص کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے۔

پھر اس کی معیشت کا طرز بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ رزقِ حلال کی جستجو کرتا ہے، سود، دھوکہ، جھوٹ اور ناجائز منافع سے بچتا ہے، اور اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا شعور رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دنیاوی سرمایہ دراصل ایک امانت ہے جو امام کے مشن کی خدمت کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔ اس کے کاروباری یا پیشہ ورانہ فیصلے عدل، شفافیت اور اخلاق کے اصولوں پر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظہور کے بعد جو نظام قائم ہو گا، اس میں صرف وہی لوگ باقی رہیں گے جو دنیاوی معاملات میں دیانت دار رہے ہوں گے۔

اس کے بعد اس کی سوشل لائف میں توازن اور ذمہ داری کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کو محض رسم یا مجبوری کے طور پر نہیں بلکہ ایک شرعی فریضہ سمجھ کر نبھاتا ہے۔ اس کے تعلقات اخلاص، ہمدردی اور صبر پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ معاشرتی مسائل سے لاتعلق نہیں ہوتا بلکہ غربت، تعلیم، صحت اور اصلاحِ معاشرہ جیسے میدانوں میں عملی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ معاشرے کے مظلوم طبقات کی آواز بنتا ہے، اور جہاں ظلم ہوتا ہے، وہاں خاموش تماشائی بننے کے بجائے کردار ادا کرتا ہے۔

اس کی جسمانی صحت کے حوالے سے بھی شعور بڑھتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر جسم کمزور ہو گا تو روحانی اور فکری ذمہ داریاں بھی ادا نہ ہو سکیں گی۔ اس لیے وہ کھانے پینے، نیند، صفائی اور جسمانی سرگرمیوں میں اعتدال رکھتا ہے۔ وہ اپنے وقت کی قدر و قیمت پہچانتا

ہے، ہر لمحے کو کسی فائدہ مند مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور فارغ وقت کو عبادت، علم، یا خدمتِ خلق میں صرف کرتا ہے۔

ایک اور اہم جزو یہ ہے کہ وہ وقت کی رفتار اور دنیاوی تبدیلیوں سے غافل نہیں رہتا۔ وہ زمانے کی زبان سمجھتا ہے، ٹیکنالوجی سے واقف ہوتا ہے، میڈیا کے اثرات کا ادراک رکھتا ہے، اور اپنی نسل کو بھی زمانے کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جدید و مؤثر انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے نئے طریقے سیکھتا ہے تاکہ خود بھی بہتر بنے اور دوسروں کو بھی بہتر بنا سکے۔

غرض اس کی دنیاوی کامیابی امام زمانہ کے مشن سے الگ نہیں ہوتی۔ وہ دنیا میں ترقی کرتا ہے، مگر اس ترقی کو اپنی ذات یا فخر کا ذریعہ نہیں بناتا۔ وہ اپنی شہرت، مال، علم اور حیثیت کو خدا کے دین اور امام کے ظہور کی تیاری میں لگا دیتا ہے۔ یہی وہ دنیاوی جزئیات ہیں جو ایک مومن کے ظہورِ امام کی طرف بڑھنے کے سفر کو نہ صرف معنوی بلکہ دنیاوی سطح پر بھی کامیاب بناتی ہیں۔ ایک سچے منتظر کی شخصیت متوازن، بیدار اور ہر پہلو سے بامقصد ہوتی ہے، کیونکہ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور کے لیے صرف روحانی طہارت یا دعاؤں پر اکتفا کرنا کافی نہیں بلکہ انسان کو اپنی پوری دنیاوی شخصیت کو امام کے مشن کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کے ہر دائرے میں وہ شعور، اخلاص، عدل، فہم، دیانت، غیرت اور قربانی جیسے اوصاف کو اختیار کرے، تاکہ جب امام کا ظہور ہو تو وہ ایک فعال، بافہم اور تیار فرد کی حیثیت سے شامل ہو سکے۔

سیاسی پہلو سے ایک منتظر کو چاہیے کہ وہ ظلم و جور سے بیزاری اختیار کرے، جابرانہ نظاموں کا حامی نہ ہو، اور ہمیشہ عدل، شفافیت اور عوامی خیر کی بات کرے۔ وہ سیاسی شعور رکھتا ہو، زمانے کی چالوں سے آگاہ ہو، اور باطل قوتوں کے فریب کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لیکن وہ فساد یا شورش کا داعی نہیں ہوتا بلکہ نظم، حکمت اور بصیرت کے ساتھ معاشرتی تبدیلی میں کردار ادا کرتا ہے۔

علمی حوالے سے ایک منتظر علم کا عاشق ہوتا ہے، کیونکہ امام خود علم و حکمت کے بحرِ بے کنار ہیں۔ وہ خود سیکھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو سکھانے کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس کا علم فقط دنیاوی فائدے کے لیے نہیں بلکہ ہدایت، تحقیق، دلیل، اصلاح اور تنویرِ فکر کے لیے ہوتا ہے۔ وہ قرآن، حدیث، اسلامی فلسفہ، جدید علوم، اور زمانے کی زبان پر مہارت رکھتا ہے تاکہ امام کے ظہور کے بعد علمی محاذ پر کردار ادا کر سکے۔

ثقافتی اور تہذیبی پہلو سے ایک منتظر اپنے لباس، طرزِ گفتار، رویے، ترجیحات اور دلچسپیوں میں ایسی پاکیزگی اور سنجیدگی اختیار کرتا ہے جو اسے اسلامی تمدن کا نمائندہ بناتی ہے۔ وہ مغرب زدہ فیشن، لغویات اور بے مقصد مشغلوں سے دور رہ کر، اسلامی ثقافت، پاکیزہ فن، اور اخلاقی انداز کو فروغ دیتا ہے۔ اس کی ثقافت میں قرآن کی روشنی، اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات، اور انسانی وقار کا عکس نظر آتا ہے۔

تفریح کے دائرے میں وہ اعتدال اور مقصدیت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ وہ ایسی تفریح اپناتا ہے جو دل و دماغ کو تازگی دے، گناہ سے دور رکھے اور روحانی ارتقاء میں مدد دے۔ فحاشی،

غفلت انگیز مشغلے، اور وقت ضائع کرنے والے کھیلوں سے اجتناب کرتا ہے اور ایسی تفریحات اختیار کرتا ہے جو خودشناسی، صحت، اور خاندانی تعلقات کو بہتر بنائیں۔

صحت کے میدان میں وہ جسم کو امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ طیب وطاہر غذا کھاتا ہے، ورزش کرتا ہے، نیند کا خیال رکھتا ہے اور نفسیاتی توازن برقرار رکھتا ہے تاکہ جسمانی اور ذہنی قوتوں کے ساتھ دین اور معاشرے کی خدمت کر سکے۔

سماجی سطح پر وہ تعلقات کا مرکز بنتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، یتیموں، فقیروں، بیماروں اور بے سہارا افراد کا سہارا بنتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو نفرت، تعصب، غرور اور خود پسندی سے پاک کرتا ہے اور محبت، خدمت، اور خیر کے جذبات کو پھیلاتا ہے۔ اس کے رشتے خلوص، عدل، اور خیر خواہی پر مبنی ہوتے ہیں۔

معاشی پہلو میں وہ رزقِ حلال کماتا ہے، اسراف سے بچتا ہے، زکات، خمس اور صدقات کا اہتمام کرتا ہے، اور ضرورت مندوں کو سہارا دیتا ہے۔ وہ اپنے مال کو امام کے مشن میں ایک وسیلہ سمجھتا ہے، نہ کہ فخر یا ذخیرہ اندوزی کا ذریعہ۔ اس کی معیشت کا مقصد صرف عیش نہیں بلکہ خدمت، خود کفالت اور امت کی بہتری ہوتا ہے۔

دفاعی شعور کے ساتھ وہ اپنے ایمان، اقدار، خاندان اور معاشرے کے دفاع کے لیے فکری، اخلاقی، اور عملی تیاری رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف جسمانی دفاع کے لیے تربیت یافتہ ہوتا ہے بلکہ فکری یلغار اور ثقافتی انحراف سے بھی مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ معاشرے میں امن، وقار، غیرت اور حریت کا علمبردار بنتا ہے۔

یوں ایک سچا منتظر اپنی دنیاوی شخصیت کے ہر پہلو میں توازن، شعور، صداقت اور ہدف پرستی کے ساتھ جیتا ہے۔ اس کی پوری زندگی امام کے ظہور کے انتظار کو ایک عملی جہاد میں بدل دیتی ہے، جہاں ہر عمل، ہر سوچ، ہر فیصلہ، امام کی رضا اور نظامِ عدلِ موعود کے لیے زمین ہموار کرنے والا بن جاتا ہے۔

خلاصتاً ایک مومن انسان کی کامیابی کا پروسس دراصل اس کی فکر، کردار، تعلقات اور طرزِ زندگی میں ایک مسلسل ارتقائی سفر ہے جو ظہورِ امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی تیاری کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ سفر فرد کی سوچ کی اصلاح سے شروع ہو کر اس کے اعمال، اخلاق، تعلقات، تعلیم، معیشت، صحت، اور سماجی کردار تک پھیلتا ہے۔ وہ اپنی تعلیم کو صرف دنیاوی ترقی کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے امام کے عالمی مشن کی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ معیشت میں رزقِ حلال، دیانت اور سماجی خدمت کو اولیت دیتا ہے۔ اپنے رشتوں میں اخلاص، صبر اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اپنے وقت، صحت اور وسائل کو عبادت، علم اور خدمتِ خلق کے لیے استعمال کرتا ہے۔ دنیاوی ترقی حاصل کرتا ہے لیکن اسے مقصدِ امامت سے جدا نہیں کرتا۔ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، جدید تقاضوں کو سمجھتا ہے، اور اپنی نسل کی فکری و اخلاقی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے۔ یوں وہ ایک ایسا متوازن، باشعور اور باعمل فرد بن جاتا ہے جو امام زمانہ کے ظہور کے لیے زمین کو ہموار کرتا ہے اور اس کے مشن کا فعال ساتھی بننے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔

اذنِ الٰہی اور اختیار کی حقیقت: توحید کا نکتۂ امتیاز

اسلام کی بنیادی ترین تعلیمات میں توحید کا مقام سب سے بلند ہے۔ توحید کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کے اختیار، قدرت، اور تصرف میں واحد و یکتا مانے۔ تاہم قرآن مجید اور احادیثِ معصومینؑ میں ہمیں بہت سے مقامات پر یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو کچھ امور میں اختیار دیتا ہے یا ان کے ذریعے کام کراتا ہے۔ جیسے اللہ فرماتا ہے: "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثباتِ قدم عطا کرے گا۔" اس آیت کے تناظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ خود کسی کو اختیار دے دے تو کیا وہ اختیار رکھنے والا شرک کا مرتکب کہلائے گا؟ یا کیا اس کو اللہ کا مددگار کہنا توحید کے خلاف ہو گا؟

اس نکتے کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو اختیار دینا یا کسی ہستی کے ذریعے کام لینا اس وقت توحید کے دائرے میں رہتا ہے جب وہ اختیار بذاتِ خود نہیں بلکہ "باذنِ اللہ" یعنی اللہ کے اذن سے ہو۔ جس شخص یا ہستی کو اختیار دیا گیا ہو وہ خود مختار نہ ہو بلکہ اس کا ہر تصرف، ہر فعل، اللہ کے حکم کا تابع ہو۔ ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ یہ شرک نہیں کہلائے گا، بلکہ یہ درحقیقت توحید کی وسعت اور ربوبیتِ الٰہی کی تکمیل کا ایک خوبصورت پہلو ہو گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ خالقِ کائنات ہے اور اس کی ربوبیت کائنات کے ہر جز پر محیط ہے، اس لیے وہ جس کو چاہے، جیسے چاہے، جو اختیار دینا

چاہے دے سکتا ہے، لیکن اس اذن اور تفویض میں ایک باریک فرق ہے جس پر ایمان رکھنے والا مومن فکری توازن برقرار رکھتا ہے۔

تفویض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کسی بندے کو مکمل طور پر کسی کام کے لیے خود مختار بنا دے، اور اس کام سے خود الگ ہو جائے۔ جیسے اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے خلق یا رزق کا اختیار کسی امام یا نبی کو دے دیا اور اب وہ کام ان کے ذمہ ہے اور اللہ خود اس کام میں دخیل نہیں —تو یہ تفویض ہے، اور یہ نظریہ اہل بیتؑ نے واضح طور پر رد فرمایا ہے۔ امام علیؑ سے منقول ہے کہ بندے اپنے لیے نہ نقصان لا سکتے ہیں، نہ نفع، نہ موت دے سکتے ہیں، نہ زندگی، نہ دوبارہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔

جبکہ اذنِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کسی بندے کو ایک کام کی اجازت دیتا ہے، جیسے حضرت عیسیٰؑ کا مُردوں کو زندہ کرنا یا مادرزاد اندھوں کو شفا دینا۔ لیکن قرآن ہر مقام پر واضح کرتا ہے کہ یہ سب کچھ "بِإِذْنِ اللهِ" یعنی اللہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ عیسیٰؑ خود بھی کہتے تھے کہ "میں اللہ کے اذن سے تمہارے لیے ایسا کرتا ہوں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اختیار اللہ کے پاس ہے، اور عمل کرنے والی ہستی صرف ایک ذریعہ یا وسیلہ ہے۔ اس کو اگر ہم اللہ کا مددگار کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا، جیسے ایک استاد کسی لائق طالبعلم کو ذمہ داری دیتا ہے۔ مگر اختیار دینے کا مطلب یہ نہیں کہ استاد علم کا مالک نہیں رہا، بلکہ وہ اصل ماخذ باقی ہے اور طالبعلم محض ذریعہ ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کے اندر انبیا، ملائکہ اور اولیاء کے بارے میں جو صفات بیان ہوئی ہیں، وہ بھی در حقیقت ربوبیتِ الٰہی کے جلوے ہیں جو ان ہستیوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسانوں میں سے رسول چُنے، فرشتوں میں سے پیغام رساں مقرر کیے، اور ان کو خاص صفات عطا کیں۔ لیکن یہ سب کچھ اپنی اصل میں اللہ کے اختیار اور قدرت کے تحت تھا اور رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ہستی کو ہم اللہ کے اذن سے با اختیار مانتے ہیں، تو اس کو خدا کا شریک نہیں بلکہ بندۂ خاص تسلیم کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر کسی ہستی کا اختیار "باذنِ اللہ" ہو، اور اس ہستی کو خود مختار نہ سمجھا جائے بلکہ اللہ کا کارندہ، عبد، اور ذریعہ سمجھا جائے، تو یہ شرک نہیں بلکہ عینِ توحید ہے۔ لیکن اگر کسی کو مستقل طور پر اختیارات کا مالک مانا جائے، تو یہ تصور شرک کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نکتۂ امتیاز ہے جس پر ایمان کی سلامتی اور فکری توازن قائم رہتا ہے۔ یہی وہ حق ہے جو اہل بیتؑ نے ہمیں سکھایا کہ ہم اللہ کے غیر کو اللہ کی صفات کا مستقل مالک نہ سمجھیں، بلکہ اسے اللہ کی عنایت، اللہ کی اجازت اور اللہ کی مشیت کا آئینہ سمجھیں۔ یہی سچی توحید ہے، اور یہی حقیقی معرفت۔

حوالہ:

شیخ کلینیؒ امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي عَبْدِ اللهِ (ع): جُعِلْتُ فِدَاكَ، إِنِّي أَسْمَعُ الْحَدِيثَ مِنْكَ فَأُرِيدُ أَنْ أَعْرِضَهُ عَلَى الْقُرْآنِ، فَإِنْ وَافَقَ كِتَابَ اللهِ أَخَذْتُ بِهِ، وَإِنْ خَالَفَ كِتَابَ اللهِ لَمْ آخُذْ بِهِ (محمد علوی) قَالَ:

فَقَالَ(ع): يَا ابْنَ أَبِي يَعْفُورَ، وَيْحَكَ، إِذَا حَدَّثْتُكَ عَنْ رَسُولِ اللهِ(ص)، فَلَا تَعْرِضْهُ عَلَى الْكِتَابِ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ (ص) كَانَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ، وَالتَّنْزِيلُ، وَالتَّأْوِيلُ، وَاللهُ عَزَّوَجَلَّ يَقُولُ: (وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ) وَاللهِ مَا أَعْطَيْنَا إِلَّا مَا أُعْطِيَ رَسُولُ اللهِ(ص).

(ترجمہ مفہومًا)

ہمیں جو اختیار یا علم دیا گیا ہے، وہ اللہ کے اذن سے ہے، جیسا کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیا گیا، اور تمہیں جو کچھ رسول دے، اسے لے لو۔

ماخذ:

الکافی، شیخ کلینی، جلد 1، کتاب الحجہ، باب التفویض، حدیث 8

(مکتبۃ الاسلامیہ، تہران)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللهِ ۚ

ترجمہ: ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔ (قرآن مجید–النساء، آیت 64)

خدائی قوانینِ انفسی و آفاقی کیسے انسان کیلئے فائدہ مند ہیں؟

سننِ الٰہی دراصل خالقِ کائنات کی وہ ازلی و ابدی نشانیاں اور اصول ہیں جو ہر ذی شعور کو دعوتِ فکر و عمل دیتی ہیں۔ یہ سنن صرف جامد قوانین نہیں بلکہ زندہ، متحرک اور بامقصد اشارے، تماثیل، کنایے اور استعارے کی صورت میں ہماری زندگی کے ہر پہلو میں موجود ہیں۔ فطرت، انسان، وحی، شریعت، اخلاق، معاشرت، یہاں تک کہ انسانی درد، موت، بیماری، خوشی اور کامیابی سب ان سنن کی تجلی ہیں۔ ان تمام علامتوں کا مقصد صرف مشاہدہ نہیں بلکہ تحریک ہے، تاکہ انسان ان کو سمجھ کر بیدار ہو، متحرک ہو، اور اپنے کردار کو سنوارے۔

جب انسان مظاہر فطرت کو دیکھتا ہے تو وہ صرف ایک جمالیاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک معنوی دعوت بھی پاتا ہے۔ سورج کا طلوع ہونا امید، روشنی، تسلسل اور عمل کی علامت ہے۔ ہر صبح کی آمد ایک نئی زندگی، نئے موقع اور اصلاح نفس کی پکار ہے۔ بہار کا آنا صرف رنگ وخوشبو نہیں بلکہ اس بات کی نشانی ہے کہ ہر خزاں کے بعد زندگی دوبارہ لوٹتی ہے، ہر مایوسی کے بعد نئی امید جنم لیتی ہے۔ پودے کا بیج بن کر دفن ہونا اور پھر تناور درخت بننا ہمیں صبر، قربانی اور تدریجی ترقی کا سبق دیتا ہے۔ پہاڑوں کا استحکام اور خاموشی ہمیں ثابت قدمی، وقار اور عزم کا پیغام دیتی ہے۔ بادل کا برسنا، سمندر کا مد وجزر، پرندوں کا ہجرت کرنا، یہ سب زندگی کے روحانی اور اجتماعی پیغامات کو کنایہ اور استعارے میں انسان تک پہنچاتے ہیں۔

انسان کا اپنا جسم بھی سننِ الٰہی کا ایک بولتا ہوا استعارہ ہے۔ دل کا مسلسل دھڑکنا، سانس کا جاری رہنا، دماغ کی سرگرمی، نیند اور بیداری کا نظام، سب کچھ ایک پیغام دیتا ہے کہ اعتدال، تسلسل، توازن اور رابطہ زندگی کا تقاضا ہے۔ اگر دل لمحہ بھر رک جائے تو زندگی رک جاتی ہے، اسی طرح اگر انسان ایک لمحہ بھی شعوری غفلت میں جائے، تو روحانی موت اسے آ لیتی ہے۔ روزمرہ کے جسمانی افعال جیسے کھانا، پانی پینا، درد محسوس کرنا، سب ہمیں جسمانی اور روحانی دنیا کے باہم ربط کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ انسان کی بھوک، صرف غذا کی حاجت نہیں، بلکہ علم، محبت، توجہ، عبادت اور اللہ کی قربت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سب علامات ہیں جو باطن کی بیداری کے لیے رکھی گئی ہیں۔

نفسیاتی سطح پر بھی خدا نے ہر احساس، ہر جذبہ، ہر تعلق کو ایک تمثیل بنا کر انسان کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنایا ہے۔ ماں کی محبت خدا کی رحمت کا استعارہ ہے۔ دوستی خلوص و وفا کا کنایہ ہے۔ حسد، غصہ، نفرت انسان کو اس کے باطن کے اندھیرے دکھاتے ہیں تاکہ وہ ان کا علاج کرے۔ خوشی، اطمینان، کامیابی، یہ سب انسان کو اس کی فطرت سے ہم آہنگی کا پیغام دیتے ہیں۔ خوف اور پریشانی، خدا کی طرف رجوع کی فطری دعوت ہیں۔ حتیٰ کہ گناہ کا احساس بھی ایک نعمت ہے، کیونکہ یہ انسان کو توبہ کی راہ دکھاتا ہے۔

قرآن و اسلامی احکامات ان تمام نشانیوں کو کلامی، اخلاقی اور عملی نظام میں ڈھال دیتے ہیں۔ نماز ایک علامتی عمل ہے، جہاں قیام خودداری کا، رکوع عاجزی کا، اور سجدہ بندگی و فنا کا استعارہ ہے۔ روزہ نفس پر قابو، زکاۃ مال کی طہارت، اور حج توحید کے محور پر انسانی اجتماع کی تمثیل ہے۔ یہ سب محض احکامات نہیں، بلکہ ایسی زندہ علامات ہیں جو انسان کو ہر روز متحرک

کرتی ہیں کہ وہ اپنی اصلاح کرے، خدا سے جُڑے، اور ایک بہتر انسان اور معاشرہ تشکیل دے۔ قرآن جب کہتا ہے "سنريهم آياتنا في الآفاق وفي أنفسهم" (حم السجدہ: 53)، تو اس میں یہی اعلان ہے کہ اللہ کی نشانیاں ہر طرف بکھری ہیں، بس دیکھنے والی آنکھ، سوچنے والا ذہن، اور بیدار دل درکار ہے۔

ایک انسان یا معاشرہ ان علامات سے اس وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ ان کو محض ایک فطری عمل یا مذہبی رسم کے طور پر نہ لے بلکہ ان کی معنوی گہرائی میں اترے۔ وہ جب صبح کو طلوع ہوتے سورج میں اپنی امیدوں کو زندہ کرے، سجدے میں اپنی انا کو دفن کرے، کسی درخت کو دیکھ کر صبر سیکھے، پانی کے بہاؤ سے نرمی اور تحمل کا سبق لے، تو وہی روزمرہ تجربے اسے روحانی ترقی کی سیڑھی بنا دیتے ہیں۔ معاشرہ جب ان علامات کو اجتماعی شعور کا حصہ بناتا ہے تو اس میں قانون، اخلاق، تعلقات اور معیشت سب الٰہی حکمت کے تابع ہو جاتے ہیں۔ ایسا معاشرہ فطرت کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر پنپتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سننِ الٰہی صرف ایک کائناتی اصول نہیں، بلکہ انسان کی روح، عقل اور معاشرت کے لیے زندہ وحی بن جاتی ہے۔

اس طرح، عمل کے لیے خدا کی یہ علامتی دعوت، فطرت، انسان اور شریعت کی ہم آہنگی سے ایک ایسا فکری و روحانی نقشہ فراہم کرتی ہے جو انسان کو ظاہری و باطنی طور پر جمود سے نکال کر شعور، ہدایت اور حرارتِ عمل سے معمور کر دیتی ہے۔ یہ دعوت ہر انسان کے اندر گونجتی ہے، شرط صرف یہ ہے کہ وہ اسے سننا سیکھ لے۔

سننِ الٰہی، یعنی خدا کے وہ قوانین جو کائنات کے ہر گوشے میں ایک غیر متبدل نظام کے تحت کارفرما ہیں، نہ صرف مظاہرِ فطرت میں جلوہ گر ہوتے ہیں بلکہ انسان کے جسم، اس کی نفسیات اور پھر قرآن و اسلامی احکامات میں بھی اسی اصولِ ربانی کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ قرآن کریم بارہا اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، جیسا کہ فرمایا: "ولن تجد لسنة الله تبديلاً" (الفتح:23)۔ یہی ابدی سنتیں وہ کُلیات ہیں جو کائنات کی حرکت، توازن اور بقا کا ضامن ہیں، اور انسان چاہے شعور رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، وہ ان قوانین کے تابع رہتا ہے۔

مظاہرِ فطرت میں ہمیں سننِ الٰہی کا ایک واضح، مربوط اور ہم آہنگ نظام نظر آتا ہے۔ زمین کا گردش کرنا، سورج کی تمازت، پانی کا بخارات میں بدل کر بادل بننا، زندگی کا بیج سے برگ و بار تک پہنچنا، اور موت کا یقینی انجام، یہ سب قدرت کے اس نظام کا حصہ ہیں جس میں ہر شے ایک مقصد کے تحت رواں دواں ہے۔ فطرت کے اس نظام میں کوئی جبر نہیں، ہر چیز اپنی حدود میں اور اپنے وقت پر عمل کرتی ہے۔ اس سے ہٹنا تباہی کا سبب بنتا ہے، چاہے وہ زمین کی تہوں میں ہو یا انسان کی زندگی میں۔

یہی اصول جب انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے تو حیاتیاتی سطح پر وہی ترتیب، وہی توازن، اور وہی حکمت دکھائی دیتی ہے۔ دل کی دھڑکن، خون کا بہاؤ، دماغ کی لہریں، ہارمونی نظام، اور ہر عضو کا وقت پر اور مقصد کے تحت کام کرنا اسی سنن الٰہی کے تحت ہے۔ اگر انسان کے جسم میں کوئی عضو سنتِ الٰہی سے ہٹے، مثلاً بے وقت نیند، غیر متوازن غذا، یا مسلسل ذہنی دباؤ، تو جسمانی بیماریوں کا سامنا ہوتا ہے، جسے جدید طب بھی "life style diseases"

کہہ کر تسلیم کرتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی جسم کا توازن بھی فطری سنن سے ہم آہنگی کا طالب ہے۔

نفسیاتی سطح پر بھی یہی سنتیں جاری و ساری ہیں۔ خوشی، غم، خوف، امید، اعتماد، پشیمانی، یہ سب احساسات انسانی فطرت میں موجود ہیں اور ان کا ظہور بھی ایک مقررہ نظام کے تحت ہوتا ہے۔ اگر انسان جذبات کو دبائے، فطری خوف یا غم کو تسلیم نہ کرے، یا مسلسل امید اور خوشی کے مصنوعی ماحول میں جینے کی کوشش کرے، تو وہ نفسیاتی عدم توازن کا شکار ہوتا ہے۔ جدید نفسیات بھی اس بات کو مانتی ہے کہ suppressed emotions یا unresolved traumas بعد میں شدید ذہنی امراض کا سبب بنتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانی نفسیات بھی سننِ الٰہی کی تابع ہے۔

اب جب ہم قرآن و اسلامی احکامات کی طرف آتے ہیں تو ہمیں یہی ربانی سنتیں ایک فکری اور عملی نظام کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔ قرآن کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو عبادات مقرر کی ہیں، وہ نہ صرف روحانی بلندی کے لیے ہیں بلکہ انسانی جسم و نفسیات کی فطرت کے مطابق ترتیب دی گئی ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ، ان سب میں ایک باطنی حکمت ہے جو انسانی وجود کو اس کے فطری مرکز سے جوڑتی ہے۔ نماز انسان کو دن میں پانچ بار ایک مقررہ وقت پر اپنے رب کے سامنے جھکنے کا موقع دیتی ہے، جو جسمانی لحاظ سے بھی ورزش کا کام دیتی ہے اور نفسیاتی طور پر انسان کو تسکین اور مرکزیت عطا کرتی ہے۔ روزہ جسم کو detox کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت

دیتا ہے، جو نفسیاتی توازن کے لیے لازم ہے۔ زکاۃ انسان کو اپنی کمائی سے دوسروں کا حق دینے کا شعور دیتی ہے، جو اجتماعی ہم آہنگی اور سماجی عدل کا ذریعہ ہے۔

قرآن مجید ان احکامات کو محض رسمی عبادات نہیں بناتا بلکہ انہیں فطری، انسانی اور سماجی تقاضوں کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ مثلاً روزے کے بارے میں فرمایا گیا: "لعلکم تتقون" یعنی شاید تم متقی بن جاؤ۔ یہ تقویٰ صرف روحانی برتری نہیں بلکہ ایک مکمل نفسیاتی و اخلاقی تربیت ہے جس کے ذریعے انسان اپنی خواہشات، افعال اور رویوں کو اللہ کی سنتوں کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ یہی بات دیگر احکامات میں بھی ملتی ہے: والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، ماپ تول میں انصاف، جھوٹ اور فحاشی سے پرہیز، ان سب کے پیچھے ایک جامع فطری نظام ہے جس کا تعلق انسانی شعور، معاشرت اور باطن سے ہے۔

الغرض، سننِ الٰہی کا ظہور ایک مسلسل نظام کی صورت میں ہمارے اردگرد بکھرا ہوا ہے: فطرت کے مظاہر میں، ہمارے جسم کی بناوٹ اور افعال میں، ہماری نفسیاتی ساخت اور جذباتی توازن میں، اور قرآن و سنت کے احکامات میں۔ یہ سب ایک ہی ربانی عقل اور حکمت کی تجلی ہیں جو انسان کو اس کے فطری مرکز سے جوڑتی ہیں۔ جب انسان ان سنن کو تسلیم کرتا ہے، ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جیتا ہے، تو وہ ایک متوازن، بامقصد اور روحانی طور پر محفوظ زندگی گزارتا ہے۔ اور جب وہ ان سے ہٹتا ہے، تو وہ اپنے وجود، اپنے سماج اور اپنی روح کے خلاف ایک بغاوت کرتا ہے، جس کا انجام اضطراب، افراتفری اور گمراہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن انسان کو بار بار دعوت دیتا ہے کہ وہ "فطرت اللہ" کو پہچانے،

اس پر غور کرے، اور اپنی زندگی کو اسی الٰہی نظام کے مطابق ڈھالے تاکہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہو۔

نماز کی سیاسی اور سماجی روحانیت

نماز ایک ایسا جامع عمل ہے جو انسانی جسم اور روح دونوں کو طاقت بخشتا ہے، اور روحانی و نفسیاتی حملوں کے خلاف ایک مضبوط قلعہ فراہم کرتا ہے۔ قرآن، روایات معصومین علیہم السلام اور علم نفسیات تینوں اس حقیقت کی تائید کرتے ہیں کہ نماز محض ایک عبادت نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ تربیت ہے جو انسان کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچاتا ہے اور اسے استقامت، تسکین، اور روحانی بصیرت عطا کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ": اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ "(العنکبوت:45) یعنی نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اس آیت کا مفہوم صرف ظاہری گناہوں کی روک تھام نہیں بلکہ ایک گہری روحانی طاقت کی طرف اشارہ ہے جو نماز کے ذریعے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان دن میں بار بار خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، اس سے ہمکلام ہوتا ہے، تو اس کا نفس مغلوب اور روح غالب آتی ہے۔ یہ مسلسل رابطہ، دل کو نورِ الٰہی سے بھر دیتا ہے، اور شیطانی وسوسوں کے خلاف ایک مضبوط حصار بن جاتا ہے۔

روایاتِ معصومینؑ نماز کو "مؤمن کا معراج" قرار دیتی ہیں۔ امام علیؑ فرماتے ہیں ": الصلوۃُ قربانُ کلِّ تقیٍّ "یعنی نماز ہر پرہیز گار کے لیے خدا سے قرب کا ذریعہ ہے۔ جب انسان نماز میں اللہ کے حضور جھکتا ہے، تو وہ صرف اپنے بدن کو خم نہیں کرتا بلکہ اپنے نفسِ امارہ کو بھی

جھکاتا ہے۔ یہ عمل نہ صرف روح کو تسکین دیتا ہے بلکہ بدن میں بھی ایسی کیفیات پیدا کرتا ہے جو جدید نفسیات کے مطابق ذہنی دباؤ کو کم کرتی ہیں، نیورولوجیکل نظام کو متوازن کرتی ہیں، اور جسم کے اندرونی کیمیکل توازن کو بہتر بناتی ہیں۔

علم نفسیات کی رُو سے، انسان کی ذہنی طاقت کا بڑا انحصار اس کی روحانی کیفیات پر ہوتا ہے۔ نماز، بطور ایک mindful practice ، انسان کو حال میں حاضر رکھتی ہے۔ جب انسان پوری توجہ کے ساتھ قیام، رکوع، سجدہ کرتا ہے اور الفاظِ عبادت دہراتا ہے، تو اس کی دماغی لہریں alpha (brain waves) اور theta فریکوئنسی میں آجاتی ہیں، جو گہرے سکون اور روحانی انہماک سے وابستہ ہیں۔ یہ کیفیت نہ صرف اضطراب، ڈپریشن اور فکری انتشار کو کم کرتی ہے بلکہ خود اعتمادی، اندرونی سکون اور مثبت سوچ کو تقویت دیتی ہے۔ دشمن کی جانب سے کیے گئے نفسیاتی حملے جیسے احساسِ کمتری، خوف، وسوسے، شہوانی خیالات یا مایوسی، ان سب کے خلاف نماز ایک ڈھال بن جاتی ہے۔

امام سجادؑ نے دعا میں فرمایا" :وَجَعَلتَ قُرَّةَ عَینِی فِی الصَّلَاۃِ "یعنی "تو نے میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی۔" اس جملے میں وہ روحانی سکون اور جذباتی تسکین پوشیدہ ہے جو ایک شخص کو دنیا کے فتنوں، غموں، اور شیطانی حملوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ تسکین صرف وقتی نہیں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ انسان کے رویوں، سوچوں، اور ارادوں میں ٹھہراؤ پیدا کرتی ہے۔

جسمانی لحاظ سے بھی نماز انسان کے مختلف اعضاء کو حرکت دیتی ہے، خاص طور پر وہ حرکات جو خون کی روانی کو بہتر بناتی ہیں، جسمانی تناؤ کو کم کرتی ہیں، اور عضلات میں نرمی پیدا کرتی ہیں۔ سجدہ جو کہ نماز کا سب سے عاجزانہ اور طاقتور مرحلہ ہے، نہ صرف روحانی طور پر سب سے اعلیٰ درجہ رکھتا ہے بلکہ طبی لحاظ سے بھی دماغ میں خون کی گردش کو بہتر بناتا ہے، جس سے ذہنی صلاحیت اور ارتکاز میں اضافہ ہوتا ہے۔

نماز انسان کو مسلسل خدا کی یاد میں رکھتی ہے، اور یہی ذکر الٰہی وہ زنجیر ہے جو شیطان کو انسان سے دور رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا" :اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ "(الرعد:28) یعنی دلوں کا سکون صرف ذکر خدا میں ہے، اور نماز اس ذکر کا جامع ترین مظہر ہے۔ روحانی حملے اکثر تنہائی، وسوسوں، یا غفلت کے لمحوں میں ہوتے ہیں، لیکن نماز ان تمام لمحوں کو روشن کر دیتی ہے اور انسان کو باخبر، بیدار اور متصل رکھتی ہے۔

نماز ایک مسلسل ری سیٹ بٹن کی طرح کام کرتی ہے جو دن بھر کی روحانی آلودگی، فکری الجھنوں اور نفسیاتی دباؤ کو دھو دیتی ہے۔ یہ انسان کو اس کی اصل فطرت، اس کے پروردگار، اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف بار بار لوٹاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار نماز کے قیام کی تاکید کرتا ہے، کیونکہ یہ وہ زریعہ ہے جو انسان کو نہ صرف شیطان سے بچاتا ہے بلکہ اسے خود شیطان کے خلاف ایک مجاہد بناتا ہے۔

نماز ایک انفرادی اور اجتماعی عمل ہے جو انسانی شخصیت، سماجی تعلقات اور اجتماعی شعور پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ نماز نہ صرف فرد کی روحانی تربیت کرتی ہے بلکہ اسے سماجی زندگی کے اصولوں سے ہم آہنگ بھی کرتی ہے۔

سماجیات کے لحاظ سے، نماز ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جو فرد کو جماعت سے جوڑتا ہے اور اجتماعی ہم آہنگی (social cohesion) پیدا کرتا ہے۔ جب ایک مسلمان نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، خاص طور پر جماعت کی صورت میں، تو وہ اپنی انفرادیت کو ترک کر کے ایک بڑی وحدت کا حصہ بن جاتا ہے۔ صف بندی کے دوران تمام افراد برابری کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں، جس سے سماجی مساوات (social equality) اور اخوت کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ تصور طبقاتی فرق کو مٹاتا ہے اور ایک مشترکہ روحانی تجربہ پیدا کرتا ہے، جو فرد میں اجتماعیت کی روح بیدار کرتا ہے۔

سماجی نفسیات کے مطابق، نماز انسانی رویے پر اثر انداز ہونے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ رکوع اور سجدہ جیسی حرکات صرف جسمانی اعمال نہیں بلکہ یہ خود کو جھکانے، عاجزی اختیار کرنے اور ایک بڑی ہستی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی علامت ہیں۔ یہ حرکات فرد کے نفس کو تواضع (humility) سکھاتی ہیں اور "ego" کو قابو میں رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ مستقل طور پر دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نفسیاتی کیفیت مسلسل ایک یاد دہانی کے عمل سے گزرتی رہے، جو اسے اپنی حیثیت اور مقام کا ادراک دلاتی ہے اور خود پسندی (narcissism) سے روکتی ہے۔

نماز کا اجتماعی پہلو ایک قسم کا سماجی دباؤ (social reinforcement) بھی پیدا کرتا ہے، جسے نفسیات میں "peer influence" کہا جاتا ہے۔ جب ایک فرد معاشرے میں نماز ادا کرنے والے دیگر افراد کو دیکھتا ہے، تو وہ بھی اسی طرزِ عمل کو اپنانے پر مائل ہوتا ہے۔

اس طرح نماز ایک مثبت سماجی رویہ (prosocial behavior) کو فروغ دیتی ہے، جو پورے معاشرے میں نیکی اور تقویٰ کی فضا قائم کرتا ہے۔

مزید بر آں، نماز کا وقت پر پابندی ایک نظم و ضبط (self-regulation) سکھانے کا ذریعہ ہے۔ سماجی نفسیات کے مطابق، جو افراد کسی خاص معمول (routine) کے پابند ہوتے ہیں، وہ زیادہ منظم اور پر سکون ہوتے ہیں۔ نماز فرد میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے اور اس کے اندر خود پر قابو پانے (self-discipline) کی صلاحیت کو بڑھاتی ہے، جو کہ کسی بھی مستحکم معاشرے کے لیے بنیادی ضرورت ہے۔

سماجی تفاعل (social interaction) کے نقطہ نظر سے بھی نماز ایک منفرد تجربہ ہے۔ جب مسلمان مسجد میں جمع ہو کر نماز ادا کرتے ہیں، تو یہ ان کے درمیان تعلقات کو مضبوط کرتا ہے۔ باجماعت نماز کے بعد ہونے والی مختصر گفتگو اور ملاقاتیں افراد کے درمیان اعتماد (trust) اور یکجہتی (solidarity) کو فروغ دیتی ہیں، جس سے ایک مضبوط سماجی نیٹ ورک وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے جہاں لوگ باقاعدگی سے نمازِ جماعت ادا کرتے ہیں، وہاں سماجی ہم آہنگی زیادہ پائی جاتی ہے۔

اگر نماز کے انفرادی اثرات کو دیکھا جائے تو یہ انسان میں ذہنی سکون پیدا کرتی ہے، جسے "cognitive relaxation" کہا جا سکتا ہے۔ سائیکالوجی کی تحقیقات یہ ثابت کرتی ہیں کہ عبادت کے دوران ذہن پر سکون ہوتا ہے اور منفی خیالات کم ہو جاتے ہیں۔ نماز دراصل ایک ذہنی مشق ہے، جو فرد کو اپنے مسائل اور پریشانیوں سے وقتی طور پر نکال کر ایک اعلیٰ مقصد (transcendence) سے جوڑتی ہے۔ یہی کیفیت فرد میں برداشت

(tolerance)، مثبت طرزِ فکر (positive mindset) اور جذباتی استحکام (emotional stability) کو فروغ دیتی ہے، جو سماجی زندگی میں اسے ایک متوازن شخصیت کا حامل بناتی ہے۔

علم سماجیات اور سماجی نفسیات کے تناظر میں دیکھا جائے تو نماز محض ایک عبادت نہیں، بلکہ ایک ہمہ جہت تربیتی نظام ہے جو فرد کی شخصیت اور سماجی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ یہ انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی بہتری کے لیے بھی ایک مضبوط ذریعہ ہے، جو اجتماعیت، اخوت، نظم و ضبط، مساوات اور روحانی سکون جیسے عناصر کو پروان چڑھاتا ہے۔

نماز صرف ایک انفرادی عبادت نہیں بلکہ ایک سیاسی اور روحانی تجربہ بھی ہے جو فرد اور معاشرے دونوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اگر اسے پولیٹیکل اسپریچوئیلٹی کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ فرد کے اندر ایک ایسے شعور کو بیدار کرتی ہے جو اسے نہ صرف اپنے رب کے سامنے جوابدہ بناتی ہے بلکہ اسے سماجی و سیاسی میدان میں ایک بامقصد کردار ادا کرنے پر بھی مائل کرتی ہے۔

نماز کا پہلا بنیادی اصول اللہ کی وحدانیت کا اقرار ہے، جو سیاسی طور پر فرد کو ہر ظالمانہ، جابرانہ اور غیر منصفانہ قوت سے آزاد کرتا ہے۔ جب ایک شخص کہتا ہے کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" تو وہ درحقیقت ہر اس طاقت کو رد کر رہا ہوتا ہے جو اسے اپنے رب کے علاوہ کسی اور کی غلامی میں دھکیلنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جتنے بھی ظالم حکمران گزرے ہیں، وہ ہمیشہ نماز اور عبادات کے انقلابی پہلو سے خائف رہے ہیں، کیونکہ نماز انسان کو باوقار، خودمختار اور آزاد فکر بنانے کا ذریعہ ہے۔ یہ ایک سیاسی اعلان ہے کہ انسان

کسی دنیاوی طاقت کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرے گا، سوائے اس کے جو حقیقی مالک و خالق ہے۔

رکوع اور سجدہ، جو نماز کے اہم ترین ارکان ہیں، محض جسمانی حرکات نہیں بلکہ ایک گہری روحانی اور سیاسی علامت رکھتے ہیں۔ رکوع اور سجدہ ایک طرف عاجزی کا مظہر ہیں، لیکن دوسری طرف یہ فرد کے اندر ایک اجتماعی شعور پیدا کرتے ہیں کہ انسان کو اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنے کی اجازت نہیں۔ جب کوئی شخص اللہ کے سامنے جھک کر اپنی بندگی کا اظہار کرتا ہے تو وہ لاشعوری طور پر ہر ظالم اور استحصالی نظام کے خلاف ایک نفسیاتی دیوار بھی کھڑی کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وہ شعور ہے جس نے انبیاء، آئمہ اور اسلامی انقلابات کے قائدین کو ظالم حکمرانوں کے خلاف اٹھنے کا حوصلہ دیا۔

اجتماعی نماز خاص طور پر ایک سیاسی طاقت رکھتی ہے، کیونکہ یہ امت کے اندر اتحاد، نظم و ضبط اور قیادت کی اطاعت کا عملی درس دیتی ہے۔ جب لوگ ایک امام کی اقتدا میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں تو یہ محض ایک روحانی تجربہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ قیادت کے اصول، اجتماعی نظم اور اجتماعیت کی طاقت کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم جب اللہ کے قانون کی پیروی میں متحد ہو جائے تو وہ دنیا کی کسی بھی بڑی طاقت کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکیں ہمیشہ جماعتی نماز اور اجتماعی عبادات کو اپنی جدوجہد کا لازمی حصہ بناتی ہیں، کیونکہ یہ افراد کو ایک مربوط اور نظریاتی قوت میں تبدیل کر دیتی ہے۔

نماز میں تکبیرات، قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ سب ایک معنوی اور سیاسی ترتیب رکھتے ہیں۔ تکبیرات بلند کر کے اللہ کی کبریائی کا اعلان کرنا ایک ایسے انقلابی منشور کی طرح ہے جو ہر باطل طاقت کے خلاف کھلا چیلنج ہے۔ قیام یعنی سیدھا کھڑا ہونا دراصل ایک فرد کی آزادی اور خودمختاری کی علامت ہے۔ رکوع میں جھکنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف اپنے رب کے آگے تسلیم ہو سکتا ہے، اور جب وہ سجدے میں جاتا ہے تو وہ حقیقت میں اس عہد کی تجدید کر رہا ہوتا ہے کہ اس کی اصل وفاداری اللہ کے نظام سے ہے، نہ کہ کسی جابر نظام سے۔

نماز صرف ذاتی تزکیہ کے لیے نہیں بلکہ ایک اجتماعی انقلابی تربیت بھی ہے، جو ایک فرد کے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک عظیم مقصد کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں جب بھی کوئی انقلاب برپا ہوا، اس کی بنیاد نماز اور ذکرِ الٰہی پر رکھی گئی۔ امام حسینؑ کا کربلا میں آخری وقت میں نماز ادا کرنا درحقیقت اس حقیقت کا اعلان تھا کہ نماز ایک روحانی عمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی نظریہ بھی ہے، جو فرد کو اپنے عقیدے اور اصولوں پر ثابت قدم رکھتا ہے، چاہے حالات جیسے بھی ہوں۔

نماز کی تکرار ایک مسلسل یاددہانی ہے کہ دنیا میں اصل حاکمیت اللہ کی ہے اور تمام انسان اس کے بندے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا کے تمام جابرانہ اور غیر عادلانہ نظام غیر حقیقی ہیں اور انہیں بدلنے کی ضرورت ہے۔ اگر نماز محض ایک رسمی عبادت ہوتی تو ظالم حکمران اس کے خلاف سخت اقدامات نہ کرتے۔ لیکن چونکہ نماز فرد کے اندر ایک ایسی

سیاسی اور روحانی بیداری پیدا کرتی ہے جو اسے ظلم کے خلاف اٹھنے کی ترغیب دیتی ہے، اس لیے تاریخ میں ہمیشہ نماز کو دبانے یا اس کے اثرات کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔

اگر نماز کو محض ایک رسمی عمل سمجھا جائے تو اس کی روح ختم ہو جاتی ہے، لیکن اگر اسے اس کی حقیقی روح کے ساتھ سمجھا جائے تو یہ ایک مکمل نظریہ بن جاتا ہے جو فرد کو آزاد، باوقار، جرات مند، اور سماجی و سیاسی میدان میں ایک فعال کردار ادا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکیں ہمیشہ نماز کو اپنی فکری، روحانی اور انقلابی بنیاد بناتی رہی ہیں، کیونکہ یہی وہ عمل ہے جو انسان کو ایک کامل بندہ اور ایک مثالی شہری بناتا ہے، جو ظلم کے خلاف کھڑا ہونے اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

الغرض یہ کہ نماز انسان کی روح کو وہ غذا فراہم کرتی ہے جو اسے زندہ، بیدار اور طاقتور رکھتی ہے، اور اس کے جسم کو وہ نظم، تحریک اور سکون عطا کرتی ہے جو اسے دنیاوی ذمہ داریوں کو بہتر انداز میں نبھانے کے قابل بناتی ہے۔ نماز دشمن کے روحانی اور نفسیاتی حملوں کے خلاف ایک ایسا قلعہ ہے جس میں پناہ لے کر انسان عزت، طاقت اور نجات پا سکتا ہے۔

نوجوانی میں تعلیم کیوں ضروری ہے؟

(نوجوانوں کی حصول تعلیم کیلئے غلط اہداف انہیں تعلیم سے دور کر رہے ہیں، حل کیا ہے؟)

جدید دور کے ٹین ایجرز ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جو غیر معمولی حد تک تیز رفتار، پرکشش اور ڈیجیٹل کشش سے بھرپور ہے۔ وہ دنیا جہاں مصنوعی ذہانت (AI)، انفارمیشن ٹیکنالوجی (IT)، سوشل میڈیا، گیمنگ اور یوٹیوب جیسے پلیٹ فارمز نے نوجوانوں کے ذہنوں اور دلوں میں یہ خیال راسخ کر دیا ہے کہ کامیابی صرف پیسہ کمانے، شہرت حاصل کرنے یا 'وائرل' ہونے کا نام ہے۔ ایسے میں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک گیمر یا سوشل میڈیا انفلوئنسر لاکھوں روپے صرف چند ویڈیوز یا لائیکس کے بدلے کما رہا ہے، تو ان کے ذہن میں فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر تعلیم کا فائدہ کیا ہے؟ یہ سوچ بہت خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے جب تعلیم صرف ڈگری حاصل کرنے، امتحان پاس کرنے یا والدین کو خوش کرنے کا ذریعہ بن جائے اور اس کے اندر جو روح، بصیرت اور کردار سازی کا پہلو ہے وہ دھندلا جائے۔ اگرچہ پیسہ کمانا زندگی کا ایک اہم پہلو ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر اس کو زندگی کا واحد مقصد سمجھ لینا انسان کو نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی کے اصل مقصد سے بھی دور کر دیتا ہے۔ بچوں کے دلوں میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پیسے کے تصور کو تعلیم سے جوڑ کر اس انداز میں پیش کیا جائے جو صرف دنیاوی فوائد تک محدود نہ ہو بلکہ شخصیت سازی، مہارت، خدمت، اور عزتِ نفس سے بھی متعلق ہو۔

ہمیں بچوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ پیسہ خود کوئی برائی نہیں، لیکن بغیر علم کے حاصل کیا گیا پیسہ اکثر انسان کو خود غرض، غیر ذمہ دار، یا گمراہ کر دیتا ہے۔ تعلیم انسان کو صرف روزگار کے لیے ہی تیار نہیں کرتی، بلکہ وہ اسے سیکھنے، سمجھنے، مسائل کو حل کرنے، دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے، اور خود کو بہتر بنانے کا شعور عطا کرتی ہے۔ ایک بچہ جب دیکھتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ نہ صرف بہتر پیسہ کماتے ہیں بلکہ معاشرے میں ان کی عزت بھی ہوتی ہے، ان کے فیصلے سنے جاتے ہیں، اور وہ دوسروں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اس کی سوچ تبدیل ہونے لگتی ہے۔

آج تعلیم کے خلاف جو غیر محسوس بغاوت نوجوانوں کے اندر پیدا ہو رہی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ تعلیم کو زندگی کے حقیقی مسائل سے کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اسکول میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے، اس کا ان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ جب بچے الجبرا کے فارمولے، سائنس کی اصطلاحات یا تاریخ کی تاریخیں یاد کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں جان پاتے کہ ان چیزوں کا ان کی روزمرہ کی زندگی، ان کے جذبات یا ان کے خوابوں سے کیا تعلق ہے، تو وہ قدرتی طور پر علم سے دور ہونے لگتے ہیں۔

دوسری جانب والدین اور اساتذہ اکثر تعلیم کی اہمیت پر زور تو دیتے ہیں، لیکن اس انداز میں کہ جس میں محبت کم اور دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ "پڑھائی نہ کی تو کچھ نہیں بنو گے" یا "آج کل تو پڑھا لکھا انسان ہی کامیاب ہوتا ہے" — یہ جملے شاید نیت کے لحاظ سے درست ہوں، لیکن بچے کے ذہن پر یہ دباؤ ڈالتے ہیں، اسے خوف دلاتے ہیں، جبکہ آج کا نوجوان

صرف خوف سے متحرک نہیں ہوتا، بلکہ وہ سمجھنا چاہتا ہے، دلیل مانگتا ہے، اور خود اپنی اہمیت کا ادراک چاہتا ہے۔

ایسے میں ہمیں تعلیم کے مفہوم کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بچوں کو یہ سمجھانا ہوگا کہ تعلیم صرف ایک ذریعہ معاش نہیں بلکہ ایک ذریعہ حیات ہے۔ تعلیم صرف روزگار کی سیڑھی نہیں، یہ شعور کی کھڑکی بھی ہے، کردار کی تعمیر بھی ہے، اور انسانی معاشرت کو بہتر بنانے کا ذریعہ بھی۔ ایک تعلیم یافتہ انسان صرف کمانے کے لیے نہیں جیتا، بلکہ سوچنے، محسوس کرنے، سوال کرنے، سچائی کو تلاش کرنے اور زندگی کو باوقار طریقے سے گزارنے کا سلیقہ سیکھتا ہے۔

اگر ہم تعلیم کو بچوں کے سامنے صرف امتحانات کی تیاری، گریڈز کے حصول یا نوکری کی دوڑ کے تناظر میں پیش کریں گے، تو وہ اس سے بدظن ہوں گے۔ لیکن اگر ہم علم کو ایک تخلیقی تجربہ، ایک خودشناسی کا ذریعہ، اور اپنے شوق کو مقصد میں ڈھالنے کا راستہ بنا کر پیش کریں، تو بچے خود بخود اس کی طرف مائل ہوں گے۔ تعلیم کو خشک اور الگ تھلگ نظریاتی معلومات کی بجائے بچوں کی دلچسپی، سوالات، مشاہدات اور زندگی کی حرارت سے جوڑنا ہوگا۔

بچوں کو چاہیے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ آج کے دور میں ٹیکنالوجی، طب، انجینئرنگ، بزنس، اور یہاں تک کہ آرٹس اور لسانیات جیسے شعبے بھی اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جنہوں نے محنت سے تعلیم حاصل کی، مہارتیں سیکھیں، اور علم کی بنیاد پر اپنے راستے بنائے۔ چاہے وہ یوٹیوب ہو یا پروگرامنگ، گرافک ڈیزائن ہو یا ڈیجیٹل مارکیٹنگ، ہر جگہ تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر بچے پیسہ کمانا چاہتے ہیں، تو ان کو یہ بات سکھائی جانی چاہیے کہ

بغیر علم اور مہارت کے کمائی کا سلسلہ عارضی، غیر محفوظ، اور کم سطحی ہوتا ہے، جبکہ علم کے ذریعے کمائی جانے والی دولت پائیدار، بابرکت، اور خوداعتمادی بخش ہوتی ہے۔

اساتذہ اور والدین دونوں کا کردار یہاں بہت اہم ہے۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں کے خوابوں کو سنیں، ان کی دلچسپیوں کو سمجھیں، اور ان کے شوق کو تعلیمی راہ میں ڈھالیں۔ مثلاً جب کوئی بچہ سوشل میڈیا پر دلچسپی رکھتا ہے، تو اسے یہ سمجھایا جاسکتا ہے کہ سوشل میڈیا کے پیچھے جو نفسیات، جو کمیونیکیشن تھیوری، جو ٹیکنالوجی، جو معاشرتی اثرات اور جو اخلاقی سوالات ہیں—یہ سب تعلیم سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ یوٹیوب پر ویڈیوز بنانا پسند کرتا ہے تو اسے یہ دکھایا جاسکتا ہے کہ ایک کامیاب ویڈیو میں زبان کا کیا کردار ہوتا ہے (لینگویج آرٹس)، کس قسم کی روشنی اور زاویہ استعمال ہوتا ہے (فزکس)، مواد کی ترتیب میں نفسیات کا کیا دخل ہے، اور اس کے اثرات کس قسم کے سماجی رویے پیدا کرتے ہیں (سوشیالوجی)۔ اگر بچہ کمپیوٹر گیمز میں دلچسپی رکھتا ہے، تو اسے گیم ڈویلپمنٹ، گرافک ڈیزائن، یا کوڈنگ کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ محسوس کرے کہ اس کا شوق تعلیم کے ذریعے ترقی پاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بچہ آرٹ میں دلچسپی رکھتا ہے، تو اسے سمجھایا جاسکتا ہے کہ وہ تعلیم کے ذریعے ایک کامیاب آرٹسٹ، اینی میٹر، یا کریئیٹو ڈائریکٹر بن سکتا ہے، جس سے وہ پیسہ بھی کماسکتا ہے اور عزت بھی پاسکتا ہے۔ تھوڑا تفصیل سے دیکھیں تو پرائمری سطح پر بچے جو بنیادی مضامین پڑھتے ہیں، جیسے ریاضی، زبان، سائنس، اور مطالعہ پاکستان، وہ بظاہر سادہ لگتے ہیں مگر دراصل یہ ہی بنیاد بنتے ہیں مستقبل کے کسی بھی پیشے یا مہارت کی۔ مثال کے طور پر ریاضی میں سیکھے گئے عددی تصورات، جمع تفریق، فی صد، اور پیمائش جیسے موضوعات بعد

میں کاروبار، بینکنگ، اکاؤنٹنگ یا حتیٰ کہ آن لائن شاپنگ اور بجٹ بنانے تک میں کام آتے ہیں۔ زبان (اردو یا انگریزی) کے ذریعے بچے لکھنے، بولنے، اور سمجھنے کی مہارتیں حاصل کرتے ہیں جو بعد میں کسی بھی پیشے میں—چاہے وہ استادی ہو، صحافت، کانٹینٹ رائٹنگ، یا وکالت—میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ سائنس بچوں کو مشاہدہ، تجربہ، اور تجسس کی طرف مائل کرتی ہے، جو انہیں مستقبل میں ڈاکٹر، فارماسسٹ، لیب ٹیکنیشن، یا کسی سائنسی میدان میں لے جا سکتی ہے۔ مطالعہ پاکستان اور اسلامیات انہیں تاریخ، ثقافت، اور اقدار سے جوڑتے ہیں، جو آگے جا کر کسی سوشل ورکر، استاد، محقق یا مصنف کے کام آسکتے ہیں۔

سیکنڈری سطح پر آکر مضامین تھوڑے تخصصی ہو جاتے ہیں اور بچوں کو ان کی عملی افادیت کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی طالب علم کمپیوٹر پڑھتا ہے تو وہ بنیادی پروگرامنگ، ورڈ پراسیسنگ، اور ڈیزائننگ جیسے اسکلز سیکھتا ہے جنہیں بعد میں فری لانسنگ یا نوکری میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ریاضی کا مضمون الجبرا، جیومیٹری، اور ڈیٹا ہینڈلنگ جیسے شعبے سکھاتا ہے جو بعد میں انجینئرنگ، اکاؤنٹنگ، یا بزنس مینجمنٹ کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ سائنس کے مضامین بچوں کو فزکس، کیمسٹری اور بایولوجی جیسے شعبوں سے متعارف کرواتے ہیں جن سے وہ آگے چل کر میڈیکل، فارما، ریسرچ یا انوائرنمنٹل اسٹڈیز کی طرف جا سکتے ہیں۔ زبان کے مضامین جیسے اردو اور انگریزی، بچوں میں تخلیقی صلاحیت، تحریر کی خوبصورتی، اور اظہار کی مہارت پیدا کرتے ہیں جو انہیں مصنف، بلاگر، یوٹیوبر، ترجمہ نگار یا اسپیکر بننے کی راہ دکھاتے ہیں۔

ہائی اسکول کی سطح پر مضامین مزید واضح راستے فراہم کرتے ہیں۔ اکنامکس، کامرس، بزنس اسٹڈیز، کمپیوٹر سائنس، بایولوجی، فزکس، سوشیالوجی، نفسیات — یہ سب مضامین ایسے شعبوں سے متعلق ہوتے ہیں جن سے بچے عملی دنیا میں داخل ہو کر روزگار حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً بزنس اسٹڈیز اور اکاؤنٹنگ سیکھنے والے بچے اپنے کاروبار شروع کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں یا بینکوں اور کمپنیوں میں نوکری کے اہل ہو جاتے ہیں۔ کمپیوٹر سائنس کے طلبہ ویب ڈویلپمنٹ، گرافک ڈیزائن، یا سافٹ ویئر انجینئرنگ میں مہارت حاصل کر کے گھر بیٹھے بھی کمائی کر سکتے ہیں۔ بایولوجی اور فزکس کے طالب علم میڈیکل اور انجینئرنگ کی فیلڈ میں جا سکتے ہیں، جہاں مہارت کے ساتھ ساتھ اچھی آمدنی بھی حاصل ہوتی ہے۔ سوشیالوجی یا نفسیات جیسے مضامین معاشرتی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں مدد دیتے ہیں، جن کی مانگ نا صرف تعلیمی اداروں بلکہ مختلف NGOs اور کونسلنگ سینٹرز میں بھی ہے۔

بچوں کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ ہر مضمون میں علم کا ایک ایسا خزانہ چھپا ہوا ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں کام آتا ہے۔ ریاضی دماغ کو منطقی بناتی ہے، اردو اور انگریزی زبان اظہارِ خیال کو بہتر بناتی ہیں، سائنس قدرت کے رازوں کو سمجھنے کا ذریعہ بنتی ہے، اور اسلامیات انسان کو روحانی بیداری عطا کرتی ہے۔ ان سب مضامین کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق ایک کامیاب، باوقار اور مؤثر انسان بننے سے ہے، جو دنیا میں بھی کامیاب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔

جب تعلیم کو بچوں کی دلچسپیوں، خوابوں، اور عملی زندگی سے جوڑ کر پیش کیا جائے، تو وہ نہ صرف تعلیم کو پسند کرنے لگتے ہیں بلکہ اس میں مقصد اور جذبہ بھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب علم، دولت اور مقصدیت ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اور بچہ خود بخود اس راستے پر چلنے لگتا ہے جو اسے صرف پیسہ نہیں بلکہ عزت، اطمینان اور رضائے الٰہی عطا کرتا ہے۔ اس طرح تعلیم ایک مردہ مضمون نہیں، بلکہ جیتی جاگتی دنیا بن جاتی ہے۔

اسی طرح، جب بچے دیکھتے ہیں کہ تعلیم انہیں صرف پیسے کے بارے میں سکھاتی ہے، تو وہ پیسہ ہی کو حتمی مقصد سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں بتایا جائے کہ تعلیم ہمیں پیسہ کمانے کا سلیقہ ہی نہیں بلکہ خرچ کرنے، بچانے، بانٹنے، اور حلال و حرام کی تمیز سکھاتی ہے، تو ان کے اندر ایک اخلاقی معیار پیدا ہونے لگے گا۔ وہ صرف امیر بننے کے لیے نہیں، اچھا انسان بننے کے لیے بھی علم حاصل کرنا چاہیں گے۔

اس عمل میں والدین اور اساتذہ کا کردار نہایت حساس ہے۔ والدین صرف ڈانٹنے یا تقابل کرنے کے بجائے، بچوں کے ساتھ مکالمہ کریں، ان کے سوالات سنیں، ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوں۔ والدین خود سیکھنے اور مطالعہ کرنے کا ماحول بنائیں تاکہ بچے انہیں رول ماڈل کے طور پر دیکھیں۔ اسی طرح اساتذہ بھی صرف نصاب پڑھانے والے نہ ہوں، بلکہ طلباء کے خوابوں اور الجھنوں کے ساتھی بنیں۔ وہ بچے کو صرف "کیا پڑھنا ہے" نہ بتائیں، بلکہ "کیوں پڑھنا ہے" اور "کیسے پڑھنا ہے" بھی سکھائیں۔

تعلیم کو صرف دنیاوی مفادات، روزگار یا شہرت کا ذریعہ سمجھنا آج کے نوجوانوں کا عمومی رجحان بنتا جا رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ان سطحی چیزوں سے کہیں زیادہ بلند، بامعنی اور الٰہی ہے۔ ایک مؤمن نوجوان کو چاہیے کہ وہ اپنی تعلیم کو محض

ایک پیشہ ورانہ ضرورت نہ سمجھے بلکہ اسے ایک روحانی سفر، ایک الٰہی ذمہ داری اور اپنے امام زمانہ (عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف) سے وابستہ ایک دینی فریضہ جانے۔ یہ شعور کہ "میں اس دنیا میں کیوں آیا ہوں؟"، "میرا اصل مقصد کیا ہے؟" اور "مجھے اپنی زندگی کو کہاں لے جانا ہے؟" ہی وہ بنیادیں ہیں جو انسان کو عارضی فائدوں سے اٹھا کر ابدی فلاح کے سفر پر لے جاتی ہیں۔

اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان محض کھانے، پینے اور کمانے کے لیے نہیں پیدا ہوا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، بندگی، اور اس کی زمین پر اس کے دین کو قائم کرنے کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے": وَما خَلَقتُ الجِنَّ وَالإِنسَ إِلّا لِيَعبُدونِ "یعنی میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ عبادت صرف نماز اور روزہ تک محدود نہیں، بلکہ ہر وہ عمل جو اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، وہ عبادت بن جاتا ہے—چاہے وہ علم حاصل کرنا ہو، کسی بیمار کی خدمت ہو، یا اپنے سماج کی اصلاح کے لیے کام کرنا ہو۔

اسی تناظر میں تعلیم کو اگر ہم صرف دنیاوی ترقی یا مادی کامیابی کا ذریعہ سمجھیں، تو ہم اس کے اصل مقصد سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں علم کا حصول نہ صرف دنیا کی بہتری کے لیے ہے، بلکہ آخرت کی کامیابی کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان حق و باطل کے درمیان فرق کرنا سیکھتا ہے، اپنی خواہشات پر قابو پانے کا ہنر پاتا ہے، اور دنیا کی ظاہری چمک کے پیچھے چھپے خطرات کو پہچانتا ہے۔ رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا": علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ " اور امام علی علیہ

السلام نے فرمایا" : علم دولت سے بہتر ہے، علم تمہاری حفاظت کرتا ہے جبکہ دولت تمہیں اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ " یہ اقوال ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ علم ایک روحانی سرمایہ ہے جو انسان کو اس کی اصل پہچان عطا کرتا ہے۔

جب ہم امام زمانہؑ کے انتظار کی بات کرتے ہیں تو یہ انتظار محض جذباتی یا خیالی بات نہیں بلکہ ایک عملی ذمہ داری ہے۔ امام علیہ السلام کے ظہور کے لیے سب سے بڑی تیاری یہی ہے کہ ہم علمی، فکری اور اخلاقی طور پر اس قابل بنیں کہ ان کے ناصروں میں شامل ہو سکیں۔ امام کے ظہور کا خواب صرف وہی دیکھ سکتا ہے جو علم کے راستے پر ہے، جو دنیا کو عدل سے بھرنے کی سوچ رکھتا ہے، اور جو ظلم، جہالت، اور فتنہ کے خلاف کھڑا ہونے کی صلاحیت حاصل کر رہا ہے۔ اس لیے ایک نوجوان کو چاہیے کہ وہ اپنی تعلیم کو امام زمانہؑ کی نصرت کا ذریعہ بنائے۔ وہ انجینئر بنے تو اس نیت سے کہ ملت اسلامیہ کی خدمت کرے، وہ ڈاکٹر بنے تو امت کی جسمانی و روحانی صحت کا محافظ بنے، وہ استاد بنے تو آنے والی نسلوں کو بیداری، تقویٰ اور معرفت سے آراستہ کرے۔

تعلیم دنیا کے لیے اس لیے اہم ہے کہ ایک باشعور، باعلم، اور صاحبِ حکمت انسان ہی معاشرے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ لیکن تعلیم آخرت کے لیے بھی ضروری ہے کیونکہ یہ انسان کے عمل کو نیت، خلوص اور ہدایت کے دائرے میں لے آتی ہے۔ علم کے بغیر عبادت اندھی، اور خدمت غیر مؤثر ہوتی ہے۔ صرف تعلیم ہی انسان کو یہ شعور دیتی ہے کہ کون سا عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہے اور کون سا رد کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا ایک مؤمن نوجوان جب یہ طے کر لیتا ہے کہ اس کی تعلیم کا مقصد صرف نوکری، دولت یا شہرت نہیں بلکہ اللہ کی رضا، انسانیت کی خدمت، امت کی بیداری، اور امام زمانہؑ کی نصرت ہے، تو اس کی نظر دنیا کے فریب سے بلند ہو جاتی ہے۔ تب وہ جو کچھ پڑھتا ہے، سیکھتا ہے، یا کرتا ہے—وہ سب اس کے لیے عبادت بن جاتا ہے، چاہے وہ ریاضی ہو یا تاریخ، سائنس ہو یا ادب۔ تب تعلیم اس کے لیے روشنی بن جاتی ہے جو دنیا میں اس کی رہنمائی کرتی ہے، اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنتی ہے۔

یہی وہ زاویہ نظر ہے جو نوجوان کو سطحی خواہشات سے نکال کر اعلیٰ مقصد کی طرف لے جاتا ہے، اور تعلیم کو ایک عظیم روحانی جہاد کا روپ دیتا ہے۔ تب علم ایک روحانی بیداری بن جاتا ہے، جو اسے دنیا میں عبدِ صالح اور آخرت میں نجات یافتہ بندہ بننے کے قابل بناتا ہے۔ تعلیم کو ایک سفر کی مانند سمجھنا اور سمجھانا ضروری ہے۔ ایک ایسا سفر جو انسان کو اپنے آپ سے، اپنے رب سے، اور اپنی کائنات سے جوڑتا ہے۔ جب علم کو اس زاویے سے پیش کیا جائے، تو بچے نہ صرف اس میں دلچسپی لیں گے، بلکہ اسے اپنی شخصیت کا حصہ بھی بنا لیں گے۔ تب تعلیم صرف کامیابی کا ذریعہ نہیں، بلکہ سعادت کا راستہ بن جائے گی۔

اقتصادی بائیکاٹ: دشمن سے نبرد کا پرامن ترین نمونہ

اقتصادی بائیکاٹ دراصل عصر حاضر کی وہ جنگ ہے جو گولیوں اور توپوں کے بغیر لڑی جاتی ہے مگر اس کے اثرات دشمن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں کسی بھی سخت جنگ سے کم نہیں ہوتے۔ اسے جدید دور میں "سوفٹ وار" یا "نرم جنگ" کہا جاتا ہے، جس میں ایک باشعور اور بیدار قوم اپنی عقل، غیرت اور بصیرت کے ساتھ دشمن کے مالی مفادات پر ضرب لگاتی ہے۔ یہ ایک پرامن، قانونی اور مہذب طریقہ ہے، جو نہ صرف اپنے ملک و قوم کے دفاع کا ذریعہ بنتا ہے بلکہ دنیا کے سامنے ایک مثبت اور باوقار پیغام بھی دیتا ہے کہ ایک باضمیر قوم کس طرح ظلم کے خلاف خاموش نہیں رہتی۔

بدقسمتی سے جب کبھی کسی صیہونی، سامراجی یا استعمار پسند کمپنی یا برانڈ کے بائیکاٹ کی بات کی جاتی ہے تو کچھ لوگ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ چونکہ یہ مصنوعات ہمارے ملک کے اندر ہی تیار ہوتی ہیں اور ہمارے ہی لوگ ان میں ملازمت کرتے ہیں، لہذا ان کا بائیکاٹ مقامی معیشت کو نقصان پہنچائے گا۔ یہ دلیل بظاہر منطقی لگ سکتی ہے، مگر درحقیقت یہ نہایت سطحی، کم فہم اور خطرناک سوچ ہے۔ کیونکہ جو چیز ظاہراً "مقامی" نظر آتی ہے، وہ اصل میں سامراجی سرمایہ، منصوبہ بندی اور نظریاتی غلبے کا حصہ ہوتی ہے۔ ان کمپنیوں کے منافع کا بڑا حصہ براہِ راست ان طاقتوں کی جیب میں جاتا ہے جو مسلمانوں کا خون بہانے، ان کے عقائد پر حملے کرنے، اور ان کے وسائل پر قبضہ جمانے میں مصروف ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک سچا مسلمان یا باغیرت پاکستانی صرف اس لیے دشمن کے ساتھ معاشی اشتراک کو قبول کرے کہ اس سے کچھ نوکریاں مقامی لوگوں کو ملتی ہیں؟ کیا ایک یا چند افراد کی روزی روٹی کا تحفظ اس سے زیادہ اہم ہے کہ وہی سرمایہ ہزاروں مظلوم فلسطینیوں، لبنانیوں، یمنیوں یا عراقیوں کے قتل عام میں استعمال ہو رہا ہو؟ کیا ہماری قومی غیرت، ایمان، اور انسانی ہمدردی اس قدر ارزاں ہو گئی ہے کہ ہم چند ملازمتوں کے بدلے میں دشمن کو معاشی سہارا دینے لگیں؟ سچ یہ ہے کہ جب ایک مقامی تاجر یا ادارہ دشمن کی کسی کمپنی کا ایجنٹ بنتا ہے یا اس کی مصنوعات کی تشہیر و فروخت کرتا ہے، تو وہ صرف کاروبار نہیں کر رہا ہوتا بلکہ وہ دشمن کے ساتھ ایک غیر اعلانیہ معاہدہ کر رہا ہوتا ہے کہ "ہم تمہارے ظلم، قتل اور سامراجی نظام میں خاموش شریک ہیں۔"

اگر ایک تاجر واقعی ایمان دار ہو، اگر وہ واقعی اپنی قوم، ملت اور امت کی عزت، سلامتی اور آزادی سے محبت رکھتا ہو، تو کیا وہ ایسا کاروبار اختیار نہیں کرے گا جس میں اس کے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون سے رنگین نہ ہوں؟ کیا رزق صرف انہی کمپنیوں سے وابستگی میں محدود ہے جن کے پیچھے صہیونی لابی یا مغربی استعمار کھڑا ہے؟ دنیا میں ہزاروں مباح اور شریعت کے دائرے میں رہنے والے کاروبار موجود ہیں جن سے روزی بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور ضمیر بھی مطمئن رکھا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو بھی شخص یا ادارہ دشمن کی مصنوعات کی ترویج کرتا ہے، وہ نہ صرف اپنے دین اور قوم سے خیانت کرتا ہے بلکہ دنیا و آخرت میں سنگین جواب دہی کا بھی سامنا

کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو چند پیسوں کی خاطر، یا وقتی سہولت کے لیے، اپنے ہی بھائیوں کے قاتلوں کو تقویت دیتے ہیں۔ یہ شعور کا فقدان نہیں بلکہ ضمیر کی موت ہے۔

لہذا اقتصادی بائیکاٹ محض ایک جذباتی نعرہ نہیں بلکہ ایک شعوری جدوجہد ہے، جو ایک عظیم نصب العین کی طرف پیش قدمی ہے۔ یہ مزاحمت کی سب سے مؤثر شکل ہے جو دشمن کی جڑ پر وار کرتی ہے اور مظلومین عالم کے ساتھ عملی یکجہتی کا اظہار بن جاتی ہے۔ جب تک ہم بحیثیت ملت یہ شعور اور غیرت پیدا نہیں کرتے، ہماری مزاحمت ادھوری، اور ہماری دعائیں بے اثر رہیں گی۔ دشمن سے قطع تعلق ہی حقیقی آزادی کی پہلی شرط ہے، اور یہ قطع تعلق سب سے پہلے معیشت کے میدان میں ہونا چاہیے، ورنہ ہمارا ایمان اور ہمارا خون دونوں دشمن کی تجارت کی زینت بنے رہیں گے۔

تولا و تبرا، تقیہ و جہاد

تولا اور تبرا شیعہ مکتب فکر کے دو بنیادی اصول ہیں جو محبت و نفرت کے پیمانوں پر دین کی سیاسی اور روحانی شناخت کو واضح کرتے ہیں۔ تولا کا مطلب ہے اہل بیت علیہم السلام سے محبت، ان کے علم، تقویٰ، اور ولایت کو دل و جان سے قبول کرنا، جبکہ تبرا کا مطلب ہے اہل بیتؑ کے دشمنوں، ظالموں، غاصبوں اور منافقوں سے دل کی گہرائیوں سے بیزاری اور نفرت رکھنا۔ یہ دونوں اصول صرف ذاتی عقیدت کے اظہار کا ذریعہ نہیں، بلکہ مذہبی سیاست، حکمت عملی اور جہاد کی بنیاد بھی ہیں۔ ان اصولوں کے بغیر نہ تو دینی غیرت کا مفہوم مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی دین کی حفاظت کا نظام۔

تولا تبرا کا تصور دراصل ایک مسلسل روحانی و سیاسی شعور کی تشکیل ہے۔ تولا محبت کے ذریعے انسان کو عدل، تقویٰ، علم اور ہدایت کی طرف مائل کرتا ہے، اور تبرا اس شعور کو دفاعی و انقلابی رخ دیتا ہے تاکہ انسان باطل، ظلم، نفاق، اور فتنہ کے خلاف اپنی فکری و عملی جدوجہد کو واضح کرے۔ ان دونوں اصولوں کی بنیاد قرآن مجید میں موجود ہے۔ "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ... إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً" (الممتحنۃ:4-6)۔ ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اصحاب کے طرز عمل کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے دشمنوں سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں مگر تقیہ کی گنجائش بھی رکھتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں تولا و تبرا کے ساتھ تقیہ کی حکمت جڑتی ہے۔

تقیہ کا اصول ایک محتاط سیاسی و مذہبی تدبیر ہے، جو کمزوری کے دور میں اہل حق کو محفوظ رکھتا ہے۔ جب شیعہ اپنے نظریات کی آزادی سے محروم ہوں، جب اظہار حق کی راہ میں قتل و

غارت ہو، جب محبت اہل بیت کو جرم قرار دیا جائے، تب تقیہ ایک دینی ذمہ داری بن جاتا ہے، تاکہ تولا و تبرا کی روشنی دلوں میں محفوظ رہے، اور مستقبل میں اس کا پرچم بلند کیا جا سکے۔ اس کے برعکس اگر کمزوری کے دور میں تقیہ ترک کرکے تبرا کا جذباتی اظہار کیا جائے، تو وہ تبرا دشمن کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اہل حق کو مٹادے۔ یہی وجہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "التَّقِیَّةُ دِینِی وَدِینُ آبَائِی" — تقیہ میرا اور میرے آباء کا دین ہے۔

یہاں اہم بات یہ ہے کہ تقیہ ہرگز تبرا کا انکار نہیں، بلکہ اس کی حفاظت کا راستہ ہے۔ جیسے جہاد صرف تلوار کا نام نہیں بلکہ مرحلہ وار سیاسی جدوجہد، اصلاح، اور شعور بیداری کا نام ہے، ویسے ہی تبرا بھی محض لعن وسب نہیں بلکہ ایک فکری اور عملی موقف ہے جسے وقت، طاقت، اور حالات کی مناسبت سے بیان کیا جاتا ہے۔ ائمہ معصومینؑ کی سیرت میں ہمیں یہ حکمت نظر آتی ہے۔ امام علی علیہ السلام نے غصب خلافت کے باوجود صبر اختیار کیا، مگر تبرا کا ایک نرم مگر فکری انداز باقی رکھا — خطبہ شقشقیہ اور نہج البلاغہ کے دیگر بیانات اس کی مثالیں ہیں۔ امام سجاد علیہ السلام نے تبرا کو دعاوں اور مناجات کے پیرائے میں منتقل کر دیا تاکہ حکومتی جبر کے دور میں حق کی خوشبو باقی رہے۔ امام باقرؑ و صادقؑ نے علمی مراکز قائم کیے جہاں تولا و تبرا کو علم و معرفت کے قالب میں ڈھالا گیا۔

جب مذہبی سیاست کی بات کی جائے تو تولا و تبرا وہاں بھی مرکزیت رکھتے ہیں۔ ایک شیعہ ریاست یا معاشرہ صرف اہل بیت کی محبت پر قائم نہیں رہتا بلکہ اسے ان کے دشمنوں سے مکمل علیحدگی اور اعلان بیزاری بھی کرنا ہوتا ہے تاکہ حق اور باطل کے درمیان فرق واضح

رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی انقلاب ایران کے بعد نظام ولایت فقیہ نے اسرائیل و امریکہ جیسے طاغوتی نظاموں سے تبرا کا اعلان کیا، اور فلسطین، یمن، عراق، اور لبنان جیسے مظلوم معاشروں سے تولا کا مظاہرہ کیا۔ اس سیاست کی جڑیں سیرت ائمہؑ میں موجود ہیں۔

جہاد بھی تولا و تبرا سے جڑا ہوا ہے۔ جہاد محض تلوار چلانے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مکمل فکری، سیاسی، نفسیاتی، اور عسکری عمل ہے جو محبت اہل بیت اور ان کے دشمنوں سے نفرت کے بغیر اپنی روح کھو دیتا ہے۔ جب امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں جہاد کیا تو ان کا جہاد تولا کی معراج اور تبرا کا بلند ترین اعلان تھا۔ انہوں نے اپنے خون سے بتایا کہ تولا کا کمال یہ ہے کہ انسان اہل حق کے ساتھ جان دے دے، اور تبرا کا کمال یہ ہے کہ انسان یزید جیسے فاسق کے ساتھ کسی صورت صلح نہ کرے۔

خلاصہ یہ کہ تولا اور تبرا ایک زندہ، متحرک اور مدبرانہ نظام کا نام ہے، جو تقیہ اور جہاد جیسے اصولوں کے ساتھ مل کر ایک باوقار دینی وسیاسی زندگی کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ان اصولوں کا درست فہم نہ صرف ہماری انفرادی زندگی بلکہ اجتماعی وعالمی سیاست میں بھی روشنی کا منبع بن سکتا ہے، اگر ہم ان اصولوں کو محض رسم وروایت سے نکال کر حکمت و ادراک کی سطح پر سمجھیں اور نافذ کریں۔

تولا و تبرا کا مفہوم اگر محض تاریخی حوالوں تک محدود کر دیا جائے تو یہ زندہ اور فعال دینی اصول نہیں رہتے، بلکہ صرف ایک جذباتی یادگار یا ماضی کی وابستگی کا مظہر بن کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اہل بیت علیہم السلام نے تولا و تبرا کو ایک زندہ اصول، ایک جاری شعور، اور

ایک مسلسل انقلابی فریضہ قرار دیا ہے، جسے ہر زمانے کے مطابق تازہ ہونا ہے اور ہر دور کے باطل کے خلاف اپنے انداز میں بروئے کار آنا ہے۔

ماضی کے کرداروں اور ظالم و منافق افراد پر تبرا کا اظہار دراصل حق و باطل کے معیارات کو سمجھنے کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ یہ مرحلہ ایک فرد کے عقیدے کی بنیاد، قلبی وابستگی، اور شخصیت کی دینی شناخت کا تعین کرتا ہے۔ یہ تبرا کسی ماضی کے شخص سے ذاتی بغض کا نہیں بلکہ ایک باطل نظریے، ظلم کی روش، اور دین کے خلاف برپا سازشوں سے نفرت کا علامتی اظہار ہے۔ اسی طرح تولا صرف اہل بیتؑ کی ذاتی محبت یا عقیدت کا نام نہیں، بلکہ ان کی راہ، ان کی سیرت، ان کے علم، ان کے عدل، اور ان کے سیاسی و سماجی نظام سے عملی وابستگی ہے۔

لیکن یہی محبت اور نفرت جب صرف زبان تک محدود رہ جائے، یا سالانہ مجالس و جلوسوں میں نعرہ بازی اور گریہ وزاری تک محدود ہو جائے، تو یہ اصول اپنے مقصد سے دور ہو جاتے ہیں۔ ان کا اصل ہدف ہے انسان کو ایسا شعور دینا جو زمانے کے فرعونوں، قارونوں، اور بلعم باعوروں کو پہچانے، اور پھر ان کے خلاف حکمت، شعور، اور اجتماعی طاقت کے ساتھ قیام کرے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں تولا و تبرا، تاریخ سے اٹھ کر عصر حاضر کی سیاست، معیشت، ثقافت، اور میڈیا کے محاذوں تک پہنچتے ہیں۔

آج کے دور کا یزید وہ نظام ہے جو سرمایہ پرستی، اخلاقی انحطاط، جنسی بے راہ روی، میڈیا کے ذریعے ذہن سازی، استعماری تسلط، اور مذہبی تفرقہ بازی کو فروغ دیتا ہے۔ آج تولا یہ ہے کہ ہم ہر اس نظام کے ساتھ ہوں جو مظلوموں کی حمایت کرتا ہے، فلسطین، یمن، کشمیر، اور

دیگر مقامات پر مظلوموں کی صدائے احتجاج میں شامل ہوں، عدل پر مبنی حکومتوں، مستضعفین کے حق کی بات کرنے والوں، اور دینی غیرت و حمیت کا مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ کھڑے ہوں۔ اور تبرا یہ ہے کہ ہم ہر اس فکری، ثقافتی، معاشی اور عسکری تسلط سے بیزاری کا اعلان کریں جو طاغوتی نظام کے ذریعے انسانیت کو گمراہی، شرک، اور ظلم کی طرف لے جارہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام خمینیؒ نے تولا و تبرا کو ایک زندہ شعور میں بدل کر انقلاب اسلامی کی بنیاد بنایا۔ ان کے نزدیک تولا فقط اہل بیت کی محبت نہیں تھی بلکہ وہ عدل پر مبنی حکومت تھی جس کے لیے ائمہؑ نے قربانیاں دیں، اور تبرا فقط یزید کو لعنت بھیجنے کا نام نہیں بلکہ ہر اس باطل نظام سے برسرپیکار ہونا تھا جو یزیدی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔

لہٰذا تولا و تبرا کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ایک مومن محض محرم، صفر، یا دیگر ایام میں ماضی کی یاد میں ڈوب کر صرف ماتم نہ کرے بلکہ وہ ان اصولوں کو اپنی موجودہ زندگی کی سمت، شناخت، اور موقف میں عملی طور پر اتارے۔ وہ اپنے تعلیمی، معاشی، سیاسی، اور ثقافتی فیصلے تولا و تبرا کے اصولوں پر پرکھے۔ وہ جدید دور کے یزیدی ایجنڈوں کو پہچان کر ان سے الگ ہو، اور حسینی مشن کے جدید نمائندوں کا ساتھ دے۔

یہی فرق ہے ماضی کے کرداروں پر جذباتی تبرا اور دورِ حاضر کے باطل کے خلاف عملی تبرا میں۔ پہلا صرف شعور کی تشکیل کرتا ہے، جب کہ دوسرا شعور کے بعد کردار کی تعمیر، اقدام کی ہمت، اور دین کی خدمت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ تولا و تبرا صرف ماضی کی داستان

نہیں بلکہ ہر زمانے میں جاری ایک انقلابی نظامِ فکر ہے، جو ہمیں نہ صرف شناخت دیتا ہے بلکہ عمل، مزاحمت، اور اصلاح کی راہیں بھی دکھاتا ہے۔

دورِ حاضر میں جب حق و باطل کی کشمکش مختلف میدانوں میں جاری ہے — خواہ وہ نظریاتی ہو، ثقافتی ہو، تعلیمی ہو یا سیاسی — اس مرحلے پر شعوری تقیہ ایک نہایت حکیمانہ اور شرعی فریضہ بن جاتا ہے۔ تقیہ محض جان بچانے کا ایک اضطراری عمل نہیں، بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں یہ ایک تدبیری ہتھیار، ایک سیاسی بصیرت اور حکمتِ عملی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جب اہل باطل کے مقابلے میں کسی مؤمن کی جان، ایمان، جماعت یا تحریک کو خطرہ لاحق ہو، یا اگر کسی فوری اقدام سے پوری تحریک یا ملت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو وہاں شعوری تقیہ ایک شرعی فریضے میں بدل جاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں جذباتی اقدام یا فوری قتال بعض اوقات نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، خصوصاً جب مخاطب افراد غیر سنجیدہ، کم فہم، یا جذبات کے تابع ہوں۔ ایسے افراد کو حکمت و موعظہ حسنہ کے ذریعے، محبت و تالیفِ قلوب کی بنیاد پر فکری سطح پر تیار کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ ایک حقیقی اور باہوش ملت کے فرد بن کر حق کا ساتھ دینے کے قابل ہو جائیں۔ امر بالمعروف اور نہی عنہ المنکر اسی جہادِ تبیین اور فکری و شعوری تربیت کا نام ہے۔ لہذا اگر کسی نادان کو حقیقت کا شعور دیے بغیر اس کے سامنے پوری شدت سے حق کا پرچم بلند کیا جائے تو وہ بجائے سمجھنے کے، مخالفت پر اتر آتا ہے، اور نتیجتاً خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی حق سے دور لے جاتا ہے۔ اس صورت میں تقیہ، سختی و قتال کو مؤخر کرنے کا نام ہے، نہ کہ حق سے پیچھے ہٹنے کا۔ بلکہ یہ حق کے تحفظ اور تدریجی غلبے کی حکمتِ عملی ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی حیاتِ طیبہ ہمیں یہی سکھاتی ہے۔ امام حسن مجتبیٰؑ کا صلح کرنا، امام سجادؑ کا ظاہری خاموشی اختیار کرنا، امام جعفر صادقؑ کا علمی محاذ پر کام کرنا اور اپنے ماننے والوں کو بعض مقامات پر اپنے شیعہ ہونے کے اعلان سے روکنا، سب اسی شعوری تقیہ کی عملی شکلیں تھیں۔ ان تمام مواقع پر ائمہؑ کا ہدف واضح تھا: دین، ولایت اور حق کے سیاسی و فکری نظام کو باقی رکھنا، اور آنے والے وقت کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرنا۔ یہ تقیہ مایوسی نہیں بلکہ امید کی حکمت ہے، ایک ایسی بصیرت جو وقتی پسپائی کو مستقل ہزیمت میں بدلنے سے بچاتی ہے، اور دین کی اصل روح کو محفوظ رکھتی ہے تا کہ جب زمین ہموار ہو، تو حق پوری قوت سے ابھر کر دنیا پر غالب آ جائے۔

یہی اصول ہمیں آج بھی درکار ہے، جہاں دشمن طاقتور اور چالاک ہے، اور ہمارے عوام میں فکری پختگی کا فقدان ہے۔ یہاں ہر فکری و سیاسی اقدام میں تقیہ، حکمت، اور مقصد کی وضاحت لازم ہے۔ جہاد، قتال، اور سخت موقف جب مؤخر کیے جاتے ہیں تو یہ بزدلی نہیں بلکہ ایک دور اندیشی ہے، جو ملت کو تباہی سے بچا کر فتح کے قابل بناتی ہے۔ اس لیے شعوری تقیہ نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتا ہے تا کہ دین کے عظیم تر مفاد، ائمہؑ کے مشن، اور ظہورِ امام زمانہؑ کے لیے زمین ہموار کی جا سکے۔

اعلی مقاصد کے حصول میں تقیہ کی اہمیت

جب ہم شیعہ اور اہل سنت مسلمانوں کو ناصبیت، شرک، اور کفر کے مقابلے میں جذباتی ہو کر "جہاد"، "قتال"، اور "سر تن سے جدا" جیسے نعرے لگاتے دیکھتے ہیں، تو یہ رویہ ایک خاص نفسیاتی، تاریخی، اور سیاسی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت رکھتا ہے۔ ایسی جذباتی رد عمل کی جڑیں اکثر ان ادوار میں پیوست ہوتی ہیں جب مسلمانوں، بالخصوص اہل حق، کو سیاسی طاقت سے محروم رکھا گیا، جب وہ سماجی اور حکومتی اداروں سے الگ یا باہر کر دیے گئے، یا جب انہیں اپنے عقائد کی کھلی آزادی نہیں دی گئی۔ اس محرومی کے پس منظر میں ان کے جذبات میں جوش، غصہ اور انتقام کا رنگ شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بات چیت، حکمت، اور تدریج کی بجائے فوری ٹکراؤ کو راہ نجات سمجھنے لگتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی قوم یا گروہ مسلسل ظلم، تحقیر، اور عدمِ تحفظ کا شکار ہوتا ہے تو اس کی اجتماعی نفسیات میں دفاعی شدت پسندی پیدا ہوتی ہے، اور وہ اپنے عقیدے کے تحفظ کو خالصتا قتال یا تیز زبان و عمل کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر ان جذباتی نعروں کے پیچھے اکثر وہ سیاسی و فکری کمزوری چھپی ہوتی ہے جسے تقیہ، حکمت، اور بیداری کی حکمت عملی سے نہیں سنوارا گیا، بلکہ اسے محض رد عمل کی شکل میں باہر آنے دیا گیا۔

اہل بیت علیہم السلام اور انبیاء علیہم السلام کی سیرت اس کے برعکس ایک نکتہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے: ظلم کے دور میں تقیہ، صبر، اور تدریجی اصلاح، اور فتح کے بعد قوت، وقار، اور واضح موقف کے ساتھ کھل کر جینا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دورِ فرعون، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رومی سلطنت کے خلاف خاموش موقف، اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکہ میں تیرہ سالہ صبر اور خاموش تربیت—یہ سب ہمیں بتاتے ہیں کہ کمزوری کے دور میں خاموشی بزدلی نہیں بلکہ بصیرت ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں ظلم و ستم سہہ کر اپنی جماعت کی فکری بنیاد رکھی، اور جب مدینہ میں حکومت ملی تو بدر، احد، خندق، اور فتح مکہ جیسے اقدامات سے ظالموں کے خلاف کھل کر میدان میں آئے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے خلافت کے حق سے محرومی کے وقت نہ صرف صبر اختیار کیا بلکہ فتنوں سے امت کو بچانے کے لیے خاموشی اختیار کی، یہاں تک کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شہادت کے بعد بھی انہوں نے صرف اس وقت تلوار اٹھائی جب امت کی اجتماعی بقاء کا تقاضا ہوا۔

امام حسن علیہ السلام کی صلح کا فیصلہ ہو یا امام سجاد علیہ السلام کی خاموش، پر بصیرت زندگی، یا امام باقر و امام جعفر صادق علیہما السلام کا علمی جہاد، یہ سب اسی اصول پر استوار ہیں کہ طاقت نہ ہونے کے دور میں شعور پیدا کرنا اور دین کی جڑوں کو مضبوط کرنا اصل جہاد ہے۔ اور جب طاقت ملے، تب کھل کر عزت کے ساتھ دین کی سربلندی کے لیے جینا چاہیے، جیسا کہ امام علی علیہ السلام نے اپنے دور خلافت میں عدل و انصاف کی بنیاد پر حکومت کی، امام حسین علیہ

السلام نے کربلا میں باطل کو بے نقاب کر کے دین کو نیا حیات بخشی، اور امام مہدی عج اللہ فرجہ کے ظہور کے بعد وہی حق کھل کر دنیا پر غالب آئے گا۔

اسی حکمت عملی کے تحت جب اہل حق موجودہ دنیا میں کمزور ہوں، تو ان کے لیے حکمت، تدبیر، بیداری، اور علمی جدوجہد ضروری ہے، نہ کہ صرف جذباتی ردعمل۔ کیونکہ جو جنگ ذہنوں کو فتح کرے، وہی پائیدار ہوتی ہے۔ فتح کے بعد ہی معاشرہ ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جہاں اہل حق نہ صرف اپنے عقائد کے ساتھ جیتے ہیں بلکہ دنیا کے لیے نمونہ بھی بنتے ہیں۔ امام زمانہ عج کے ظہور کے بعد کا معاشرہ ایسا ہی ہو گا، جہاں عدل، علم، اور تقویٰ کی حکومت ہو گی، اور اہل بیت علیہم السلام کے ماننے والے نہ صرف آزاد ہوں گے بلکہ دنیا کو ہدایت کی روشنی دیں گے۔

تقیہ کا مفہوم صرف خطرے کے وقت جان بچانے کا ایک دفاعی عمل نہیں، بلکہ قرآن کی روشنی اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں یہ ایک جامع اور سیاسی حکمت عملی کے طور پر بھی سامنے آتا ہے، جو نہ صرف دین کے تحفظ کا ذریعہ ہے بلکہ ولایتِ معصومین علیہم السلام کے حق کو باقی رکھنے اور امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور کی تمہید فراہم کرنے کا ایک لازمی جزو ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: "إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ" (النحل:106) یعنی جو شخص مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، اس پر گرفت نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ" (البقرہ:

173) کہ جو شخص اضطرار کی حالت میں ہو، یعنی مجبوری میں حرام چیز کھائے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ان آیات کی ظاہری تفسیر جسمانی بقاء کے لیے رخصت سے متعلق ہے، لیکن جب ہم ان آیات کو سیرتِ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں باطنی و دینی بقاء کی حفاظت بھی مراد ہے۔

مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ مشہور حدیث ہے: "التقية ديني و دين آبائي، لا دين لمن لا تقية له" (تہذیب الأحکام) یعنی تقیہ میرا اور میرے آباؤاجداد کا دین ہے، جس کے پاس تقیہ نہیں، اس کا کوئی دین نہیں۔ یہ قول تقیہ کو صرف وقتی دفاعی عمل نہیں بلکہ دین کا ستون قرار دیتا ہے۔ امام علیہ السلام نے جس زمانے میں یہ فرمایا، وہ ایک ایسا عہد تھا جب شیعہ عقائد، فقہ، اور سیاسی تشخص کو اموی اور عباسی حکمرانوں کے سرکاری جبر کے تحت مٹانے کی کوشش ہو رہی تھی۔

اموی حکمرانوں مروان, ابنِ زیاد وغیرہ اور عباسی سرکاروں ہارون الرشید، اور منصور دوانیقی وغیرہ جیسے حکمرانوں کے ادوار میں امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خاموشی یا ظاہری عدم مزاحمت تقیہ کا ایک سیاسی اور بیدار حکمت آمیز انداز تھا۔ اگر وہ بظاہر مخالفت کرتے تو امام کو قتل کر دیا جاتا اور ان کے شاگردوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا۔ مگر اس تقیہ کے نتیجے میں ایک طرف شیعہ تشخص محفوظ رہا، اور دوسری طرف اہل بیت کے علمی خزانوں کی اشاعت ہوئی جس کی بنا پر امامیہ فقہ کی بنیاد رکھی گئی۔

اسی طرح امام حسن علیہ السلام کا معاویہ سے صلح کرنا بظاہر تقیہ کا ایک عمل تھا، لیکن حقیقت میں اس کے پیچھے ایک بلند سیاسی مقصد تھا: مسلمانوں کو داخلی جنگ سے بچانا، امیر المومنین

علیہ السلام کے ماننے والوں کو قتلِ عام سے بچانا، اور آنے والے وقت کے لیے اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت کا تاریخی ریکارڈ محفوظ رکھنا۔

یہی طرزِ عمل ہمیں امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور میں بھی نظر آتا ہے۔ عباسی خلافت کے انتہائی سخت حالات میں ان آئمہ نے بظاہر دربار سے قربت دکھائی لیکن درحقیقت وہ اپنی جماعت کو چھپ کر منظم کر رہے تھے، اور امام مہدی علیہ السلام کے غیبت کے دور کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔

تقیہ کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر انسان ایک چھوٹا باطل قبول کر کے کسی بڑے باطل کو روک سکتا ہو، یا اپنے دین، اپنی قوم، یا قیادت کی حفاظت کر سکتا ہو، تو وہ تقیہ نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی مومن ظالم حکومت کے سامنے کلمہ توحید کے انکار کی ظاہری بات کہہ دے تاکہ وہ زندہ رہ کر اپنے اہلِ خانہ اور جماعت کے لیے فائدہ پہنچا سکے، تو وہ تقیہ اس کے ایمان کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی بصیرت اور شجاعت کی دلیل ہے۔

تقیہ کی اسی نوعیت کو اگر ہم آج کے دور میں دیکھیں، جہاں بعض اوقات اہلِ حق کو کسی بڑی تحریک یا مقصد کے لیے وقتی طور پر حالات کے ساتھ مطابقت کرنی پڑتی ہے، تو یہ بھی تقیہ کے اصول کے تحت آتا ہے۔ مثلاً کوئی مصلح اپنی فکر کو کسی بڑے نظام کے خلاف کھل کر ظاہر نہیں کرتا تاکہ وہ دب نہ جائے بلکہ دھیرے دھیرے بیداری پیدا کرے، تو یہ بھی وہی سیاسی تقیہ ہے جو اماموں کی سنت ہے۔

پس تقیہ فقط جان بچانے کا عمل نہیں، بلکہ ایک وسیع المعنٰی الٰہی حکمت ہے جس کے ذریعے اہلِ حق اپنی بقاء، اپنے دین، اور قیادت کی حفاظت کرتے ہوئے آنے والے وقت کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔ یہ ظاہری کمزوری نہیں بلکہ باطنی بصیرت کا اظہار ہے۔

الحادی یا نیم الحادی بیماریاں اور ان کا علاج

انسانی شخصیت ایک پیچیدہ ساخت ہے جس میں شعوری، لاشعوری، اور تحت الشعور کی مختلف تہیں مل کر انسان کے طرز عمل، رجحانات، اور رویوں کو تشکیل دیتی ہیں۔ جب ہم ایسے افراد کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہر وقت اختلاف، تنقید، اور بالخصوص مذہب یا مذہبی طبقات کے بارے میں کیڑے نکالنے کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں تو اس طرزِ عمل کو محض علمی اختلاف یا تنقیدی ذوق قرار دینا سطحی سوچ ہو گی۔ درحقیقت یہ ایک گہرا نفسیاتی عمل ہوتا ہے جس کی جڑیں فرد کے ماضی کے تجربات، جذباتی زخموں، اور خودی (ego) کے مخصوص ارتقائی مراحل میں پیوست ہوتی ہیں۔

علمِ نفسیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو تنقید کے اس مسلسل رجحان کا ایک سبب "احساسِ محرومی" ہوتا ہے، جو مختلف صورتوں میں انسان کے لاشعور میں بیٹھ جاتا ہے۔ مثلاً بچپن میں والدین، اساتذہ، یا معاشرے سے مطلوبہ محبت، اعتماد، یا توجہ نہ ملنے کی صورت میں ایک محرومی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیفیت بعض اوقات براہ راست نظر نہیں آتی، بلکہ مختلف رویوں کی شکل میں ابھرتی ہے جن میں دوسروں پر نکتہ چینی، تضحیک، یا خود کو برتر ظاہر کرنا شامل ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان دراصل اپنی داخلی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ وہ کسی زمانے میں رد یا نظر انداز کیا گیا تھا۔

ایک اور اہم پہلو "احساسِ برتری" کا نفسیاتی فریب ہے۔ وہ فرد جو مسلسل یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُسے دوسروں کی باتوں میں غلطیاں نظر آتی ہیں، اور خاص طور پر مذہب یا مذہبی شخصیات کی معمولی لغزشوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، وہ اکثر اندرونی طور پر اس احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے کہ وہ خود کبھی کسی خاص مقام یا قبولیت کو حاصل نہ کر سکا۔ اس احساسِ ناکامی کو وہ یوں "ری ڈائریکٹ" کرتا ہے کہ دوسروں کی کامیابی، مقبولیت، یا روحانی مقام کو چیلنج کرے، تاکہ وہ خود کو لاشعوری طور پر برابر یا برتر محسوس کر سکے۔ یہ عمل "نفسیاتی دفاعی نظام (defense mechanism) "کی ایک شکل ہے جسے "reaction formation" یا "projection" کہا جاتا ہے، جہاں فرد اپنے اندر کی کمزوری کو دوسروں پر منتقل کر کے خود کو محفوظ محسوس کرتا ہے۔

اس تنقیدی مزاج کا ایک تعلق "نرگسیت (narcissism) "سے بھی ہوتا ہے۔ نرگسیت کے حامل افراد کی ایک عمومی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی خامیوں کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ خود کو ایک کامل ہستی سمجھتے ہیں۔ اس کامل ہونے کے زعم میں وہ دوسروں کی ہر رائے، شخصیت یا طرز عمل میں کمزوری تلاش کرتے ہیں تاکہ انہیں یہ یقین دلایا جا سکے کہ وہی سب سے زیادہ باشعور، باعلم اور معقول ہیں۔ اس طرزِ عمل کی جڑیں اکثر شدید عدم تحفظ اور ماضی کے رد کیے جانے کے تجربات میں چھپی ہوتی ہیں۔

اس رجحان کا خاص پہلو یہ ہے کہ مذہب یا مذہبی طبقات ان افراد کے لیے آسان ہدف ہوتے ہیں کیونکہ ایک طرف یہ طبقات معاشرتی لحاظ سے نمایاں ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان سے وابستہ عقائد کو چیلنج کر کے فرد اپنی "علمی برتری" کا مظاہرہ کرنے کا موقع

محسوس کرتا ہے۔ وہ مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات کو "سوال" کے پردے میں چھپا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ ان سوالات کے پیچھے تجسس سے زیادہ تعصب، انا اور نفسیاتی کشمکش کارفرما ہوتی ہے۔ ایسا فرد اکثر مذہب کے ان پہلوؤں کو نشانہ بناتا ہے جو معاشرتی طور پر جذباتی اہمیت رکھتے ہیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کی جا سکے۔

اس صورتحال کا ایک دوسرا رخ بھی قابل توجہ ہے کہ ایسے افراد اگر علمی یا سماجی طور پر کسی قابلِ ذکر مقام پر نہ پہنچ سکیں تو ان کے اندر ایک مسلسل بے چینی جنم لیتی ہے۔ یہ بے چینی انہیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسروں کے نظریات، کام، یا مقبولیت کو کم تر ثابت کریں، تاکہ وہ اپنی ناکامیوں کی تلخی کو دوسروں کے زوال سے میٹھا کر سکیں۔ چنانچہ ان کی تنقید دراصل ایک "نفسیاتی انتقام" بن جاتی ہے جو وہ ان لوگوں سے لیتے ہیں جو شعور، دین داری یا سماجی اثر و رسوخ کے لحاظ سے ان سے آگے نکل چکے ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایسے تنقیدی رویوں کا سامنا کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم صرف الفاظ اور دلائل کی سطح پر جواب نہ دیں، بلکہ ان کی نفسیاتی بنیادوں کو بھی سمجھیں۔ معاشرے کو ایسے افراد کی فکری تربیت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی معاونت کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی ماضی کی الجھنوں اور انا کی دیواروں سے باہر آکر ایک متوازن، بامقصد اور مثبت مکالمے کا حصہ بن سکیں۔ علم، شعور، اور تنقید یقیناً اہم چیزیں ہیں، مگر جب وہ نفسیاتی الجھنوں کے تابع ہو جائیں تو وہ اصلاح کے بجائے فساد کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں نہ صرف ان رویوں کو سمجھنا ہے بلکہ اس شعور کو بھی عام کرنا ہے کہ اختلاف رائے اور فکری آزادی کا مطلب تنقید

برائے تنقید نہیں، بلکہ ایک تعمیری، مخلص اور علمی راستہ ہے جو باطن کی صفائی اور ظاہر کی سچائی سے مشروط ہوتا ہے۔

ملحد، سیکیولر، لبرل، اور مارکسی و سوشلسٹ مکتب فکر کے حامل افراد کی ذہنی ساخت (mindset) کا مطالعہ اگر صرف علمی و فکری سطح پر کیا جائے تو ان کی آراء، نظریات، اور طرزِ استدلال مختلف زاویوں سے واضح ہوتے ہیں۔ تاہم جب ہم ان مائنڈ سیٹس کو علمِ نفسیات کی روشنی میں جانچتے ہیں تو یہ محض فلسفیانہ یا سیاسی نظریات کی تشکیل نہیں بلکہ داخلی نفسیاتی کیفیات، جذباتی محرکات، اور شخصی تجربات کی گہری پرچھائیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انسان جب کسی نظریے کو اپناتا ہے تو بسا اوقات اس کا محرک صرف عقلی تجزیہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے نفسیاتی دفاعی نظام، سماجی تجربات، اور باطنی اضطراب کا عمل دخل ہوتا ہے۔

ملحد (atheist) شخص عمومی طور پر خدا، وحی، یا ماوراء فطرت حقائق کے انکار کی طرف اس وقت مائل ہوتا ہے جب یا تو وہ مذہب کے کسی جبر، تضاد، یا شخصیت پرستی کا تجربہ کر چکا ہوتا ہے یا پھر وہ ایسا ذہن رکھتا ہے جو صرف حسیات و مشاہدات پر ایمان رکھتا ہے۔ علمِ نفسیات کے مطابق بعض اوقات خدا کے انکار کا پس منظر بچپن کے دور میں والد یا دیگر مقتدر شخصیات سے منسلک تکلیف دہ یادیں بھی ہو سکتی ہیں۔ چونکہ مذہبی نظام میں اکثر خدا کو ایک باپ جیسا مقتدر، سزا دینے والا، اور نگرانی کرنے والا تصور دیا جاتا ہے، اس لیے بعض افراد لاشعوری طور پر اس خدا سے بھی ویسی ہی بغاوت کرتے ہیں جیسی وہ بچپن میں والد یا کسی سخت گیر اتھارٹی سے کرتے تھے۔ بعض کیسز میں "مسخ شدہ مذہبی نمائندوں" کے رویے

سے پیدا ہونے والی نفرت بھی فرد کو مذہب کے کلی انکار تک لے جاتی ہے، اور وہ اسے "آزادیِ فکر" کا نام دے کر پیش کرتا ہے تاکہ وہ داخلی بغاوت کو علمی لباس پہنا سکے۔

سیکیولر ذہنیت کا تجزیہ بتاتا ہے کہ اس کے حامل افراد مذہب کو نجی دائرے میں محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مذہب کو سماجی نظم یا سیاسی فیصلوں میں شامل کرنا گویا خطرے کی علامت ہے۔ اس کی نفسیاتی جڑ بعض اوقات "سماجی خوف (social anxiety)" اور "نظم پر کنٹرول کے وسوسے" سے جڑی ہوتی ہے۔ یہ افراد مذہب کو کنٹرول، اخلاقی پابندی یا سوشیئل کنسٹرینٹ (social constraint) کے طور پر دیکھتے ہیں اور چونکہ ان کی نفسیاتی ساخت میں "خود ارادیت" اور انفرادی آزادی ایک اہم قدر بن چکی ہوتی ہے، اس لیے مذہب کی کوئی بھی اجتماعی یا اخلاقی روایت انہیں قید محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ مذہب کے اثرات سے آزاد ہونا چاہتے ہیں تاکہ وہ کسی بیرونی اتھارٹی کے بغیر اپنی شناخت، فیصلوں، اور زندگی کو "خود" تشکیل دے سکیں۔ مگر درحقیقت یہ اکثر ایک "خود ساختہ اتھارٹی" کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں انفرادی خود پرستی اجتماعی خیر پر غالب آجاتی ہے۔

لبرل ازم کو اگر محض سیاسی یا سماجی اصولوں تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اس کے نفسیاتی اثرات کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس ذہنیت میں فرد مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ لبرل سوچ رکھنے والے افراد اکثر مذہب، روایت، اور خاندان جیسی اجتماعی اکائیوں سے ایک داخلی بیزاری رکھتے ہیں۔ علمِ نفسیات کی زبان میں یہ رجحان "خود محوریت (ego-centrism)" اور "وجودی بے چینی (existential anxiety)" سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ

فرد جو زندگی میں کسی ایک مستحکم مرکز کو تسلیم نہ کر سکا ہو یا جس نے اپنے اندر تضادات کا شکار ہوتے ہوئے زندگی گزاری ہو، وہ ان تمام نظریات کی جانب مائل ہوتا ہے جو اسے "اختیار" اور "انکار" کا اختیار دیتے ہوں۔ لبرل طرزِ فکر دراصل فرد کو ہر قسم کی بیرونی ذمہ داری یا اعلیٰ اتھارٹی سے آزاد کر کے خود کو "خالقِ اقدار" سمجھنے کی اجازت دیتا ہے، جو اکثر نفسیاتی طور پر ایک فریبِ خودی ہوتا ہے۔

مارکسی و سوشلسٹ سوچ کی بنیاد اگرچہ مادی مساوات اور طبقاتی جدوجہد پر ہے، لیکن اس کی نفسیاتی جڑیں "اجتماعی احساسِ محرومی" اور "تاریخی انتقام" کی کیفیت سے جڑی ہوتی ہیں۔ مارکسی مزاج رکھنے والے اکثر افراد کا داخلی تجربہ کسی نہ کسی ناانصافی، محرومی، یا طبقاتی امتیاز سے گزرا ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت انہیں ایک ایسی فکر کی طرف کھینچتی ہے جو "طاقتوروں" کو گرا کر "کمزوروں" کو اٹھانے کا نعرہ دیتی ہو۔ مگر اس طرز فکر میں بھی بعض اوقات اتنا ہی شدید انتقام، احساسِ کمتری، اور طاقت حاصل کرنے کی خواہش چھپی ہوتی ہے جتنی کہ سرمایہ داروں یا طاقتوروں میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسی انقلابات اکثر ایک نئے جبر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ نفسیاتی طور پر جبر کے خلاف نکلنے والے افراد خود بھی داخلی طور پر جبر کی بغاوت میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

ان تمام ذہنیتوں میں ایک مشترک پہلو یہ ہوتا ہے کہ ان کا فرد خدا، وحی، یا مذہب سے براہ راست ٹکر نہیں لیتا بلکہ اس کی نمائندہ شخصیات، اداروں، یا روایات سے نفسیاتی سطح پر نالاں ہوتا ہے۔ وہ جو مذہب سے بحث کرتا ہے، اکثر درحقیقت اپنے ماضی کے کسی زخم، رد کیے جانے کے تجربے، یا خودی کے کچلے جانے کے ردِ عمل میں مذہب کی مخالفت کرتا ہے۔ اور

چونکہ یہ مخالفت داخلی محرک سے جنم لیتی ہے، اس لیے اسے محض علمی استدلال سے نہیں سمجھا جاسکتا، جب تک کہ اس کے لاشعوری پس منظر کو نہ کھولا جائے۔

لہٰذا ان مائنڈ سیٹس کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی عقلی بنیادوں کے ساتھ ساتھ ان کے نفسیاتی اسباب اور جذباتی تاریخ کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم علمی سطح پر اختلاف کو تسلیم کرتے ہوئے، ان ذہنیتوں کی اصل محرکات کو سمجھیں، اور ان کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے جذباتی زخموں، خوف، اور نفسیاتی دفاعی دیواروں کو بھی مد نظر رکھیں، تاکہ محض عقلی مناظرے کے بجائے ایک حقیقی انسانی گفتگو ممکن ہو سکے، جو دلوں کو بدلنے کا ذریعہ بن سکے۔

اسلامی نفسیات کے تناظر میں اگر ہم ان افراد کا تجزیہ کریں جو ملحد، سیکیولر، لبرل، یا مارکسی و سوشلسٹ مائنڈ سیٹ کے حامل ہوتے ہیں، تو ہمیں سب سے پہلے یہ سمجھنا ہو گا کہ اسلام انسان کو ایک جامع مخلوق مانتا ہے جس میں عقل، نفس، روح اور قلب کا باہم تعلق اسے کسی بھی نظریے یا عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن اور احادیثِ معصومینؑ کی روشنی میں انسان کی فطرت بنیادی طور پر خدا شناس ہے۔ ﴿فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا﴾ (الروم:30) کے مطابق ہر انسان کی اصل فطرت توحید اور خدا پرستی ہے۔ جب انسان اس فطری شعور سے ہٹتا ہے تو اس کے پیچھے نفسیاتی امراض، خواہشاتِ نفس، یا دنیاوی وابستگیاں کارفرما ہوتی ہیں، نہ کہ محض علمی یا فلسفیانہ دلائل۔

اسلامی نفسیات بتاتی ہے کہ جب انسان "نفسِ امارہ" کے تسلط میں آجاتا ہے تو وہ خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے۔ ایسے افراد جنہوں نے مذہب یا خدا سے انکار کا

راستہ اختیار کیا ہوتا ہے، وہ اکثر یا تو شدید خواہشات کی غلامی میں جکڑے ہوتے ہیں، یا پھر انہوں نے مذہب کے نام پر ہونے والی کسی زیادتی، منافقت یا شخصی مفادات سے نفرت میں سارا مذہبی نظام رد کر دیا ہوتا ہے۔ یہ رد عمل دراصل ایک اندرونی "باطنی خفگی (inner resentment)" اور قلبی زخم کی علامت ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ﴿سَیَصِیبُ الَّذِینَ أَجۡرَمُوا صَغَارٌ عِندَ اللهِ وَعَذَابٌ شَدِیدٌ بِمَا كَانُوا یَمۡكُرُونَ﴾ (الأنعام:124)۔ یعنی جو مکر و فریب سے دینِ حق سے روگردانی کرتے ہیں، ان پر ذلت وعذاب نازل ہوتا ہے۔

لبرل یا سیکیولر شخص جب مذہب کو نجی دائرے تک محدود کرنے کی بات کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنے نفس کی آزادی کے سائے میں جینا چاہتا ہے۔ اسلامی نفسیات کے مطابق ایسے فرد کے دل میں "حبِ دنیا"، "عجب"، اور "کبر" جیسی باطنی بیماریاں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ وہ دین کو اس لیے قبول نہیں کرتا کیونکہ دین اس کی خواہشات کو لگام دیتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "الھوی شریک العمی" یعنی "خواہش نفس بصیرت کا شریک دشمن ہے"۔ جب انسان علم کے بجائے خواہشات کے تحت سوچتا ہے تو وہ صرف انہی دلائل کو مانتا ہے جو اس کے نفس کو خوش رکھیں، اور ہر اس حقیقت کا انکار کرتا ہے جو اس کی انا کے خلاف ہو۔

مارکسی یا سوشلسٹ مائنڈ سیٹ میں اکثر "انتقام" اور "احساسِ محرومی" بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر طبقاتی عدل کی بات کرتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کے نفس میں موجود "کینہ"، "حسد"، اور "حبِ اقتدار" انہیں اس سوچ کی طرف لے جاتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "الحسد یأکل الإیمان کما تأکل النار الحطب" یعنی "حسد ایمان کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو"۔ یہ نفسیاتی کیفیت فرد کو ایک ایسی تحریک میں دھکیل

دیتی ہے جہاں ظاہری طور پر تو عدل اور مساوات کا دعویٰ ہوتا ہے، مگر باطنی طور پر اقتدار، قوت اور برتری کی لالچ ہوتی ہے۔

ملحد ذہنیت رکھنے والا شخص اکثر دین کا انکار صرف اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ خدا کو اس زندگی میں جواب دہی کی علامت سمجھتا ہے۔ اسلامی نفسیات کے مطابق یہ "فرار از مسئولیت" یعنی ذمہ داری سے فرار کا مظہر ہے۔ وہ شخص جو اللہ کے وجود کا انکار کرتا ہے، درحقیقت وہ اپنے نفس کی عدالت میں مقدمہ ہار چکا ہوتا ہے اور اب کسی اعلیٰ عدالت کے وجود کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے: ﴿بَلۡ يُرِيدُ ٱلۡإِنسَـٰنُ لِيَفۡجُرَ أَمَامَهُۥ﴾ (القیامۃ:5) یعنی "بلکہ انسان چاہتا ہے کہ وہ ہر حد کو پھلانگ دے"۔

اسلامی نفسیات ان تمام ذہنیتوں کے پیچھے "امراضِ قلب"، "ضعفِ بصیرت"، اور "حجابِ نفس" کو بنیادی وجوہات مانتی ہے۔ یہ لوگ دین سے نہیں بھاگ رہے ہوتے بلکہ اپنے اندر کی سچائی سے، اپنی فطرت سے، اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کو صرف عقلی مناظرے سے نہیں، بلکہ روحانی و اخلاقی تزکیہ، نرمی، اور قلبی تربیت کے ذریعے راہ پر لایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ایسے ذہنیت کے حامل افراد بدلیں تو سب سے پہلے ہمیں ان کے زخموں کو سمجھنا، ان کی نفسیاتی پرتوں کو کھولنا، اور ان کے قلبی حجاب کو ہٹانے کی کوشش کرنا ہوگی، تاکہ ان کے اندر چھپی فطری خدا پرستی پھر سے بیدار ہو جائے۔ اس راہ میں دعا، محبت، اور حکمت کے ساتھ ان کے باطن میں اترنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اسلام میں دل بدلنے کا کام سب سے پہلے اخلاق، پھر حکمت، اور آخر میں دلیل سے کیا جاتا ہے۔

ان ذہنی و روحانی بیماریوں کا علاج اسلامی نفسیات کی روشنی میں کیا جائے تو سب سے پہلے ہمیں اس بات کو سمجھنا ہو گا کہ ان افراد کے ساتھ معاملہ صرف فکری یا نظریاتی سطح پر نہیں ہے بلکہ یہ ایک عمیق روحانی اور نفسیاتی بحران ہے۔ ان کی اصلاح کا پہلا مرحلہ "توجہ" یعنی ان کی توجہ خود ان کی باطنی کیفیت کی طرف مبذول کروانا ہے۔ یہ مرحلہ صرف تنقید یا مناظرہ سے نہیں آتا بلکہ محبت، فہم، شفقت، اور حسنِ اخلاق کے ذریعے ان کے دل کو نرمی سے چھونا پڑتا ہے تا کہ ان کے اندر وہ خاموش فطری آواز جاگے جو برسوں سے خواہشات، دنیاوی مفادات، یا احساسِ کمتری کے شور میں دب چکی ہوتی ہے۔ قرآن مجید اسی لیے کہتا ہے: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ﴾ یعنی "اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم دل ہو گئے" (آل عمران: 159)۔ اگر نبی اکرمؐ جیسی معصوم ہستی کو لوگوں کے دل جیتنے کے لیے نرمی، حلم، اور شفقت کا رویہ اپنانا پڑا تو ہم جیسے افراد کے لیے یہ اولین شرط ہے۔

دوسرا مرحلہ "تزکیہ" کا ہے۔ قرآن نے نبی کی بنیادی ذمہ داریوں میں سب سے پہلی چیز یہی رکھی ہے: ﴿يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ یعنی "ان کے نفسوں کا تزکیہ کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے" (الجمعہ: 2)۔ تزکیہ یعنی نفس کو پاک کرنا، خواہشات کو اعتدال میں لانا، تکبر، حسد، حرص، کینہ اور خود نمائی جیسے باطنی امراض کا علاج کرنا ہے۔ ان افراد کو ایسے ماحول اور صحبت میں لایا جائے جہاں انہیں نفس پر قابو پانے کی تربیت، صبر و شکر کی عملی مشق، اور ذکر و فکر کا ذائقہ چکھایا جائے۔ انہیں امام علیؑ جیسے ہادیانِ ہدایت کی زندگی کا مطالعہ کروایا جائے تا کہ وہ دیکھ سکیں کہ علم، عمل، زہد، اور قربِ الٰہی کس طرح سے ایک انسان کو باعظمت بنا دیتا ہے۔ روحانی طور پر بیدار لوگ ان کے لیے نمونہ بن سکتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے: "کونوا دعاۃً للناس بغیر ألسنتکم" یعنی "لوگوں کو بغیر زبان کے (یعنی اپنے عمل سے) دین کی طرف بلاؤ"۔

تیسرا مرحلہ "معرفت" کا ہے۔ جب ان کے دل نرم ہوں اور ان کے نفس کسی حد تک پاکی کی طرف مائل ہوں، تو اب ان کے ساتھ معرفتی گفتگو کی جائے۔ اسلامی فلسفہ، کلام اور عرفان کی مدد سے ان کے سوالات اور اعتراضات کو حکیمانہ انداز میں حل کیا جائے۔ یہ کام صرف کتابی علم رکھنے والوں کا نہیں بلکہ ان افراد کا ہے جو خود روحانی سلوک کی راہ سے گزر چکے ہوں اور ان نفسیاتی تاریکیوں کی نوعیت کو سمجھتے ہوں۔ انہیں بتایا جائے کہ عقل کی تکمیل، قلب کی روشنی اور روح کی نجات صرف خدا کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے ممکن ہے۔ جب انسان اللہ کے سوا ہر چیز سے امید توڑتا ہے، تو وہ پھر اپنے اصلی مقام کی طرف لوٹتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت: 69) یعنی "جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم ضرور ان کے لیے اپنی راہیں کھول دیتے ہیں"۔

چوتھا اور سب سے اہم مرحلہ "صبر اور مسلسل دعا" کا ہے۔ یہ مریض قلوب کسی رات میں نہیں سدھرتے، نہ ہی ایک نشست میں پلٹتے ہیں۔ ان کے باطن پر کئی سالوں سے خواہشات، معاشرتی فریب، مغربی استعمار، اور سائنسی غرور نے پردے ڈال رکھے ہوتے ہیں۔ ان پردوں کو ہٹانے کے لیے مسلسل کوشش، ہمدردی، اور اخلاص درکار ہے۔ ان کے لیے دعا کی جائے، ان کی ہدایت کے لیے گریہ کیا جائے، جیسا کہ اہل بیتؑ نے ہمیں سکھایا کہ دشمنوں کے لیے بھی ہدایت کی دعا کرو۔ امام سجادؑ کی دعائے مکارم الاخلاق میں وہ جملہ

ہے: " اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ، وَأَلْبِسْنِي زِينَةَ الْمُتَّقِينَ فِي بَسْطِ الْعَدْلِ، وَكَظْمِ الْغَيْظِ، وَإِطْفَاءِ النَّائِرَةِ، وَضَمِّ أَهْلِ الْفُرْقَةِ"۔ یہی روحانی تربیت ہے جو ایک باطن سے غافل انسان کو دوبارہ اس کی فطرت سے جوڑ سکتی ہے۔

پس علاج کا راستہ نفس کے پردے ہٹانے سے شروع ہوتا ہے، دل کی نرمی سے جاری رہتا ہے، عقل و معرفت سے متوازن ہوتا ہے، اور دعا و روحانی قوت سے مکمل ہوتا ہے۔ یہی اسلامی نفسیات کا حقیقی خاکہ ہے، جو نہ صرف بیمار دلوں کا علاج کرتا ہے بلکہ ایک مردہ روح کو نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

دوغلے مسلمان

آج کی دنیا میں جب مغربی استعمار، بالخصوص امریکہ، اپنے صہیونی عزائم کے ذریعے مسلم دنیا کو سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی طور پر کمزور کرنے میں مصروف ہے، تو امتِ مسلمہ کی اکثریت اس حقیقت سے نظری طور پر تو آگاہ ہے، لیکن عملی طور پر وہ اس کے خلاف کسی سنجیدہ مزاحمت کی نہ طاقت رکھتی ہے اور نہ ہی ارادہ۔ اس پس منظر میں ایک خاص طبقہ وہ بھی ہے جو خود کو بظاہر امت کے مفادات کا خیر خواہ ظاہر کرتا ہے، صہیونیت اور امریکی بالادستی کی الفاظی مذمت کرتا ہے، مگر جب اس کے طرزِ زندگی، مفادات اور عملی رویے کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی حقیقی وابستگیاں صاف ظاہر ہو جاتی ہیں۔

یہ وہ افراد یا گروہ ہوتے ہیں جو برسوں سے امریکہ یا دیگر مغربی ممالک میں قیام پذیر ہیں، وہیں کی شہریت رکھتے ہیں، وہیں ان کے بچوں کی تعلیم، روزگار، صحت، معاشرتی سہولیات اور زندگی کے دیگر تمام امور وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں جب بھی عالمی سیاسی منظرنامے میں امریکہ کی کمزوری یا اس کے نظام کے زوال کی بات آتی ہے، تو ان کے اندر ایک اضطراب جنم لیتا ہے، جو اُن کے لاشعور سے شعور تک منتقل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ ان کے بیانات، تحریریں اور تقاریر امریکی پالیسیوں پر تنقید سے خالی نہیں ہوتیں، لیکن وہ کبھی بھی امریکی نظام کے حقیقی زوال کی دعا یا تمنا کرتے نظر نہیں آتے، کیونکہ اس زوال کا مطلب ان کے اپنے نظامِ زندگی کا زوال ہوتا ہے۔

ان کا یہ دوہرا رویہ نہ صرف فکری تضاد کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ان کی عملی بصیرت اور امت کے اجتماعی درد سے لاتعلقی کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ یہ طبقہ مسلم دنیا میں شعوری قیادت کی راہ میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے، کیونکہ وہ ایک ایسی پوزیشن پر ہوتا ہے جہاں وہ اپنی "معتدل" اور "مہذب" تنقید کے ذریعے عام مسلمانوں کو مزاحمت سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کسی بھی انقلابی آواز، جیسے کہ فلسطین، یمن، یا ایران کی مزاحمتی حکمت عملی، کو زیادہ سے زیادہ ایک وقتی جذبہ یا افراط قرار دینے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ صورت حال اس آیت کی عملی تفسیر بن جاتی ہے کہ "منافق وہ ہے جو دو کشتیوں کا سوار ہو"۔ ایسے لوگ امت کے ساتھ بھی وابستہ رہنا چاہتے ہیں اور استعمار کے نظام سے بھی اپنا تعلق نہیں توڑ سکتے۔ ان کا طرزِ فکر مسلم مزاحمت کے حق میں نہیں بلکہ اسے زائل کرنے کے لیے ملبّس الفاظ میں مغربی تسلط کو "حقیقتِ وقت" کے طور پر تسلیم کرنے پر اکساتا ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو امت کے اندر فکری کمزوری، عملی جمود، اور جدوجہد سے اجتناب کو فروغ دیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ امت اپنی غلامی کو تقدیر سمجھ کر قبول کرے، کیونکہ ان کے لیے اصل مقصد صرف "پرامن زندگی" ہے، چاہے وہ کسی کی غلامی میں ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک امت ایسے دوغلے رویوں کو پہچان کر ان سے بچنے کی تدبیر اختیار نہیں کرتی، تب تک وہ حقیقی آزادی اور سربلندی کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی۔ شعوری مزاحمت صرف دشمن کے خلاف نہیں، بلکہ اپنے اندر چھپے ہوئے ان نیم وفادار ذہنوں کے خلاف بھی ہونی چاہیے، جو امت کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے ان پر کاسمیٹک دعووں کی پٹّی باندھتے

ہیں۔ البتہ استثنیٰ ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور یہ ذہن میں رہے کہ پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہوتا ہے لہذا جو خود ایمان و کردار کی بلندی پر ہے اسے کوئی آنچ نہیں۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں، خواہ وہ مشرق ہو یا مغرب، مسلم ہو یا غیر مسلم، عوام ہوں یا حکومتیں، اکثر افراد اور ادارے سامراجی استعمار کے ساتھ اپنے کسی نہ کسی مفاد کی وجہ سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ وہ زبان سے تو استعمار کی مخالفت کا دم بھرتے ہیں، خاص طور پر ان مواقع پر جب ان کے ارد گرد افراد کا عمومی مزاج سامراج مخالف ہوتا ہے، لیکن جیسے ہی وہ کسی آزاد فضا یا ذاتی موقع پر ہوتے ہیں، ان کے اصل جذبات اور لاشعوری جھکاؤ آشکار ہونے لگتے ہیں۔ یہ افراد دراصل اس فکری، سیاسی، اور تہذیبی منافقت کی علامت ہیں جو ایک جانب امت کے ساتھ کھڑا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور دوسری طرف سامراجی مفادات کی حفاظت کو اپنی ذاتی بقا اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سوچ محض وقتی دباؤ اور ظاہری وابستگیوں تک محدود ہے، نہ ان کی وابستگی ایمانی ہے، نہ ان کی مخالفت میں کوئی فکری یا اخلاقی استقامت پائی جاتی ہے۔

امت مسلمہ کی تاریخ میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہے ہیں جو بظاہر کلمہ پڑھنے والے، نماز و روزہ رکھنے والے، بلکہ دینی گفتگو میں بھی ماہر ہوتے ہیں، لیکن جب بات مفادات اور عمل کی آتی ہے تو ان کا طرزِ عمل یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ فریب دہ اور ضرر رساں ہوتا ہے۔ ان کی ظاہری دینداری دراصل ایک نقاب ہوتی ہے جس کے پیچھے چھپا ہوا دل، ایمان کے بجائے دنیا کی محبت اور مادی منفعت کا پجاری ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اللہ کے دین کو محض دنیا کے چند فائدوں کے عوض بیچ دیا، اور ان کا ہر فیصلہ، ہر مؤقف اور ہر

خاموشی اسی مفاد کی چالوں کا عکس ہوتا ہے۔ یہ اپنے ایمان کو تجارت کی میز پر رکھ کر تولتے ہیں، اور جہاں دیکھتے ہیں کہ اسلام کی حمایت سے دنیاوی نقصان ہو سکتا ہے، وہاں یا تو خاموش ہو جاتے ہیں یا حق کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی کیفیت کو قرآن نے کئی مقامات پر یہودیوں کی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ خاص طور پر سورہ فاتحہ کی آخری آیت "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" میں دو طبقوں کی مذمت کی گئی ہے۔ "المغضوب علیہم" سے مراد وہ یہودی ہیں جنہیں علم تو حاصل تھا مگر انہوں نے دانستہ طور پر حق کو چھپایا، اور "الضالین" سے مراد وہ نصاریٰ ہیں جنہوں نے بغیر علم کے گمراہی کی راہ اختیار کی۔ مفسرین نے واضح کیا ہے کہ ان دونوں گروہوں کی صفات ہر دور کے ان افراد پر بھی منطبق ہوتی ہیں جو انہی راستوں پر چلتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ علم رکھتے ہیں، قرآن اور دین کو سمجھتے ہیں، مگر مادی منفعت کی خاطر، سماجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے تحت حق کو چھپاتے یا اس کے خلاف عمل کرتے ہیں، وہ عملاً انہی مغضوب علیہم میں شامل ہو جاتے ہیں۔

رسول اکرم (ص) کے زمانے میں بھی ایسے منافقین موجود تھے جو ظاہری طور پر اسلام کا دعویٰ کرتے تھے لیکن دل میں دشمنانِ دین کے ساتھ رابطے رکھتے، اور ان کے مفادات کو نقصان نہ پہنچانے کی پالیسی اپناتے۔ آج بھی ایسے لوگ مختلف شکلوں میں موجود ہیں جو دین کی بات تو کرتے ہیں، مگر جب اسلام دشمن قوتوں کے خلاف واضح مؤقف کی ضرورت ہوتی ہے تو یا تو خاموش ہو جاتے ہیں یا حق کو مشکوک بنا کر امت کے اذہان میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں قرآن سورہ بقرہ میں "يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللهِ ثَمَناً

قَلِیلًا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔

ان کا عمل صرف ذاتی گناہ نہیں بلکہ پوری امت کے لیے ایک فکری زہر ہے۔ یہ امت کے نوجوانوں کے اذہان کو الجھاتے ہیں، حق و باطل کے درمیان دھندلاہٹ پیدا کرتے ہیں، اور باطل کو معتدل چہرہ دے کر قابلِ قبول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لیے دین ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک فریم ورک ہوتا ہے جسے حالات کے مطابق موڑا توڑا جا سکتا ہے۔ ان کی زبان تو خدا کا نام لیتی ہے، مگر ان کے دل دنیا کے خداؤں سے جُڑے ہوتے ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے افراد کو پہچانا جائے، ان کی فکری چالاکیوں کو بے نقاب کیا جائے، اور امت کو اس بات کا شعور دیا جائے کہ صرف ظاہری اسلام کافی نہیں، بلکہ عمل، مؤقف، اور حق کے ساتھ استقامت ہی اصل معیارِ ایمان ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ منافق کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ حق کے لباس میں باطل کو چھپاتا ہے۔ ایسے افراد اگرچہ خود کو مسلمان کہتے ہیں، مگر ان کی فکری اور عملی ساخت عملاً یہودی ذہنیت سے قریب تر ہوتی ہے، کیونکہ یہود کی سب سے بڑی صفت یہی تھی کہ وہ دنیا کے بدلے دین کو فروخت کرتے تھے۔ سورہ فاتحہ کی یہ دعا محض تلاوت کے لیے نہیں، بلکہ ان رویوں سے بچنے اور ان کے خلاف فکری مزاحمت کی رہنمائی ہے۔

ایسے حالات میں شعوری مسلمانوں، فکری و دینی رہنماؤں، اور انقلابی فکر رکھنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس منافقانہ رویے کو صرف پہچانیں ہی نہیں بلکہ اس کی

جڑوں کو بھی بے نقاب کریں۔ اس کا حل جذباتی نعروں میں نہیں بلکہ فکری بیداری، شعوری تربیت، اور دینی بصیرت کی روشنی میں ایسے افراد کے لاشعور میں موجود غلامانہ نفسیات کو بے نقاب کرنے سے ممکن ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم ایسے افراد کے ساتھ علمی گفتگو کے دروازے بند نہ کریں بلکہ حکمت اور موعظت کے ساتھ انہیں آئینہ دکھائیں کہ ان کے طرز فکر سے امت کی اجتماعی تقدیر پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کے اندر موجود احساسِ تحفظ، جو استعمار سے وابستگی کی صورت میں پرورش پاتا ہے، اسے ایک فریبِ ذہن کے طور پر واضح کیا جائے کہ جو نظام کسی دن ان کے فائدے کا ضامن نظر آتا ہے، وہی کل ان کی عزت، آزادی اور ایمان کو نگل سکتا ہے۔

امت کے اندر مزاحمتی فکر کو عام کرنا، دینی و سیاسی شعور کو فروغ دینا، اور سامراج مخالف بیانیے کو علمی و ثقافتی سطح پر قوت بخشنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہمیں معاشی یا سوشیالوجیکل نکتہ نظر سے بھی یہ سمجھانا ہو گا کہ کسی سامراجی طاقت سے وابستہ ہونا وقتی فائدہ تو دے سکتا ہے مگر طویل المیعاد طور پر یہ وابستگی نہ صرف تہذیبی و فکری غلامی کا سبب بنتی ہے بلکہ انسان کو اس کی شخصیت اور خودی سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اپنی اصلاح اور خودسازی کی طرف رجوع کرنا ہو گا تاکہ ہم خود اپنے اندر وہ اخلاقی جرأت، بصیرت، اور آزادی پیدا کر سکیں جو نہ صرف اپنے نفس کے استعمار کے خلاف کھڑے ہونے کا حوصلہ دے بلکہ عالمی سامراج کے خلاف بھی ایک مؤثر اور باشعور صف بندی کی بنیاد رکھ سکے۔ یہ معرکہ صرف سیاسی یا عسکری نہیں، یہ دلوں اور

اذہان میں لڑی جانے والی جنگ ہے، جس میں کامیابی کا دارومدار سچائی کی فکری بنیادوں پر کھڑے ہونے، اور منافقت و مفاد پرستی کو ایمان کی روشنی سے بے نقاب کرنے پر ہے۔

خیانت کار میڈیا اور ہماری زمہ داریاں

صہیونی سامراجی میڈیا جیسے بی بی سی، سی این این، فاکس نیوز، الجزیرہ اور ان جیسے دیگر ادارے جدید اطلاعاتی جنگ (Information Warfare) کے اہم ہتھیار بن چکے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد رائے عامہ کو قابو میں رکھنا، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور اُن اقوام، تحریکوں اور حکومتوں کو بدنام کرنا ہوتا ہے جو امریکی و صہیونی مفادات کے خلاف مزاحمت کرتی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران اور اس کے زیرِ سرپرستی یا ہم آہنگ مقاومتی محاذ جیسے حزب اللہ، حماس، انصار اللہ اور عراقی حشد الشعبی کو بدنام کرنا ان کے مستقل ایجنڈے کا حصہ ہے۔

یہ میڈیا ادارے بظاہر آزاد صحافت کا لبادہ اوڑھ کر کام کرتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ سیاسی، اقتصادی اور فکری مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے ایسے پروپیگنڈا مراکز ہیں جنہیں عالمی سامراج کی پالیسیوں کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ ایران کے خلاف ان کا سب سے بڑا ہتھیار "جھوٹ کی سچائی کے روپ میں پیشکش" ہے۔ ایران کی کامیابیوں، عوامی حمایت، اخلاقی موقف اور دفاعی پیشرفتوں کو یا تو مکمل نظرانداز کیا جاتا ہے یا اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ خطرہ ہوں۔ مثال کے طور پر ایران کا جوہری پروگرام، جو ایک پرامن توانائی و سائنسی ترقی کا منصوبہ ہے، اسے بار بار "ایٹمی ہتھیاروں" سے جوڑ کر عالمی سطح پر خوف پھیلایا گیا تاکہ ایران پر دباؤ رکھا جائے۔

اسی طرح مقاومتی تنظیموں کو ہمیشہ "دہشت گرد" قرار دیا جاتا ہے، جبکہ وہ اپنے ملکوں کی آزادی، خودمختاری اور عزتِ نفس کے لیے لڑ رہی ہوتی ہیں۔ فلسطینی مزاحمت کو کبھی اسرائیلی مظالم کے تناظر میں پیش نہیں کیا جاتا بلکہ ہر بار صرف راکٹ حملوں کو دکھایا جاتا ہے، اسرائیلی بمباری، بستیوں کی مسماری، بچوں اور عورتوں کی شہادت کو پسِ منظر میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ حزب اللہ جیسے منظم، سیاسی، فلاحی اور دفاعی کردار ادا کرنے والے گروہ کو ایک شدت پسند جماعت کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے۔

یہ میڈیا ادارے گمراہ کن زبان کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "شیعہ ملیشیا"، "ایرانی حمایت یافتہ گروہ"، یا "آمرانہ ایرانی حکومت"، تاکہ ناظرین کے ذہن میں ایران اور اس کے اتحادیوں کے لیے منفی جذبات پیدا ہوں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایران کو ایک پسماندہ، انتہاپسند، غیر جمہوری اور خطرناک ملک کے طور پر متعارف کرایا جائے، تاکہ اس کے ساتھ عالمی ہمدردی پیدا نہ ہو سکے۔

یہ ادارے جھوٹ کو کئی طریقوں سے پھیلاتے ہیں: کبھی مکمل خبر کو چھپاکر، کبھی کسی واقعے کے صرف ایک پہلو کو دکھاکر، کبھی فوٹیج یا تصاویر کو سیاق وسباق سے ہٹاکر پیش کرکے، اور کبھی جھوٹے ذرائع یا نامعلوم افراد کے حوالے دے کر جھوٹے بیانیے کو معتبر ظاہر کرکے۔ ان کی رپورٹنگ میں تعصب، جانبداری اور دوہرا معیار نمایاں ہوتا ہے۔ اگر ایران میں کوئی عوامی مظاہرہ ہو تو اسے "تحریکِ آزادی" کا رنگ دیا جاتا ہے، لیکن اگر اسی قسم کے مظاہرے سعودی عرب یا فرانس میں ہوں تو وہ "امن و امان کے خلاف کارروائی" قرار پاتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ میڈیا ادارے صرف خبر کے ناقل نہیں بلکہ خبروں کے معمار (Narrative Builders) ہیں، جو جھوٹ، آدھے سچ اور جذباتی چالاکیوں کے ذریعے عالمی شعور کو اپنے مقاصد کے تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایران اور مقاومتی محاذوں کے خلاف یہ جنگ صرف توپ و تفنگ کی نہیں بلکہ دل و دماغ کی ہے، جس میں سب سے بڑا ہتھیار یہی صہیونی سامراجی میڈیا ہے۔ ان کے جھوٹ کو بے نقاب کرنا، متبادل ذرائع ابلاغ کو فروغ دینا، اور حقیقی آواز کو دنیا تک پہنچانا آج کے دور کی سب سے بڑی مزاحمت ہے۔

ایسی صورت میں جب مسلسل اور منظم انداز سے ایران اور مقاومتی محاذ کے خلاف جھوٹا اور گمراہ کن پروپیگنڈا پھیلایا جاتا ہے، تو وہ ناظرین جو پہلے ہی کسی تعصب، نفرت یا فرقہ وارانہ بنیاد پر ایران و مقاومت کے خلاف ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں، ان کا ردعمل مزید شدت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ ان میڈیا اداروں کی ہر جھوٹی خبر کو بلا تحقیق قبول کرتے ہیں، اور پھر اسے اپنی گفتگو، سوشل میڈیا یا عام مجلسوں میں دلیل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ذہن میں چونکہ پہلے سے ایک منفی خاکہ موجود ہوتا ہے، اس لیے جھوٹے بیانیے ان کی نفسیاتی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔ وہ سچائی کو سننے یا دیکھنے سے گریز کرتے ہیں، اور اگر کہیں سچ ان کے سامنے آ بھی جائے تو وہ یا تو اسے مسترد کر دیتے ہیں یا اس پر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے یہ جھوٹ نہ صرف "خبری معلومات" ہوتے ہیں بلکہ ان کی شناخت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

دوسری طرف، جو لوگ سچائی کے متلاشی ہوتے ہیں، ان کے لیے یہ ایک آزمائش کا مقام ہوتا ہے۔ جھوٹے پروپیگنڈے کے سمندر میں سچ کی تلاش ایک مشکل مگر ضروری جدوجہد

بن جاتی ہے۔ ان سچائی کے متلاشی افراد کو چاہیے کہ وہ ایک طرف خود کو تعصبات سے آزاد کریں، اور دوسری طرف خبر کے ماخذ (source) کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ انہیں یہ سمجھنا ہو گا کہ جو میڈیا سامراج کے مفادات سے بندھا ہو، وہ کبھی مظلوموں کی حمایت نہیں کرے گا۔ سچائی کے متلاشی افراد کو چاہیے کہ وہ متبادل ذرائع ابلاغ، مستند علمی حلقے، مقاومتی محاذ کے بیانات، ایران کے سرکاری چینلز، اور ان حلقوں سے رجوع کریں جو زمینی حقائق کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہیں نہ کہ مغربی بیانیے کی روشنی میں۔

انہیں چاہیے کہ وہ تاریخ کو، خصوصاً مشرق وسطیٰ میں سامراجی سازشوں، انقلابِ ایران کی حقیقت، اور مزاحمتی تحریکوں کے مقاصد و کردار کو گہرائی سے پڑھیں۔ وہ صرف خبروں سے نہیں بلکہ خطبات، مضامین، تقاریر اور مختلف زاویوں سے مسئلے کا مطالعہ کریں۔ جب آدمی دل میں سچ کی طلب رکھتا ہے تو خدا خود اسے ایسے مواقع، افراد اور ذرائع مہیا کرتا ہے جو اسے حق کی طرف رہنمائی دیتے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو آخرکار دنیا میں سچ کا علم اٹھاتا ہے اور جھوٹے پروپیگنڈے کا توڑ کرتا ہے، کیونکہ ان کے اندر یہ احساس ہوتا ہے کہ سچ صرف جاننے کی نہیں بلکہ سننے، سمجھنے اور بولنے کی بھی ذمہ داری ہے۔

انسان کیلئے رول ماڈل کی اہمیت اور ائمہ اہلبیت ع کا کردار

تشیع میں ائمہ علیہم السلام کا معصوم اور دور از خطا ہونا محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ دین کی رہنمائی اور ہدایت کی ضمانت ہے۔ جب کوئی فرد یا جماعت انسانوں کی رہبری کے لیے منتخب کی جاتی ہے، تو اس کی سیرت، علم، نیت اور فیصلوں میں کامل صداقت، پاکیزگی اور حکمت کا ہونا ضروری ہوتا ہے، ورنہ وہ خود بھی غلطیوں کا شکار ہو سکتی ہے اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ تشیع کا یہ بنیادی اصول ہے کہ دین کی اصل تشریح اور عملی تطبیق وہی کر سکتا ہے جو الٰہی طور پر معصوم، یعنی گناہ اور خطا سے پاک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نہ صرف ظاہری طور پر عبادات، اخلاق اور معاملات میں کامل نمونہ ہیں بلکہ ان کی فکری گہرائی، قرآنی بصیرت اور سماجی رہنمائی بھی وحی کے فہم سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی معصومیت انہیں ہر قسم کے ذاتی مفاد، وقتی مصلحت یا شیطانی اثر سے پاک رکھتی ہے، اور اس وجہ سے ان کی پیروی دراصل براہ راست الٰہی ہدایت کی پیروی ہے۔

ائمہ علیہم السلام کے کردار میں خلوص، ایثار اور حق پر استقامت وہ صفات ہیں جو ان کی معصومیت کی عملی جھلکیاں ہیں۔ ان کی زندگیاں نہایت سادہ، زہد و ورع سے معمور اور سراپا خدمتِ خلق تھیں۔ لیکن ان کی قربانیاں، مظلومیت اور شہادتیں تشیع میں ایک خاص روحانی و تربیتی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام حسین علیہ السلام کی کربلا میں عظیم قربانی ہو یا امام علی علیہ السلام کا مسجد میں شہادت کے ساتھ رخصت ہونا، امام حسن علیہ السلام کا صلح کے ذریعے

امت کو بچانا ہو یا امام سجاد علیہ السلام کا قید و بند میں صبر کا مظاہرہ، یہ سب واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ ائمہ نے دین کے لیے اپنی جانوں، عزتوں، اولادوں اور زندگیوں کی قربانی دی، لیکن باطل کے سامنے جھکنے کو قبول نہ کیا۔ ان کی شہادتیں یہ سکھاتی ہیں کہ دین کی حفاظت صرف درس و تقریر سے نہیں بلکہ خون، صبر، تقویٰ اور خلوص سے ہوتی ہے۔

ائمہ کی یہ قربانیاں صرف تاریخی واقعات نہیں بلکہ شیعہ مکتب کے ہر فرد کے دل میں عشق، وفاداری، بیداری اور قربانی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ ان کی شہادتیں ہمیں یہ شعور دیتی ہیں کہ حق کا راستہ آسان نہیں لیکن عظیم ہے، اور اس پر چلنے والوں کے لیے ابدی کامیابی ہے۔ اس طرح ائمہ علیہم السلام نہ صرف علمی، اخلاقی اور روحانی رول ماڈل ہیں بلکہ جدوجہد، مظلومیت اور استقامت کے بھی اعلیٰ ترین نشان ہیں، جن کی پیروی سے انسان دنیا اور آخرت میں کامیابی پا سکتا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی طرف رغبت اور ان سے قلبی لگاؤ ایک شیعہ فرد کے دل میں محض عقلی دلیل یا فقہی وجوب کے تحت پیدا نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک گہرے روحانی، قلبی، فطری اور اخلاقی ربط کا نتیجہ ہوتا ہے، جو انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ انسان فطری طور پر کمال، سچائی، عدل، خلوص، محبت، قربانی اور روحانیت کی جانب مائل ہوتا ہے، اور جب وہ ان صفات کو کسی شخصیت میں مکمل اور مجسم حالت میں دیکھتا ہے تو اس کی طبیعت خود بخود اس طرف مائل ہو جاتی ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی زندگیاں انہی صفات کی مکمل تصویر ہیں، اس لیے جو بھی ان کی سیرت،

گفتار، کردار اور قربانیوں سے واقف ہوتا ہے، اس کے دل میں ان کی محبت اور عقیدت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

دل میں ائمہ کی محبت کا ایک اور گہرا سبب یہ ہے کہ وہ صرف مذہبی رہنما نہیں بلکہ دردِ انسانیت رکھنے والے ایسے رہبر ہیں جنہوں نے ہر دور کے مظلوم، محروم، اور مجبور انسان کے لیے ایک شفیق دل اور مددگار ہاتھ کے طور پر کردار ادا کیا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا کربلا میں نعرہ "اگر تمہیں دین نہیں تو کم از کم آزاد مرد بنو" ہو یا امام علی علیہ السلام کا فرمائش کرنا کہ "اگر میرا دشمن بھی بھوکا ہو تو اس کو کھانا دو"، یہ صرف دینی عقیدے نہیں بلکہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے والی باتیں ہیں۔ ایک شیعہ جب ان باتوں کو سمجھتا ہے تو وہ صرف ائمہ کو مانتا نہیں بلکہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے، ان کی طرف کھنچنے لگتا ہے، اور انہیں اپنا فکری، روحانی اور جذباتی سہارا سمجھنے لگتا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی طرف رغبت اس لیے بھی بڑھتی ہے کہ وہ ہر سطح پر انسان کے دکھوں، سوالات، مشکلات اور محرومیوں کا جواب فراہم کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں جیسے دعا کمیل، دعا ابو حمزہ ثمالی، دعا عرفہ اور صحیفہ سجادیہ کی دعائیں، ایک مومن کے دل کی گہرائیوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ان دعاؤں میں جو درد، تواضع، خدا سے رابطہ، اور اپنی کمزوری کا اعتراف ہوتا ہے، وہ ہر سچے انسان کے دل کی صدا بن جاتا ہے۔ ان دعاؤں کے ذریعے انسان ائمہ کو صرف معلم یا رہنما نہیں بلکہ اپنے دل کا راز دار، روح کا مرہم اور عشق کا مرکز سمجھنے لگتا ہے۔

قلبی لگاؤ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ائمہ نے کبھی اپنے ماننے والوں سے دنیاوی مفاد، سیاست، مال یا شہرت کی طلب نہیں رکھی۔ ان کا تعلق صرف خدا کے لیے، حق کے لیے اور مخلوق کی ہدایت کے لیے تھا۔ یہ خلوص، یہ بے غرضی، یہ انکساری اور یہ قربانی، محبت کو صدقے میں بدل دیتی ہے۔ انسان ان ہستیوں کو اپنا سمجھنے لگتا ہے، اپنی دعاؤں میں انہیں وسیلہ بناتا ہے، ان کے روضوں پر جا کر اپنے دل کے درد بیان کرتا ہے، اور ان کی یاد میں آنسو بہاتا ہے۔ یہ آنسو، یہ جذبات، یہ سوزِ درون، فقط عقیدے کی نہیں بلکہ محبت کی دلیل ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کی طرف یہ قلبی لگاؤ صرف فردی سطح پر نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی ایک عظیم روحانی طاقت بن جاتا ہے۔ یہی محبت ہے جو کربلا جیسے واقعات کو زندہ رکھتی ہے، جو عزاو ماتم کی شکل میں دلوں کو جوڑتی ہے، جو ایک امت کو دشمنوں کے مقابلے میں بیدار رکھتی ہے، اور جو انسان کو جبر، ظلم اور طاغوت کے خلاف استقامت عطا کرتی ہے۔ یہی محبت ہے جو کسی غریب کو بھی فخر کے ساتھ "میں شیعہ ہوں" کہنے پر آمادہ کرتی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس سے اس کا تعلق ہے وہ دنیاو آخرت کی عزت کا سرچشمہ ہے۔

یوں ائمہ علیہم السلام کی طرف رغبت اور ان سے قلبی لگاؤ ایک شیعہ کے لیے صرف دینی یا فکری وابستگی نہیں بلکہ ایک زندہ، جیتی جاگتی روحانی حقیقت ہے جو اس کی شناخت، اس کے کردار، اس کے جذبات اور اس کی زندگی کے ہر پہلو میں جھلکتی ہے۔ یہ لگاؤ اسے خدا سے جوڑتا ہے، مظلوم سے ہمدردی سکھاتا ہے، باطل کے خلاف بغاوت پیدا کرتا ہے، اور اسے اپنے وقت کے امام کی نصرت کے لیے تیار کرتا ہے۔

جدید دور میں شیعہ تحریک کی کامیابی کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو اس کی فکری، روحانی اور عملی بنیادیں براہ راست ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت اور نظریہ مہدویت سے جڑی ہوئی ہیں، اور جب ہم اس تمام سلسلے کو نفسیاتی تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ آتا ہے کہ کس طرح ان ہستیوں کی یاد، ان کا پیغام، اور امام مہدی عج اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا تصور ایک فردِ شیعہ کی باطنی تشکیل، جذباتی استقامت، اور سماجی تحرک کا ذریعہ بنتا ہے۔

نفسیات کا بنیادی اصول ہے کہ انسان جب کسی اعلیٰ تر مقصد، کامل نمونے یا مطمئن کن امید سے جُڑا ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں شعوری مرکزیت، جذباتی توازن، اور معنوی جہت پیدا ہوتی ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام، جنہوں نے ظلم، جبر، تحریف، گمراہی اور طاغوتی نظاموں کے خلاف اپنی جانیں، وقت، خاندان اور عزتیں قربان کیں، ان کی زندگی کا ہر پہلو ظلم کے خلاف حق کی جدوجہد کا عملی نمونہ ہے۔ ایک شیعہ فرد جب ان کی قربانیوں کو جانتا ہے، تو اسے اپنے دکھ، بے بسی، محرومی یا ناکامی ذاتی محسوس نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی حالت کو عظیم تر جدوجہد کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے اس کے اندر ایک نفسیاتی قوت پیدا ہوتی ہے جو اسے شکست خوردگی کے احساس سے بچاتی ہے اور باطل کے خلاف بیداری اور جدوجہد کا شعور عطا کرتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ائمہ کی محبت فرد کے اندر ایک جذباتی تحفظ اور روحانی وابستگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ محبت فرد کو تنہائی، بیگانگی، اور معاشرتی عدم انصاف کے احساس میں ڈوبنے سے روکتی ہے، کیونکہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے خانوادے سے جُڑا ہوا ہے جس نے ہر زمانے میں انسانیت، عدل، اور حق کی خاطر قربانیاں دیں، اور جو آج بھی اس کے

دکھوں سے باخبر ہے۔ یہ تعلق انسان کی شخصیت میں اعتماد، شجاعت، اور روحانی سکون پیدا کرتا ہے۔

نظریہ مہدویت اس نفسیاتی عمل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ایک شیعہ فرد یہ یقین رکھتا ہے کہ ایک منجی، ایک نجات دہندہ، جو معصوم اور مکمل ہادی ہے، پردہ غیبت میں زندہ ہے اور ایک دن ظہور کرے گا تاکہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے، تو اس کے اندر مایوسی کی جگہ امید، بے یقینی کی جگہ یقین، اور کمزوری کی جگہ عزم آجاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر امید ایک انسان کی بقاء اور کامیابی کے لیے ناگزیر ہے، اور مہدویت کا تصور شیعہ فکر میں ایک زندہ، فعال، اور مسلسل متحرک امید کا نظام مہیا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو جمود کا شکار نہیں ہونے دیتا بلکہ وہ خود کو ایک جاری انقلابی تسلسل کا حصہ سمجھتا ہے۔

اس نظریے کی طاقت یہ ہے کہ یہ فرد کو صرف مستقبل کے انتظار پر نہیں چھوڑتا بلکہ حال میں عمل، تربیت، تزکیہ نفس، اور اجتماعی ذمہ داری کی طرف بلاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ واقعی امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا منتظر ہے، تو اس کی زندگی، اخلاق، تعلقات، علم، جدوجہد اور استقامت سب کچھ اس انتظار کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ یہی نفسیاتی بیداری، امید، اور روحانی تعلق اس کے طرز فکر، مزاج اور رویّے کو تبدیل کرتی ہے، اور یہی تبدیلی فرد سے معاشرے اور تحریک تک پھیلتی ہے۔

یوں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا رول ماڈل ہونا، ان کی محبت سے دل کا وابستہ ہونا، اور امام مہدی علیہ السلام کی عالمی عدل پر مبنی حکومت کا انتظار، شیعہ تحریک کو ایک زبردست روحانی، فکری اور نفسیاتی بنیاد عطا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا جامع نظام بن جاتا ہے جس میں فرد

کبھی تنہا، مایوس یا بے مقصد محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ ہر لمحہ خود کو ایک عظیم عدالتی انقلاب کے لیے تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اس کی انفرادی کامیابی اور تحریک کی اجتماعی کامیابی، دونوں کا ضامن بنتا ہے۔

رول ماڈل اور رہبری کی انسانی زندگی میں حیثیت چونکہ ایسی ہوتی ہے جیسی ایک قطب نما کی مسافر کے لیے ہوتی ہے۔ انسان اپنی فطرت میں رہنمائی کا متلاشی ہوتا ہے، کیونکہ وہ عقل، جذبات، خواہشات اور چیلنجز کے بیچ ایک ایسی قیادت کا طلبگار ہوتا ہے جو اسے نیکی، عدل اور ہدایت کی جانب راہ دکھائے۔ اسلامی تعلیمات میں یہ رہبری خدا کی طرف سے سب سے پہلے انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے فراہم کی گئی، جنہوں نے نہ صرف احکامِ الٰہی پہنچائے بلکہ عملی طور پر ان احکام کو اپنے کردار سے مجسم کیا۔ ان کے بعد ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اسی مشن کو جاری رکھا اور امت کو فکری، روحانی اور عملی سطح پر رہنمائی فراہم کی۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نظامِ رہبری ہے جو انسان کو حق اور باطل کے فرق کو واضح کرتے ہوئے رشد و ہدایت کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ چونکہ امامت وولایت کا تصور محض ایک رسمی یا سیاسی نظام نہیں بلکہ ایک الٰہی، فکری، اخلاقی اور اجتماعی رہنمائی کا مربوط نظام ہے، اس لیے اس کا تسلسل قیامت تک جاری رہنا فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیبتِ کبریٰ کے بعد ائمہ معصومین ع نے اپنے فرمودات میں جس نظریہ کو سامنے رکھا، وہ* ولایتِ فقیہ * ہے، جو دراصل ولایتِ معصوم کا تسلسل ہے اور انہی کے حکم پر یہ نظریہ شیعہ فقہ وکلام کا حصہ ہے۔

ولایتِ فقیہ کا تصور اس بنیاد پر قائم ہے کہ چونکہ امام معصوم علیہ السلام پردۂ غیبت میں ہیں اور دنیا اپنی رہنمائی سے محروم نہیں ہو سکتی، لہٰذا ایسے فقیہ کو امورِ امت کی باگ ڈور سونپی جائے جو دین کی عمیق فہم، عدل و تقویٰ، سیاسی بصیرت، اور سماجی حکمت رکھتا ہو۔ فقیہ جامع الشرائط محض ایک مجتہد یا مفتی نہیں بلکہ وہ ایک ایسا قائد ہوتا ہے جو نہ صرف احکامِ دین سے واقف ہے بلکہ امت کی اجتماعی نبض کو سمجھتے ہوئے، عدل و انصاف پر مبنی ایک نظامِ حکومت کو بھی قائم کر سکتا ہے۔ وہ عوام کا محسن، ظالم کے خلاف دیوار، محروموں کی آواز، اور دینِ خدا کا محافظ ہوتا ہے اور امت کو الٰہی اہداف کے حصول کیلئے اور ظہور امام زمانہؑ کیلئے تیار کرتا ہے۔

اسلامی انقلابِ ایران نے اس نظریہ کو عملی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے ولایتِ فقیہ کو محض ایک نظریاتی اصول کے طور پر نہیں رکھا بلکہ اس کے ذریعے ظلم، استکبار اور سامراجی نظام کے خلاف ایک عالمی تحریک برپا کی۔ امام خمینی کی قیادت نے دنیا کو یہ باور کرایا کہ فقیہ، اگر الٰہی صفات اور تقویٰ کے ساتھ مسلح ہو، تو وہ نہ صرف ایک فرد کی بلکہ ایک ملت کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ ان کی شخصیت خود امامانِ معصومین علیہم السلام کے کردار کا آئینہ دار تھی، جنہوں نے محروموں کے لیے قیام کیا، طاغوت سے ٹکرایا، اور اللہ کے دین کو زمین پر نافذ کرنے کی سعی کی۔

ولایتِ فقیہ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ امامِ معصوم علیہ السلام اگرچہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، مگر ان کی رہبری کا نظام ختم نہیں ہوا۔ وہ اپنی نیابت ان افراد کے سپرد کرتے ہیں جو ان کے علوم، اخلاق، بصیرت اور عدل کی عملی تصویر ہوں۔ یہ نیابت محض

قانونی نہیں بلکہ ایک روحانی و فکری رشتہ ہے، جس کی جڑیں امام زمانہ عج کی تائید اور توجہ سے جڑی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ولیِ فقیہ کا احترام اور اس کی اطاعت، امامِ وقت کی اطاعت کے زمرے میں آتی ہے، اور اس نظام کے تحت ایک فرد نہ صرف دینی لحاظ سے محفوظ رہتا ہے بلکہ وہ ایک متحرک، باعزت، اور بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے۔

آج جب دنیا مادہ پرستی، اخلاقی زوال، اور فکری انتشار کا شکار ہے، اس وقت ایک الٰہی رہبر کا ہونا کسی نعمت سے کم نہیں۔ جو قوم ولیِ فقیہ کے زیرِ سایہ ہے، وہ دراصل امامِ معصوم کے فیض سے مستفید ہو رہی ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو دین کو سیاست، اخلاق کو قانون، اور روحانیت کو حکومت سے جوڑتا ہے، اور یہی وہ رہبری ہے جو امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کی عالمی حکومت کی تمہید ہے۔

خود مختاری یا ذہنی غلامی؟!!

(کچھ نادان اور کم علم لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر مغرب اور صہیونی استعمار اتنا برا ہے تو ان کی مصنوعات کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے؟)

دنیا کی فکری اور علمی تاریخ میں اگر کسی قوم نے تمدن، سائنس، فلسفہ، طب، ریاضی، فلکیات، اور دیگر شعبہ جات میں سب سے زیادہ خدمات انجام دی ہیں تو وہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں نے اندھیروں میں ڈوبی دنیا کو علم کا چراغ دیا، انسان کو کائنات سے روشناس کرایا اور عقل و فکر کے وہ در وا کیے جو آج کی جدید دنیا کی بنیاد بنے۔ مگر بدقسمتی سے تاریخ کو مسخ کر کے، علمی ورثے کو چوری کر کے، اور استعماری سازشوں کے ذریعے مسلمانوں کو ہی پسماندہ، محتاج، اور مغرب کا مرہون منت ظاہر کیا گیا۔ جب آج کے دور میں کوئی باشعور فرد یا تنظیم صہیونی استعمار کی مخالفت کرتا ہے تو کچھ نادان اور کم علم لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر مغرب اور صہیونی استعمار اتنا برا ہے تو ان کی مصنوعات کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ سوال اپنی بنیاد میں فکری مغالطے، تاریخی لاعلمی اور ایک خطرناک استعمار پسند ذہنیت کو چھپائے ہوئے ہے۔

یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ جس مغرب کو آج جدیدیت، سہولت، ٹیکنالوجی، اور علم کا مرکز سمجھا جاتا ہے، وہ دراصل قرون وسطیٰ کے تاریک ترین دور میں غرق تھا، جب مسلمان دنیا کے علم، تمدن، تہذیب اور ٹیکنالوجی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بغداد کی بیت الحکمت، قرطبہ کی

جامعہ، نیشاپور، بلخ، ہرات، دمشق، قاہرہ، اصفہان جیسے علمی مراکز صدیوں تک وہ نور بانٹتے رہے جس نے مغرب کے اندھیروں کو روشنی میں بدلا۔ الخوارزمی کا الجبرا، ابن الہیثم کا نظریہ بصارت، جابر بن حیان کی کیمسٹری، ابن سینا کی الطب، فارابی و رازی کی فلسفہ و طب، یہ سب وہ بنیادی ستون تھے جن پر یورپ نے اپنی موجودہ سائنسی ترقی کی عمارت کھڑی کی۔

یورپ نے صرف ان مسلم علوم کو چوری نہیں کیا بلکہ انہیں اپنے نام سے شائع کیا، انہیں نصاب کا حصہ بنایا، اور خود کو علم کا سرچشمہ ظاہر کرنے لگا۔ آکسفورڈ، کیمبرج اور دیگر مغربی جامعات نے صدیوں تک عربی و فارسی متون کا ترجمہ کر کے پڑھایا، اور مسلمان محققین کے تراجم کو اپنی تحریروں میں ضم کر کے ان پر اپنا نام چسپاں کیا۔ یہ علمی چوری آج بھی مغرب کی عظمت کے جھوٹے بیانیے کی بنیاد ہے۔

استعمار کا دوسرا ہتھیار مادی وسائل کی لوٹ مار تھا۔ افریقہ، ایشیا اور مسلم دنیا میں داخل ہو کر صہیونی و مغربی طاقتوں نے نہ صرف سیاسی و عسکری تسلط قائم کیا بلکہ ان ممالک کے سونے، چاندی، جواہرات، تیل، قیمتی معدنیات اور زرعی وسائل کو چوری کیا۔ یہ لوٹی ہوئی دولت لندن، پیرس، نیویارک، واشنگٹن، برلن اور روم کی عمارتوں میں نظر آتی ہے۔ افریقہ کے بچے بھوک سے مر رہے ہیں جبکہ ان کے وسائل یورپ کے عجائب گھروں اور کمپنیوں میں سجے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس جدید ٹیکنالوجی نہ ہونے کا سبب یہ نہیں کہ وہ کم عقل یا سست ہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان کے تمام وسائل کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت چوس لیا گیا ہے۔

آج کی دنیا میں بھی یہی صورت حال جاری ہے۔ صہیونی سرمایہ داری نظام نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مغربی ادارے جیسے عالمی بینک، آئی ایم ایف، نیٹو، ڈبلیو ٹی او

وغیرہ، معاشی دہشت گردی کے ایسے ہتھیار بن چکے ہیں جن کے ذریعے مسلم ممالک کو قرضوں میں جکڑ کر ان کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوا جاتا ہے، ان کے تعلیمی نظام، میڈیا، عدلیہ، اور معیشت کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیز اپنی مصنوعات انہی ممالک کے سستے مزدوروں، سستے خام مال، اور مفت وسائل سے تیار کر کے مہنگے داموں بیچتی ہیں۔ یہی نظام غلامی کی جدید شکل ہے۔

اب ایسے میں اگر کوئی شخص یا تنظیم مغربی وصہیونی استعمار کے خلاف بات کرے، اس کے مظالم کو بے نقاب کرے، تو جواب میں یہ کہنا کہ تم خود ان کی مصنوعات استعمال کرتے ہو، ایک سطحی، فریب زدہ اور غیر منصفانہ اعتراض ہے۔ اصل مسئلہ مصنوعات کا استعمال نہیں بلکہ ذہنی غلامی، فکری تسلیم، اور استعماری نظام کا دفاع ہے۔ جب تک ہم مغرب کو علمی و اخلاقی طور پر اپنا آقا تسلیم کرتے رہیں گے، اس کی مصنوعات کا ترک کرنا محض ایک نمائشی عمل ہو گا۔ اصل کام یہ ہے کہ ہم فکری، سائنسی، تہذیبی اور اقتصادی طور پر آزاد ہوں۔

ایران جیسے ممالک نے یہ مثال قائم کر دی ہے کہ مغربی پابندیوں کے باوجود خود انحصاری کا راستہ ممکن ہے۔ ایران نے نہ صرف سائنس، میڈیکل، نیوکلیئر انرجی، اور ملٹری ٹیکنالوجی میں زبردست پیش رفت کی بلکہ ثقافتی اور فکری میدان میں بھی اپنی شناخت قائم رکھی۔ یہی حقیقی آزادی ہے جسے استعمار سب سے زیادہ خطرہ سمجھتا ہے۔

آج کی دنیا میں اطلاعات، نظریات، جذبات، اور نفسیات کی جنگیں اصل میدانِ کارزار بن چکی ہیں۔ روایتی ہتھیاروں کے بجائے آج اقوام اور طاقتیں میڈیا، سوشل نیٹ ورکس، اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کو بطور ہتھیار استعمال کرتی ہیں۔ واٹس ایپ، فیس بک، انسٹاگرام، ٹوئیٹر،

یوٹیوب اور دیگر ذرائع ابلاغ صرف رابطے کے ذرائع نہیں بلکہ عالمی استعمار، صہیونی پروپیگنڈا مشینری، اور فکری یلغار کے جدید ہتھیار بن چکے ہیں۔ ان کے ذریعے اقوام کے اذہان قابو میں لائے جاتے ہیں، نوجوانوں کے عقائد، ترجیحات، شناخت اور وفاداریاں بدلی جاتی ہیں، اور حق و باطل کی جنگ کو شطرنج کی بساط پر بدلا جاتا ہے جہاں حقیقی مجاہد کو دہشتگرد اور دشمن کے ایجنٹ کو نجات دہندہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

تاہم اہم نکتہ یہ ہے کہ ان سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو دشمن کا ہتھیار تسلیم کرتے ہوئے انہیں ترک کر دینا، ان کا مکمل بائیکاٹ کرنا کوئی حل نہیں ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جنگ میں ہتھیاروں کا بائیکاٹ نہیں کیا جاتا، بلکہ دشمن کے ہتھیار کو اس کے خلاف استعمال کرنا ہی حکمت اور بصیرت کی علامت ہے۔ قرآن مجید اس اصول کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے کہ دشمن کی چالوں کو ان ہی کے انداز میں پلٹاؤ، جیسا کہ فرمایا: "وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" (الفرقان:52) یعنی قرآن کے ذریعے ان سے عظیم جہاد کرو۔ یہاں بھی اللہ نے مومن کو حکم دیا ہے کہ وہ علم و حکمت، فہم و بصیرت کے ذریعے دشمن کی فکری جنگ کا مقابلہ کرے۔

رسول خدا صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومینؑ کی سیرت بھی یہی روش اختیار کرتی ہے۔ آنحضرت صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مکہ کے کفار اور ان کے اسلحے، قوت، اور سیاسی چالوں کا سامنا کیا تو صرف جسمانی جنگ پر انحصار نہ کیا بلکہ ان کے سیاسی، معاشرتی، اور فکری وسائل کو ان کے خلاف استعمال کیا۔ حدیبیہ کے معاہدے، قبائلی نظام کے اندورنی تضادات، اور قریش کی تجارتی ناکہ بندیوں میں حکمت اور فہم کا پہلو نمایاں رہا۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کے خطبات بھی بتاتے ہیں کہ سیاسی فتنوں کا جواب فکری اور حکیمانہ

انداز سے دیا جائے۔ امام حسینؑ نے کربلا میں یزیدی میڈیا پروپیگنڈے کا توڑ اپنی خطابت، فہم، اور شہادت کے ذریعے کیا۔ آپ نے یزید کی طاقت کا مقابلہ صرف تلوار سے نہیں کیا بلکہ فصاحت و بلاغت، پیغام رسانی، اور کربلا کے پیغام کو ابلاغ کے تمام ممکنہ ذرائع سے عام کرکے اس کے ظلم کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر دیا۔

آج دشمن نے میڈیا کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنا لیا ہے۔ وہ ہماری سوچ کو بدلنے، ہمارے ہیروز کو ولن بنانے، اور ہمارے بچوں کو اپنی تہذیب کا گرویدہ بنانے کے لیے ہر لمحہ ان ہی پلیٹ فارمز کو استعمال کرتا ہے۔ اگر ہم ان پلیٹ فارمز سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لیں تو ہم صرف اپنی موجودگی کو ختم کریں گے، جبکہ دشمن بغیر مزاحمت کے اپنا ایجنڈا پھیلاتا رہے گا۔ ایسی صورت میں ہماری خاموشی اس کے پروپیگنڈا کو مضبوط کرے گی۔ ہمیں انہی پلیٹ فارمز پر حق کی آواز بلند کرنا ہوگی، انہی ذرائع سے قرآن و سنت کا پیغام عام کرنا ہوگا، انہی کے ذریعے یزیدِ عصر کو بے نقاب کرنا ہوگا۔ اگر حق گو افراد ان ذرائع کو خیر باد کہہ دیں گے تو باطل کی آواز گونجتی رہے گی اور حق کے لیے میدان خالی ہو جائے گا۔

قرآن کی سورہ انفال میں اللہ فرماتا ہے: "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ" یعنی اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے جو کچھ قوت تم سے ہو سکے، تیار رکھو۔ آج کی دنیا میں میڈیا، زبان، تحریر، اور سوشل نیٹ ورکس سب سے مؤثر قوت ہیں۔ ان کی تیاری، ان پر مہارت، اور ان کے استعمال کا فریضہ بھی اسی آیت کا مصداق ہے۔ ہم اگر ان میدانوں سے غافل رہیں گے تو دشمن انہیں بغیر مزاحمت کے ہمارے خلاف استعمال کرتا رہے گا۔

لہٰذا ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ واٹس ایپ، فیس بک، انسٹاگرام، ٹوئیٹر، یوٹیوب جیسے ذرائع صرف تفریحی یا سوشل ذرائع نہیں، بلکہ یہ ایک جنگی میدان ہیں۔ اس میدان میں اگر ہم فکری مجاہد بن کر نہ اترے تو ہماری نسلیں دشمن کی فکری غلامی میں چلی جائیں گی۔ سچ کو عام کرنے، جھوٹ کو بے نقاب کرنے، ظالم کو للکارنے، اور مظلوم کی آواز بننے کے لیے ان ہی ذرائع کو استعمال کرنا وقت کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ یہ جنگ قلم کی ہے، ویڈیو کی ہے، پوسٹ اور کمنٹ کی ہے۔ اگر ہم نے یہ جنگ نہ لڑی تو صرف میدان ہی نہیں، نسلیں بھی ہم ہار جائیں گے۔

لہٰذا دشمن کے ہتھیار کو اس کے خلاف استعمال کرنا سنتِ الٰہیہ، سیرتِ انبیاء، اور حکمتِ معصومینؑ کا حصہ ہے۔ ان پلیٹ فارمز کا بائیکاٹ نہیں بلکہ ان پر قبضہ اور حق کا غلبہ لازم ہے۔ سوشل میڈیا کی ہر پوسٹ، ہر ویڈیو، اور ہر لفظ کو جہادِ فکری کا ہتھیار بنا کر ہم اپنے وقت کے فرعونوں اور نمرودوں کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔ یہی اصل بیداری اور حقیقی مزاحمت ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ استعمار سے جنگ کسی مصنوعی جذباتیت کا نام نہیں بلکہ ایک فکری، نظریاتی، ثقافتی، سائنسی، اور سیاسی بیداری کا نام ہے۔ جو لوگ استعماری سہولتوں کے سحر میں مبتلا ہو کر ان کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں، وہ دراصل استعمار ہی کی ذہنیت کا تسلسل ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ، ان کا علمی ورثہ، ان کی قربانیاں، اور آج بھی جاری مزاحمت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قوم اگر بیدار ہو جائے تو اپنے وسائل سے وہ دنیا تعمیر کر سکتی ہے جس میں عزت، انصاف، اور آزادی ہو۔

لہذا یہ مغالطہ ختم ہونا چاہیے کہ مسلمان دشمن کی مصنوعات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کیونکہ دشمن نے جو کچھ بھی دنیا کو دیا ہے، وہ لوٹی گئی دولت، چوری شدہ علم، اور مسلط کردہ غلامی کے بل پر ہے، نہ کہ اس کی اپنی عظمت یا انسان دوستی کے سبب۔ ہمیں فکری بیداری، خود انحصاری، اور نظریاتی مزاحمت کے ذریعے اس باطل نظام کو للکارنا ہو گا، اور اپنی آئندہ نسلوں کو آزاد اور خود دار بنانا ہو گا۔ یہی اصل جہاد اور وقت کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

دنیا کے مسائل کا اصل منبع اور حل

آج کی دنیا میں جو اقوام خود کو "ترقی یافتہ" اور "متمدن" قرار دیتی ہیں، وہ جب عالمی مسائل کے حل کی بات کرتی ہیں، تو اپنے کردار کو یا تو مکمل طور پر چھپا لیتی ہیں یا خوبصورت الفاظ اور لفاظی کے پردے میں اسے چھپا دیتی ہیں۔ مثلاً وہ جب پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) کی بات کرتے ہیں، تو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ دنیا کی بھلائی، ماحولیاتی تحفظ، غربت کا خاتمہ، اور صنفی مساوات جیسے اہداف ان کے خالص انسانی جذبے اور اخلاص کا نتیجہ ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان اقوام نے ہی ان مسائل کو جنم دیا، انہیں ہوا دی، اور آج ان کے لیے جعلی حل پیش کر کے خود کو نجات دہندہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ماحولیات کا مسئلہ اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ صنعتی انقلاب کا آغاز برطانیہ اور یورپ سے ہوا، جہاں بھاپ سے چلنے والے انجن، کوئلے کے استعمال، اور بڑے پیمانے پر صنعتوں کے قیام نے فضا کو آلودہ کرنے کی بنیاد رکھی۔ آج عالمی حدت (global warming)، کاربن اخراج، اور ماحولیاتی انحطاط کے جو بڑے خطرات ہیں، ان کی جڑیں وہی مغربی صنعتی نظام ہے۔ لیکن اب وہی ممالک، جو ایک صدی تک بغیر کسی روک ٹوک کے قدرتی وسائل کا استحصال کرتے رہے، ترقی پذیر ممالک کو درس دیتے ہیں کہ وہ ماحول کا خیال رکھیں، کم

کاربن استعمال کریں، اور اپنی صنعتی ترقی کو "پائیدار" بنائیں، جبکہ خود وہ اپنی تاریخی آلودگی پر خاموش رہتے ہیں۔

اسی طرح فیملی سسٹم کی تباہی مغرب کے اس نام نہاد "آزادی اور انفرادی حقوق" کے فلسفے کا نتیجہ ہے، جس نے ماں باپ، بیوی شوہر، اور اولاد کے درمیان فطری تعلقات کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ آج "فیملی یونٹ" مغرب میں ٹوٹ چکا ہے۔ شادیاں کم ہو رہی ہیں، طلاق کی شرح بلند ہے، اور بچے نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں۔ مگر اب وہی مغربی ماہرین "فیملی ویلنیس" کے نام پر سلوشنز بیچ رہے ہیں۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے کہ جس خاندانی نظام کو انہوں نے "روایتی، دقیانوسی، اور جبر پر مبنی" قرار دے کر توڑا تھا، اس کی جگہ وہ کوئی متبادل نہ دے سکے۔

معاشی میدان میں بھی صورتحال یہی ہے۔ عالمی قرضوں کا نظام، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے، اور نیولبرل اکنامک ماڈل، یہ سب مغرب کی تخلیق کردہ ہیں۔ انہوں نے تیسری دنیا کو پہلے نوآبادیاتی نظام کے ذریعے لوٹا، پھر ان پر قرضوں کا جال پھینک کر ان کی معیشت کو اپنی مرضی سے چلانے پر مجبور کیا۔ آج غربت، مہنگائی، اور معیشتی غلامی جیسے مسائل ان ہی پالیسیوں کا نتیجہ ہیں، مگر انہی اقوام کے تھنک ٹینک، سیمینارز، اور رپورٹیں یہ باور کراتی ہیں کہ یہ سب مقامی حکمرانی کے مسائل ہیں، اور مغرب صرف "مدد" کرنا چاہتا ہے۔

تعلیم کے شعبے میں بھی انہوں نے ایک ایسا نظام مسلط کیا جو مقامی تہذیبوں، مذہبی اقدار، اور معاشرتی شناخت کو مٹا کر ایک سیکولر، صارفیت پر مبنی، اور مغربی سوچ پر استوار ہے۔ آج جب SDGs کے ذریعے تعلیم کے فروغ کی بات کی جاتی ہے تو درحقیقت وہ اس عمل

کو مزید تیز کرنے کی کوشش ہے، تاکہ تیسری دنیا کے ذہن مغرب کے سائے میں پروان چڑھیں، اور وہ ان کے سامراجی نظام کے وفادار بن سکیں۔

یہ سب کچھ صرف زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ عملی طور پر دنیا کی پالیسیوں میں جھلکتا ہے۔ مثلاً مغرب خود اربوں ڈالر کے ہتھیار بنا کر جنگیں پھیلاتا ہے، اور پھر امن و انسانیت کے نعرے لگاتا ہے۔ وہ اپنے مفادات کے لیے حکومتیں گراتا ہے، لیکن اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر جمہوریت کی دہائی دیتا ہے۔ یہی تضاد ان کے فکری، اخلاقی، اور انسانی دوغلے پن کی اصل تصویر ہے۔

الغرض یہ اقوام جن مسائل کے حل کا دعویٰ کرتی ہیں، وہی ان مسائل کا اصل ماخذ اور سبب ہیں۔ ان کی پالیسیوں، فلسفوں، اور اقدار نے انسانی معاشروں کو کمزور کیا، قدرتی نظام کو بگاڑا، اور روحانی و اخلاقی اقدار کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ اب وہی اقوام اگر اصلاح کا دعویٰ کریں، تو یہ ایک چور کا شور مچانا ہے جو سب سے زیادہ نقصان کے بعد محافظ بننے کا ڈرامہ رچا رہا ہو۔ اس فریب کو پہچاننا، اور اس کے متبادل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سامنے لانا ہماری فکری ذمہ داری ہے۔

تیسری دنیا، بالخصوص مسلم دنیا، کو درپیش جو حقیقی مسائل ہیں وہ وہ نہیں جنہیں SDGs میں نمایاں کیا گیا ہے بلکہ وہ مسائل ہیں جنہیں یا تو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا یا انہیں غیر اہم بنا کر پیش کیا گیا۔ ان مسائل کی جڑیں استعماری تاریخ، فکری غلامی، ثقافتی یلغار، اور سرمایہ دارانہ عالمی نظام میں پیوستہ ہیں۔ تیسری دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ فکری آزادی کا فقدان ہے۔ قومیں اپنے مسائل کو خود نہیں سمجھ رہیں بلکہ مغرب کی فراہم کردہ تعریفوں،

پیمانوں اور معیارات کے ذریعے اپنے وجود کو جانچ رہی ہیں۔ جب تک فکری خود مختاری بحال نہیں ہو گی، مسائل کی درست تشخیص ممکن نہیں۔

دوسرا بڑا مسئلہ روحانی و اخلاقی زوال ہے۔ معاشرت میں مادہ پرستی، خود غرضی، اخلاقی انحطاط، خاندانی نظام کی تباہی، اور معنویت سے خالی تعلیم کا غلبہ ہے۔ SDGs ان مسائل کو نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسی پالیسیاں متعارف کرواتے ہیں جو انہی بیماریوں کو فروغ دیتی ہیں، جیسے کہ فیملی سٹرکچر کو کمزور کرنے والے صنفی مساوات کے انتہاپسندانہ نظریات یا مغرب کی وضع کردہ جنسی شناخت کی آزادی۔

ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو مصنوعی ریاستی نظام، فرقہ وارانہ تقسیم، لسانی و نسلی تعصبات، اور استعماری سرحدوں میں جکڑا گیا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی قومی وحدت اور تمدنی شناخت ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی کرپشن، استبداد، اور عوامی شعور کی پسماندگی نے ریاستی مشینری کو عالمی سامراج کے لیے ایک آلہ کار بنا دیا ہے۔ SDGs ان مسائل کو "گڈ گورننس" جیسے مبہم نعروں میں چھپا کر ان کے اصلی اسباب سے توجہ ہٹا دیتے ہیں۔

معاشی میدان میں بھی اصل مسئلہ استعماری مالیاتی اداروں کی گرفت، سودی نظام، وسائل کی لوٹ مار، اور لوکل اکانومی کو گلوبل مارکیٹ کے تابع بنانا ہے۔ SDGs غربت مٹانے کی بات تو کرتے ہیں، مگر غربت پیدا کرنے والے عالمی سرمایہ دارانہ نظام، سودی قرضوں، یا وسائل کے استحصال پر خاموش ہیں۔ اسی طرح صحت و تعلیم کو تجارت بنا دینے، مقامی طب

اور حکمت کو نظر انداز کر دینے، اور ذہن سازی کو مغربی نظریات کے تابع کرنے جیسے مسائل بھی SDGs کے دائرۂ نظر سے باہر ہیں۔

حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ امتِ مسلمہ بالخصوص، اپنی فکر، تہذیب، اور سیاست میں خودمختاری کھو بیٹھی ہے۔ ان کے ہاں نہ قیادت اسلامی اصولوں پر تربیت پاتی ہے، نہ نظام تعلیم انسان کی حقیقت، مقصدِ حیات، اور عبدیتِ رب کی روشنی میں تشکیل دیا جاتا ہے، نہ میڈیا ان کے اقدار کا ترجمان ہے، اور نہ ہی عدالت و سیاست عدلِ الٰہی کی روشنی میں چلتی ہے۔ ان تمام مسائل کا حل صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہم مغرب کی تشخیصات سے آزاد ہو کر خود اپنے مسائل کو پہچانیں، ان کی جڑوں تک پہنچیں، اور ان کے لیے ایک مکمل، الٰہی اور تمدنی نظام تشکیل دیں۔ جب تک ایسا نہ ہو گا، SDGs جیسے خوبصورت الفاظ کے نیچے چھپا ہوا استعمار ہمارے وجود، وسائل، اور عقائد کو چاٹتا رہے گا اور ہم اپنی تباہی کو ترقی کا نام دیتے رہیں گے۔

ان تمام مسائل اور ان کے اصل مصادر کا سنجیدہ اور مستقل حل صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم دنیا کو محض طاقت، معیشت یا سائنسی ترقی کے پیمانوں سے دیکھنے کے بجائے ایک الٰہی و اخلاقی وژن کے تحت دیکھنا شروع کریں۔ اس وژن کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ انسان محض ایک معاشی یا سماجی حیوان نہیں بلکہ ایک عبدِ خدا ہے، جو زمین پر خلافتِ الٰہی کا نمائندہ ہے اور جس کی اصل ہدایت ربانی نظام کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی بنیاد اسلامی فکر میں "نظامِ توحید" کے ذریعے رکھی گئی ہے، جو صرف عقائد کی بات نہیں کرتا بلکہ ایک جامع تمدنی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔

پہلا قدم یہ ہے کہ ان اقوام اور اداروں کی فکری غلامی سے نجات حاصل کی جائے جنہوں نے موجودہ مسائل کو پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ فکری آزادی، تاریخی شعور، اور اپنی تہذیبی شناخت کی بازیافت کو سب سے مقدم رکھا جائے۔ ہمیں اپنی تعلیم، میڈیا، معیشت، اور سیاست کو ان فکری سانچوں سے نکالنا ہوگا جن کی جڑیں مغربی استعمار میں پیوستہ ہیں۔ یہ استعمار اب صرف فوجی یا سیاسی صورت میں نہیں بلکہ سافٹ پاور، معلومات، آئیڈیالوجی، اور ثقافت کی صورت میں کام کرتا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسلامی معاشروں کو حقیقی معنوں میں قرآن و اہلبیتؑ کی ہدایت کی طرف لوٹنا ہوگا۔ صرف جذباتی مذہبیت یا رسوم کی ادائیگی کافی نہیں بلکہ ایک علمی، تدبری، اور تمدنی اسلام کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ وہ اسلام جو انسان کی فردی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو منظم کرتا ہے، عدل کو بنیاد بناتا ہے، ظلم کے خلاف مزاحمت کرتا ہے، اور معاشرتی ڈھانچے کو روحانیت، تقویٰ، اور فطرت کے اصولوں پر استوار کرتا ہے۔

اسلامی نظام کا قیام صرف نعرے بازی سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے فکری تیاری، عوامی شعور، اور صالح قیادت کی تشکیل ضروری ہے۔ وہ قیادت جو خود بھی استعمار کے آلہ کار نہ ہو، جو امانتدار ہو، فقیہ ہو، زمانے کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہو، اور اپنے معاشرے کو عالمی استعماری جال سے نکالنے کا عزم رکھتا ہو۔ اس عمل میں "ولایتِ فقیہ "کا نظریہ ایک نہایت سنجیدہ، علمی اور عملی ماڈل مہیا کرتا ہے، جیسا کہ ایران کے اسلامی انقلاب میں دیکھا گیا، جس نے پوری دنیا میں بیداری کی لہر دوڑائی اور استعمار کی بنیادوں کو چیلنج کیا۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ صرف ریاستی سطح پر تبدیلی کافی نہیں، بلکہ عوامی سطح پر اخلاقی و فکری اصلاح بھی ضروری ہے۔ کیونکہ نظام اگر بدل بھی جائے مگر عوام وہی رہیں تو کوئی حقیقی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تربیتِ نفس، اخلاقی تطہیر، اور شعور کی آبیاری کا عمل معاشرتی سطح پر جاری رہنا چاہیے۔ ہمیں تعلیم، میڈیا، مساجد، خانوادے، اور معاشرتی اداروں کو اس الٰہی انقلاب کی تربیت گاہوں میں تبدیل کرنا ہو گا۔

معاشی لحاظ سے ہمیں سودی نظام سے مکمل انقطاع اور اسلامی معاشی اصولوں پر مبنی خود کفیل ماڈل کی طرف جانا ہو گا۔ سیاسی لحاظ سے عوام کو نمائندہ حکومتوں کے بجائے امانتدار و بصیر قیادت کے انتخاب کی تعلیم دینا ہو گی۔ عدالتی نظام میں قرآن و سنت کی روشنی میں عدل و انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانا ہو گا۔ تعلیم کو سیکولر نظریے سے آزاد کر کے اسے معرفتِ الٰہی، حقیقتِ انسان، اور انسانی ذمہ داری کے اصولوں پر استوار کرنا ہو گا۔

یہ سب ایک لمبا عمل ہے، مگر جب تک ہم اس کا آغاز نہ کریں، ہم اس عالمی فریب سے نہ نکل سکیں گے۔ حل صرف نعرہ نہیں، عمل، صبر، استقامت، اور الٰہی ہدایت کی پیروی میں ہے۔ ہمیں اپنے قدم فکری استقلال، ایمانی یقین، اور اجتماعی وحدت کے ساتھ اٹھانے ہوں گے۔ تب جا کر ہم نہ صرف ان مسائل کا حل تلاش کر سکیں گے، بلکہ انسانیت کو ایک نئی راہ دکھانے والے بنیں گے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر قرآن نے بلایا، اہل بیتؑ نے قربانیاں دیں، اور جو ہمیں فکری و عملی نجات کی طرف لے جاتا ہے۔

رہبری پر تنقید: خود فریبی یا شعور کا امتحان؟

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ قیادت سے توقعات رکھتا ہے، اور جب یہ توقعات پوری نہ ہوں تو سوال بھی کرتا ہے اور شکایت بھی۔ سوال اور تنقید اگر شعور، علم اور خلوص کے ساتھ ہو تو وہ معاشروں کی تعمیر میں معاون بنتی ہے، لیکن جب یہ تنقید لاعلمی، کم فہمی اور جذباتیت پر مبنی ہو تو یہ فرد کو بھی نقصان دیتی ہے اور قوم کو بھی۔

ہمارے معاشرے میں ایک فکری کمزوری مسلسل پھیل رہی ہے: قیادت پر سطحی تبصرے اور فوری فیصلے دینا۔ کوئی بھی جلسہ ہو، محفل ہو یا آن لائن فورم، لوگ اس بات پر بات کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں کہ رہبر کو کیا کرنا چاہیے تھا، قائد کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا، یا وہ اس مسئلے کو یوں کیوں نہ حل کر سکا۔ اس عمل میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قیادت ایک مقام ہے جو صرف کرسی یا عہدہ نہیں، بلکہ ذمہ داری، علم، بصیرت، تجربہ، اور مسلسل آزمائش کا تقاضا کرتا ہے۔ قیادت پر تنقید کرنے والے افراد خود اس درجے کی فکری اور معلوماتی سطح رکھتے ہیں یا نہیں، اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔

یہ ضروری نہیں کہ رہبر معصوم ہو، نہ ہی قیادت کا مطلب یہ ہے کہ قائد سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم میں اتنا علم، فہم، تجزیہ اور بصیرت موجود ہے کہ ہم اُس انسان پر تنقید کریں جسے ایک پوری قوم نے کسی عمل، تجربے یا شعور کی بنیاد پر منتخب کیا

ہو؟ قیادت پر رائے دینا ہر شخص کا حق ہے، مگر اس حق کے ساتھ ذمہ داری بھی جڑی ہوئی ہے، اور وہ ذمہ داری ہے شعور اور علم کی۔

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے گھر کے مسائل حل نہیں کر سکتے، خاندان کے جھگڑوں میں الجھے ہوتے ہیں، محلے کے ایک کام کو منظم انداز سے نہیں چلا سکتے، وہ عالمی سطح کے فیصلوں اور قومی قیادت کی حکمت عملی پر ایسے بات کرتے ہیں گویا خود ان سے بہتر کوئی متبادل نہیں۔ یہ دراصل ایک فکری خود فریبی ہے، جس میں انسان اپنے ذاتی فکری و عملی فقر کو چھپانے کے لیے تنقید کو بطور ڈھال استعمال کرتا ہے۔

قیادت ہمیشہ ماحول، وقت، دشمن کی چالوں، دوستوں کی وفاداری، قوم کی صلاحیت، وسائل کی کمی یا زیادتی، اور دینی و اخلاقی حدود کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلے کرتی ہے۔ اس کے فیصلے بعض اوقات عوام کے جذبات سے ہم آہنگ نہیں ہوتے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فیصلے غلط یا بے بنیاد ہیں۔ ایک قائد کو ایسی اطلاعات، ایسے مشورے، اور ایسا تناظر حاصل ہوتا ہے جو عام فرد کے لیے اکثر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کو مکمل تصویر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تو وہ محض ٹکڑوں میں دیکھ کر رائے دے تو اس کی رائے کہاں تک معتبر کہی جا سکتی ہے؟

قوم کی طاقت صرف اس میں نہیں کہ وہ کسی کو قائد بنائے، بلکہ اس میں ہے کہ وہ قائد کے فیصلوں کو سمجھنے، ان پر اعتماد کرنے اور تنقیدی شعور کے ساتھ ان کا تجزیہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتی ہو۔ اگر ہم قیادت پر صرف اس وقت اعتماد کریں جب وہ ہماری خواہش کے

مطابق چلے، اور ہر وہ فیصلہ جو ہمارے جذبات کے خلاف ہو، اُسے تنقید کا نشانہ بنائیں، تو یہ نہ قیادت کا احترام ہے نہ شعور کی علامت۔ یہ صرف فکری کمزوری ہے۔

اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی اجتماعی عادتوں پر غور کریں۔ تنقید کریں ضرور، مگر علم و فہم کے ساتھ۔ سوالات اٹھائیں، مگر ان کی بنیاد خلوص اور تجزیاتی بصیرت ہو۔ رہبری کوئی جادو کی چھڑی نہیں جو پلک جھپکتے میں سب کچھ ٹھیک کر دے، اور نہ ہی قیادت کسی فرشتے کا نام ہے، مگر جب قوم کسی کو اعتماد دے کر اس منصب پر فائز کرے، تو اس کے خلاف بولنے کے لیے کم از کم اتنی صلاحیت تو ہونی چاہیے کہ خود اس درجے کا کوئی متبادل پیش کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تنقید سے زیادہ خاموشی، دعا، اور کردار کی اصلاح بہتر حکمت عملی ہے۔

تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ ہر دور میں قیادت اور رہبری کو عوام کی جانب سے تنقید کا سامنا رہا ہے۔ خواہ وہ اللہ کے منتخب کردہ انبیاء ہوں، معصوم آئمہ علیہم السلام ہوں یا ان کے بعد آنے والے صالح رہنما، لوگوں کا ایک طبقہ ہمیشہ ایسا موجود رہا جو یہ سمجھتا تھا کہ قائد کو یہ کرنا چاہیے تھا یا وہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ رویہ نہ صرف فکری کمزوری کی علامت ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی غفلت اور غرور بھی پوشیدہ ہوتا ہے—ایسا غرور جو انسان کو اس کے مقام سے بڑھا کر رائے دینے پر اکساتا ہے، خواہ اس کے پاس نہ مکمل معلومات ہوں، نہ بصیرت، نہ تقویٰ، اور نہ تجربہ۔

قرآن مجید نے اس نفسیاتی بیماری کو مختلف مقامات پر نمایاں کیا ہے۔ مثلاً سورہ توبہ کی آیت 58 میں فرمایا گیا: "وَمِنۡهُم مَّن يَلۡمِزُكَ فِي ٱلصَّدَقَٰتِ "یعنی" ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو

صدقات کی تقسیم کے بارے میں تم پر اعتراض کرتے ہیں۔ " یہاں واضح طور پر وہ لوگ مراد ہیں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت اور الٰہی رہنمائی کو نظر انداز کر کے صرف ظاہری منظرنامے پر تبصرہ کرتے تھے، گویا وہ نبی سے زیادہ سمجھ رکھتے ہوں۔ اسی طرح سورہ جمعہ کی آیت 5 میں علم کے بغیر بات کرنے والوں کو گدھے سے تشبیہ دی گئی جو کتابیں تو اٹھاتا ہے مگر ان کا فہم نہیں رکھتا۔ یہ مثال ان لوگوں کے لیے ہے جو بغیر علم اور بصیرت کے بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بارہا ایسے مواقع آئے جب لوگوں نے ان کے فیصلوں پر اعتراض کیا۔ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں فیصلہ ہو یا صلح حدیبیہ جیسے نازک موقع پر صبر کا مظاہرہ، کئی صحابہ کو ابتدا میں یہ محسوس ہوا کہ فیصلہ غلط ہوا ہے۔ مگر بعد میں وقت نے دکھا دیا کہ نبی کا فیصلہ کتنا دُور اندیشی پر مبنی تھا۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر جب بعض صحابہ خاص طور پر حضرت عمرؓ کو یہ صلح "کمزوری" لگی (سیرت ابن ہشام ، جلد 2، واقعہ حدیبیہ، تاریخ الطبری، ابو جعفر طبری، صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب صلح الحدیبیۃ) تو نبی نے فرمایا کہ یہ صلح "فتح مبین" ہے، اور قرآن نے بھی اسی صلح کو فتح مبین قرار دیا (سورۃ الفتح، آیت 1)۔ یہاں قیادت کی حکمت اور عوامی جذبات کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے دور خلافت میں بھی لوگ بار بار اعتراض کرتے تھے کہ آپ سختی کیوں نہیں برتتے، یا معاویہ سے کیوں نہیں نپٹتے، یا بعض موقعوں پر نرم رویہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قریبی افراد نے کہا کہ آپ کو سیاست نہیں آتی۔ اس

پر مولا نے نہایت جلال سے فرمایا:** "واللهِ ما معاوية بأدهى مني، ولكنه يغدر ويفجر، ولولا كراهية الغدر لكنت من أدهى الناس "** یعنی "خدا کی قسم! معاویہ مجھ سے زیادہ چالاک نہیں، وہ دھوکہ دیتا ہے اور فریب کرتا ہے، اگر خیانت اور دھوکہ دینا میرے لیے ناپسندیدہ نہ ہوتا تو میں سب سے زیادہ چالاک ہوتا۔ "(**خطبہ نمبر 200**، بعض طبعات میں یہ خطبہ 199 یا 201 کے نمبر سے بھی ملتا ہے) یہاں امیر المومنینؑ نے یہ واضح کر دیا کہ قیادت صرف چالاکی یا تدبیر کا نام نہیں، بلکہ وہ تقویٰ، اصول، شریعت اور الٰہی احکام کی پاسداری کے ساتھ ہوتی ہے۔

امام حسینؑ کے قیام کے وقت بھی بعض افراد نے یہی کہا کہ آپ کو نہیں جانا چاہیے، حالات سازگار نہیں، اہل کوفہ پر اعتماد نہیں، وقت کے حاکم سے مصالحت کر لیں۔ مگر امام نے اپنے الٰہی فریضے کی بنیاد پر فیصلہ کیا، اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ وہی فیصلہ حق اور فلاح کا راستہ تھا۔ ان تمام مثالوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ قیادت کا فیصلہ ہمیشہ فوری حالات کو دیکھ کر نہیں بلکہ گہرے فہم، بصیرت، توکل، اور تقویٰ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

آج بھی جب کسی کو قیادت کا مقام دیا جاتا ہے، تو وہ محض اکثریتی ووٹ یا ظاہری مقبولیت سے نہیں، بلکہ ایک پوری فکری، تاریخی، تجرباتی اور اخلاقی ساکھ کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جو شخص قیادت پر تنقید کرنا چاہے، اسے کم از کم اتنا شعور، علم، تقویٰ، بصیرت، تجربہ اور حالات کی آگہی تو ہونی چاہیے کہ وہ اس منصب کو سمجھ سکے۔ ورنہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی طبیب کے نسخے پر اعتراض کرے جبکہ اسے طب کا بنیادی علم بھی نہ ہو۔

اس لیے رہبری پر رائے دینے سے پہلے خود احتسابی لازم ہے۔ کیا ہم وہ عقل، وہ علم، وہ تجربہ رکھتے ہیں جس کی بنیاد پر ایک رہبر کے فیصلوں کو سمجھ سکیں؟ اگر نہیں، تو بہتر ہے کہ ہم اپنی اصلاح پر توجہ دیں، دعا کریں، علم حاصل کریں، اور امت کی بہتری کے لیے اجتماعی کردار ادا کریں، نہ کہ خود کو ہر فیصلہ پر تبصرہ کرنے کا ماہر سمجھیں۔ یہی شعور قوموں کو استحکام، وقار اور فکری بلوغت عطا کرتا ہے۔

سازشی مطالعات، نفسیاتی مسائل اور مکتب تشیع

سازشوں یا سازشی نظریات پر تحقیق و مطالعہ اس وقت تک تعمیری ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے ساتھ کسی متبادل، مثبت نظام یا حل پر غور نہ کیا جائے۔ جب انسان یا معاشرہ صرف سازشوں کے گرد سوچنا شروع کر دیتا ہے اور کسی تعمیری راستے کا تصور ذہن میں نہیں رکھتا تو وہ مایوسی اور بے عملی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت انسان کو عمل سے روک دیتی ہے اور اسے بے بسی، ناامیدی اور مسلسل شکوہ شکایت کی طرف لے جاتی ہے۔

ایسے حالات میں فرد یا قوم اپنی کوتاہیوں اور اندرونی کمزوریوں پر توجہ دینے کی بجائے ہر مسئلے کی جڑ بیرونی دشمن یا کسی خفیہ سازش کو قرار دینے لگتی ہے۔ اس طرز فکر سے حقیقت پسندی ختم ہو جاتی ہے اور خود احتسابی کا عمل رک جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں فکری جمود پیدا ہوتا ہے کیونکہ کوئی تعمیری سوچ، نظریہ یا راستہ موجود نہیں ہوتا جو انسان کو عمل کی طرف لے جائے۔

مزید یہ کہ صرف سازشوں پر توجہ دینے سے باہمی اعتماد کمزور ہوتا ہے۔ افراد اور ادارے ایک دوسرے سے بد ظن ہونے لگتے ہیں، اور معاشرے میں شکوک و شبہات اور تفرقے کی فضا جنم لیتی ہے۔ یہ سب نہ صرف فکری اور معاشرتی انتشار کا باعث بنتا ہے بلکہ انسان کی نفسیاتی صحت پر بھی منفی اثر ڈالتا ہے۔ مسلسل خوف، وسوسے اور مایوسی انسان کو ذہنی دباؤ کا شکار بنا دیتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات اس بات کی تاکید کرتی ہیں کہ برائیوں کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ بھلائی کی طرف دعوت اور اصلاحی اقدام بھی کیے جائیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: "تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے"۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ صرف برائیوں کی نشاندہی کافی نہیں بلکہ ہمیں ایک مثبت نظام، ایک اصلاحی ویژن اور تعمیرِ ملت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

لہٰذا اگر سازشی نظریات کو محض سنسنی خیزی، خوف یا الزام تراشی کی نیت سے زیرِ بحث لایا جائے اور اس کے ساتھ کوئی تعمیری مقصد یا متبادل نظام نہ ہو تو یہ طرز فکر معاشرے میں ذہنی، فکری اور اخلاقی زوال کا باعث بن سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر تنقیدی مطالعے کے ساتھ اصلاحی تصور بھی پیش نظر رکھا جائے تاکہ فکر، عمل اور نتیجہ، سب مثبت ہوں۔

اگر سازشوں یا سازشی نظریات پر تحقیق اس حالت میں کی جائے کہ انسان کے ذہن میں ایک واضح، مثبت اور متبادل نظام موجود ہو، اور وہ اس کے قیام کے لیے سنجیدہ جدوجہد بھی کر رہا ہو، تو پھر ایسے مطالعات نہ صرف مفید بلکہ انتہائی ضروری اور تعمیری ثابت ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ان تحقیقات کا مقصد صرف برائیوں کی نشاندہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے پسِ پردہ محرکات، طریقہ کار، ذہنی و ثقافتی حملوں اور اثرات کو سمجھنا ہوتا ہے تاکہ متبادل نظام کی تشکیل و تحفظ زیادہ مؤثر، بصیرت افروز اور حکمت آمیز انداز میں ہو سکے۔

ایسے مطالعے انسان کو دشمن کے طریقہ کار، منصوبہ بندی اور نفسیاتی حربوں سے واقف کرتے ہیں، تاکہ وہ صرف مدافع نہ رہے بلکہ ایک مضبوط، فکری اور عملی مزاحمت بھی

کھڑی کر سکے۔ یہ بصیرت انسان کو سادہ لوحی سے نکال کر ایک باشعور اور تدبر رکھنے والا فرد بناتی ہے جو نہ صرف خود کو بچا سکتا ہے بلکہ دوسروں کی رہنمائی کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ جب متبادل نظام ذہن میں ہوتا ہے تو سازشوں پر تحقیق ایک رہنما کے ہتھیار کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جو اسے چالاکی، گہرائی اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔

اسلامی تناظر میں بھی قرآن نے نہ صرف باطل کی پہچان کرائی بلکہ مومنین کو اس کے خلاف کھڑے ہونے، دلائل سے مقابلہ کرنے اور حق کا نظام قائم کرنے کی دعوت دی۔ پیغمبرانِ الٰہی نے جب باطل نظاموں کی سازشوں کو بے نقاب کیا تو ان کے پیشِ نظر محض مخالفت نہیں بلکہ ایک الٰہی نظام کا قیام اور اصلاحی جدوجہد تھی۔ اس لیے جب سازشی نظریات کی تحقیق، شعور اور مقصدیت کے ساتھ کی جائے تو وہ فکری پختگی، عملی حکمت، اور نظریاتی قوت پیدا کرتی ہے، جو معاشرے کی تشکیل نو میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ طرزِ مطالعہ انسان کو صرف حالات کا تجزیہ کرنے والا نہیں بلکہ تبدیلی کا محرک بناتا ہے۔

آج کے دور میں جب صہیونی سامراج اپنی فکری، ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی سازشوں کے ذریعے دنیا کو کنٹرول کرنے کی منظم کوشش کر رہا ہے، تو ان سازشوں پر تحقیق کرنا یقیناً ایک بیداری کا عمل ہے۔ لیکن اگر اس تحقیق کے ساتھ کوئی متبادل نظریہ یا نجات دہندہ راستہ موجود نہ ہو تو یہ انسان کو صرف نفرت، مایوسی اور انتقامی جذبات کی طرف لے جا سکتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں انقلابی تشیع، انسانیت کے لیے ایک روشن، باوقار اور امید افزا متبادل کے طور پر سامنے آتی ہے۔

انقلابی تشیع صرف صہیونی یا سامراجی نظام کی نفی نہیں کرتا، بلکہ وہ اثباتِ حق کا علمبردار ہے۔ یہ مکتب ہمیں صرف دشمن کو پہچاننا نہیں سکھاتا، بلکہ یہ بھی سکھاتا ہے کہ ظلم کے خلاف قیام کیسے کیا جائے، باطل کے مقابلے میں کیسا نظام قائم کیا جائے، اور انسان کو اپنی فطری عظمت سے کیسے روشناس کرایا جائے۔ انقلابی تشیع کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ دنیا ظلم سے بھر جائے گی مگر امامِ عدل کا ظہور اُسے عدل و انصاف سے بھر دے گا، اور اس عظیم تبدیلی کے مقدمات میں ہمارا شعور، عمل، قربانی اور استقامت شامل ہے۔

یہی فکر، اسلامی انقلابِ ایران کی صورت میں معاصر دنیا میں ایک زندہ مثال بن کر ابھری، جس نے صہیونی اور استعماری نظام کے مقابل ایک خداپرست، مظلوم دوست اور علم و عدل پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا۔ اس انقلابی تشیعی پلیٹ فارم نے دنیا بھر کے محروموں کو حوصلہ دیا کہ سازشوں سے ڈر کر نہیں، انہیں سمجھ کر، ایمان اور حکمت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ یہ فکر ہمیں بتاتی ہے کہ حقیقی نجات، فقط دشمن کو گالی دینے میں نہیں، بلکہ خود کو بدلنے، معاشرے کو بیدار کرنے اور عالمی سطح پر ایک عادلانہ نظام کے قیام کے لیے کردار ادا کرنے میں ہے۔

انقلابی تشیع انسان کو خوف اور مایوسی سے نکال کر، ایک ایسا زاویہ نظر عطا کرتی ہے جو اسے اپنی زندگی کو ایک مقصد، ایک مشن، اور ایک عالمی دائرہ عمل میں دیکھنے کے قابل بناتی ہے۔ وہ اسے سکھاتی ہے کہ سازشوں کو بے نقاب کرنے کے بعد ہمیں کس رخ پر قدم اٹھانا ہے، اور کس طرح ہم اپنی فکری، اخلاقی اور اجتماعی خودمختاری کو بحال کر سکتے ہیں۔ یہ ایک

بیدار فکر ہے جو نفی سے اثبات کی طرف لے جاتی ہے، اور فرد کو شکوے سے اٹھا کر شہادت، قیادت اور خدمت کے میدان میں لا کھڑا کرتی ہے۔

صہیونی سامراج آج دنیا کے تمام اہم شعبہ ہائے زندگی میں اپنی گہری سازشوں اور منظم منصوبہ بندی کے ذریعے ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جو انسان کو اس کی فطری، روحانی اور اخلاقی شناخت سے جدا کر دے۔ اس کا مقصد صرف مادی استعمار نہیں بلکہ فکری، ثقافتی اور روحانی تسلط ہے، تاکہ انسانیت کی باگ ڈور چند خفیہ اور طاقتور ہاتھوں میں رہے، اور تمام اقوام اسی کے بنائے ہوئے پیمانوں پر سوچیں، جئیں اور فیصلے کریں۔ ایسے میں اگر کوئی نظام اس فتنہ انگیز استعمار کا حقیقی اور پائیدار متبادل پیش کرتا ہے تو وہ انقلابی تشیع کی تعلیمات اور عملی نظام ہے، جو فقط نفیِ باطل پر نہیں بلکہ اثباتِ حق پر استوار ہے۔

سیاسی شعبے میں صہیونی سامراج کا انداز یہ ہے کہ وہ جمہوریت، انسانی حقوق اور عالمی امن جیسے دلکش نعروں کی آڑ میں اپنے نمائندے اقتدار میں لاتا ہے، پالیسیوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور قوموں کے فیصلوں کو اپنے مالی، فوجی اور میڈیا کے ذرائع سے کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے برعکس انقلابی تشیع ایک ایسا سیاسی نظریہ پیش کرتی ہے جو اسلام کی حاکمیت، عدل پر مبنی قیادت، اور ولایتِ فقیہ جیسے اصولوں پر قائم ہے۔ یہ نظریہ فقط حکمران کے بدلنے کا نہیں بلکہ حاکمیت کے معیار کے بدلنے کا نام ہے، جہاں قیادت کسی مفاد، خاندانی وراثت یا اکثریتی دھوکے پر نہیں بلکہ تقویٰ، علم اور عدل پر منحصر ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران اس نظام کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے، جہاں نہ صرف صہیونی سامراج کے خلاف مزاحمت کی قیادت کی جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے مظلوموں کو نظریاتی اور عملی سپورٹ فراہم کی جاتی ہے۔

اقتصادی میدان میں صہیونی سامراج نے سودی نظام، بینکاری اجارہ داری، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور عالمی مالیاتی اداروں کے ذریعے دنیا کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس نے معیشت کو چند افراد کے مفاد کا ذریعہ بنا دیا ہے، جہاں سرمایہ عام انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کے بجائے اسے غلام رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انقلابی تشیع اس کے مقابل وہ معاشی تصور رکھتی ہے جو بیت المال، خمس، زکات، وقف، اور حلال رزق کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ یہ نظام نہ صرف دولت کے ارتکاز کو روکتا ہے بلکہ محروم طبقات کو معاشی طاقت دیتا ہے اور امت کو خود کفالت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس میں دولت ایک امانت ہے، نہ کہ طاقت کا ذریعہ، اور محنت کش طبقہ عزت اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں صہیونی نظام نے ایسی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں وضع کی ہیں جو نئی نسل کو اپنی تاریخ، عقائد، اخلاق اور ہدف سے کاٹ دیتی ہیں۔ مغربی تعلیمی نظام نے سائنسی ترقی کی آڑ میں روحانیت اور الٰہی وابستگی کو غیر اہم بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا انسان تیار ہوتا ہے جو بظاہر تعلیم یافتہ ہے مگر فکری غلام ہے، جو صرف نوکری، شہرت، دولت یا جسمانی لذت کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ انقلابی تشیع کا نظریہ تعلیم، انسان کو عبدِ صالح، مجاہد، بصیر اور خادمِ خلق بنانے کے لیے ہے۔ اس میں قرآن، سیرتِ معصومین علیہم السلام، عقل، اور فطرت، علم کے بنیادی ستون ہوتے ہیں۔ یہاں تعلیم فقط روزگار کا ذریعہ نہیں بلکہ تربیتِ نفس، خدمتِ خلق، اور آمادگیِ قیامِ عدل کا وسیلہ ہے۔

میڈیا اور ثقافت میں صہیونی سازش سب سے زیادہ گہری ہے۔ فلم، موسیقی، سوشل میڈیا، خبروں اور ڈراموں کے ذریعے وہ ایسی ثقافت پھیلا رہا ہے جو فحاشی، تشدد، مادہ پرستی، انفرادیت اور لذت پرستی کو فروغ دیتی ہے۔ اس کا ہدف یہ ہے کہ انسان اپنی فطری شرم، حیا، وفا، قربانی، اور روحانی اقدار کو فراموش کر دے، اور وہ صرف ایک صارف، ایک تماشائی یا ایک ذہنی غلام بن کر رہ جائے۔ انقلابی تشیع اس کے جواب میں ایسی ثقافت کو فروغ دیتی ہے جو عزت، غیرت، دین، شہادت، علم، خدمت، اور بیداری پر مبنی ہو۔ اسلامی انقلاب نے میڈیا کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے اسے انسان سازی کا ذریعہ بنایا، جس کا مقصد معاشرتی تربیت، حق گوئی، باطل کا انکار، اور مظلوموں کی آواز کو دنیا تک پہنچانا ہے۔

عورت کے مقام کے حوالے سے صہیونی سامراج نے یا تو اسے ایک جنسی شے کے طور پر پیش کیا، یا ایک بے ہدف فرد کے طور پر جو آزادی کے نام پر خاندان، نسل اور تربیت جیسے فطری فرائض سے دور ہو جائے۔ جبکہ انقلابی تشیع عورت کو ایک باوقار، باحیا، باضمیر، باعلم اور فعال شخصیت کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شخصیت ایک کامل ماں، بیوی، بیٹی، داعیہ اور مظلوموں کی وکیل کے طور پر عورت کے مقام کو واضح کرتی ہے۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی کربلائی و کوفی و شامی قیادت انقلابی تشیع میں عورت کے فعال کردار کی دلیل ہے، جہاں وہ نہ صرف صبر و حیا کی علامت ہے بلکہ ظلم کے خلاف قیام کی علمبردار بھی ہے۔

عدالتی نظام میں صہیونی دنیا کا انداز یہ ہے کہ قوانین طاقتوروں کے تحفظ کے لیے ہوتے ہیں اور کمزوروں پر لاگو کیے جاتے ہیں۔ عدالتیں انصاف نہیں بلکہ مفاد کی محافظ بن گئی ہیں، اور جج صاحبان، سیاسی اور سرمایہ دارانہ دباؤ کے تحت فیصلے کرتے ہیں۔ انقلابی تشیع اس کے برعکس ایک ایسا عدالتی نظام پیش کرتی ہے جہاں قاضی کو تقویٰ، علم، بصیرت، اور خوفِ خدا سے آراستہ ہونا لازمی ہے، جہاں عدل کا مطلب ہر فرد کو اس کا حق دینا اور ظلم کے تمام راستے بند کرنا ہے۔ امام علی علیہ السلام کا عدالتی سسٹم اس کا عملی نمونہ ہے جہاں خلیفہ وقت کو بھی عام شہری کی طرح قاضی کے سامنے پیش ہونا پڑا۔

یہ تمام مثالیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ انقلابی تشیع، محض ردِ سامراج یا احتجاجی فکر نہیں، بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو انسان کو اس کی اصل، مقصد، عظمت اور ذمہ داریوں سے روشناس کراتا ہے۔ یہ نظام محض نظریہ نہیں بلکہ ایک عملی لائحہ عمل ہے، جو دنیا میں اللہ کی حاکمیت، انسانی کرامت، اور اجتماعی عدل کی بحالی کے لیے ایک عالمی تحریک کی صورت میں اُبھر رہا ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جس پر چل کر ہم نہ صرف سامراجی سازشوں کا شعور حاصل کرتے ہیں بلکہ ایک روشن، فطری اور خدائی متبادل کے قیام کی طرف بھی قدم بڑھاتے ہیں۔

حکمت متعالیہ اور انقلاب اسلامی ایران

فلسفہ مشاء اور اشراق اسلامی فلسفے کی دو اہم مکتبہ فکر ہیں جن کا آغاز مختلف فلسفیوں نے کیا۔ "فلسفہ مشاء" کا آغاز "ابن سینا" نے کیا، جس میں عقل اور فلسفے کے ذریعے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ ابن سینا کا فلسفہ مابعد الطبیعات (Metaphysics) اور منطق پر مبنی تھا، جس میں عقل کو تمام حقیقتوں کے سمجھنے کا اہم ذریعہ قرار دیا گیا۔ مشاء فلسفہ میں یہ باور کیا جاتا ہے کہ عقل کی مدد سے عالمِ خارج میں موجود ہر چیز کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف، "فلسفہ اشراق" کا آغاز" شیخ شہاب الدین سہروردی (شیخ اشراق)" نے کیا، جو مشائی فلسفے کی مخالفت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے تھے کہ روحانی تجارب اور معقولات کے ذریعے حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اشراق فلسفے میں نظریاتی حقیقتوں کے بجائے تجرباتی اور روحانی علم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس فلسفے کا مقصد عالمِ نور کو سمجھنا اور عقل کے علاوہ مشاہدہ اور شہود کو بھی حقیقت کا حصہ سمجھنا ہے۔

"حکمت متعالیہ"، جو "ملاصدرا" نے پیش کی، مشائی اور اشراقی فلسفے کا امتزاج ہے۔ ملاصدرا نے یہ موقف اختیار کیا کہ عقل اور وحی دونوں کا ایک ساتھ استعمال انسان کو مکمل حقیقت تک پہنچا سکتا ہے۔ انہوں نے توحید اور روحانیت کے تصورات کو فلسفے میں ضم کیا، جس کی وجہ سے حکمت متعالیہ کو ایک جدید فلسفی نظام سمجھا جاتا ہے، جو فرد کی روحانی ترقی اور علمی بصیرت کے مابین ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

اسلامی انقلاب ایران (1979) نے حکمت متعالیہ اور سماجیات کے عملی ادغام کی ایک زندہ اور قابل توجہ مثال پیش کی ہے۔ انقلاب کے بعد ایران نے اسلامی اصولوں کو اپنے معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی نظام میں عملی طور پر نافذ کیا، جس کے ذریعے حکمت متعالیہ کے فلسفے کو فرد کی روحانیت اور اجتماعی بہبود کے درمیان توازن قائم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ حکمت متعالیہ، جو ملا صدرا کے فلسفے پر مبنی ہے، نے وجود اور روحانیت کے تصورات کو سماجی سطح پر لاگو کیا، اور ایران میں امام خمینی کے رہنمائی میں ان اصولوں کا اطلاق کیا گیا۔ امام خمینی نے ولایت فقیہ کے نظریے کو اپنایا، جس کا مقصد دینی رہنمائی کے ساتھ سیاسی قیادت کی ہم آہنگی کو یقینی بنانا تھا۔

ایران نے انقلاب کے بعد اپنے حکومتی امور میں حکمت متعالیہ کے فلسفے کو نافذ کیا، جہاں عقل اور وحی دونوں کو ہم آہنگ کیا گیا۔ ولایت فقیہ کی بنیاد پر ایران میں ایک اسلامی جمہوریت قائم کی گئی جس میں فرد کی روحانیت اور اجتماعی بہبود دونوں کا لحاظ رکھا گیا۔ یہ حکمت متعالیہ کے فلسفے کا عملی اظہار تھا جس نے اسلامی احکام کے تحت حکومت کے مختلف شعبوں میں ایک توازن قائم کیا۔

معاشی نظام میں ایران نے سرمایہ داری اور سوشلسٹ ماڈلز کے بجائے ایک اسلامی اقتصادی ماڈل اپنایا، جس میں فرد کی روحانیت اور اخلاقی ترقی کو اہمیت دی گئی۔ ایران نے اسلامی مالیاتی اصولوں جیسے زکوۃ، خمس، اور وقف کو اپنے اقتصادی ماڈل میں شامل کیا، جس کا مقصد فرد کی روحانی ترقی اور سماجی بہبود کو یکجا کرنا تھا۔ اس اقتصادی ماڈل میں فرد کو صرف مادی فوائد کی نہیں بلکہ روحانی سکون اور اخلاقی ترقی کی اہمیت دی گئی۔

تعلیمی نظام میں بھی ایران نے حکمت متعالیہ کے اصولوں کو اپنایا۔ ایرانی حکومتی اقدامات میں دینی تعلیمات اور سائنس کو یکجا کیا گیا، تاکہ طلباء کی فکری اور روحانی تربیت دونوں ممکن ہو سکے۔ ایران نے اپنے تعلیمی اداروں میں اسلامی تعلیمات کو مرکزی حیثیت دی اور ان کے ساتھ عالمی علوم کو شامل کیا، تاکہ نہ صرف عقل کو فروغ دیا جا سکے بلکہ روحانیت کو بھی اہمیت دی جا سکے۔

ایران میں عدلیہ اور قانونی نظام میں بھی حکمت متعالیہ کے فلسفے کا اثر واضح تھا۔ ایران میں اسلامی شریعت اور عقلی استدلال دونوں کو ملایا گیا تاکہ معاشرتی عدل اور انصاف کے قیام کو یقینی بنایا جا سکے۔ اسلامی عدالتوں میں فرد کے روحانی حقوق کے ساتھ اس کی مادی ضروریات کا بھی خیال رکھا گیا، اور عدلیہ میں فیصلے ایسے کیے گئے جو فرد کی روحانی ترقی اور اجتماعی بہبود کے لیے فائدہ مند ہوں۔

سماجیات کے شعبے میں ایران نے حکمت متعالیہ کو سماجی تعلقات اور اخلاقیات کے تناظر میں نافذ کیا۔ انقلاب کے بعد، ایران میں خاندانی نظام، سماجی تعلقات، اور اجتماعی یکجہتی پر زور دیا گیا۔ حکمت متعالیہ کی تعلیمات نے افراد کو یہ سکھایا کہ ان کا روحانی سفر نہ صرف ذاتی ہے بلکہ اس کا اثر سماج پر بھی پڑتا ہے، اور سماجی تعلقات کو اخلاقی اور روحانی سطح پر جوڑا گیا۔

اسلامی انقلاب ایران نے حکمت متعالیہ اور سماجیات کے عملی ادغام کی کامیاب مثال پیش کی، جہاں حکمت متعالیہ کے فلسفے کو سیاست، معیشت، تعلیم، عدلیہ، اور سماج کے تمام شعبوں میں ایک ساتھ لاگو کیا گیا۔ ایران میں حکومتی نظام نے فرد کی روحانیت اور سماجی بہبود کے درمیان توازن قائم کیا، اور اس کے ذریعے ایک ایسا ماڈل تشکیل دیا گیا جس میں فرد کی مادی

اور روحانی ترقی دونوں کو ہم آہنگ کیا گیا۔ اس ماڈل نے اسلامی جمہوریت، اقتصادی نظام، تعلیمی نظام، عدلیہ، اور سماجی تعلقات کے شعبوں میں ایک نئی روشنی ڈالی جو آج بھی ایک اہم حوالہ سمجھا جاتا ہے۔

حکمت متعالیہ اور سائنسی طریق میں بظاہر دو مختلف زاویے نظر آتے ہیں، ایک روحانی اور مابعد الطبیعاتی حقیقتوں کی تلاش کا ذریعہ ہے، جبکہ دوسرا مادی اور حسی مشاہدے پر مبنی ہے۔ تاہم ان دونوں کو ایک جامع فکری نظام کے تحت ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حکمت متعالیہ خود عقل، شہود اور وحی کو ایک ساتھ ملا کر حقیقت کی جامع تفہیم کا راستہ دکھاتی ہے۔ سائنسی طریق مشاہدہ، تجربہ، اور قابل تصدیق دلائل پر انحصار کرتا ہے، جو کہ عالم طبیعت کے دائرے تک محدود ہے، لیکن حکمت متعالیہ اس طبیعی علم کو اس کے مابعد الطبیعاتی پس منظر میں رکھ کر ایک گہرے معنی اور مقصد سے جوڑ دیتی ہے۔ اس ادغام کا مقصد یہ نہیں کہ سائنسی طریق کو رد کر دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ سائنسی معلومات اور نتائج کو ایک اعلیٰ حکمت کے تناظر میں دیکھا جائے، جہاں علم صرف مادی فائدے یا ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ حقیقت کی دریافت، مقصدِ حیات کی فہم، اور انسان کے روحانی ارتقاء کے لیے استعمال ہو۔ حکمت متعالیہ انسان کو صرف اشیاء کی حقیقت جاننے کی ترغیب نہیں دیتی بلکہ حقیقتِ وجود اور خدا کی طرف سفر کی دعوت دیتی ہے، اور سائنسی طریق اسی سفر کا ابتدائی زینہ بن سکتا ہے اگر اسے ایک اعلیٰ معنوی افق کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ اس لیے حکمت متعالیہ اور سائنسی طریق کا ادغام ایک ایسے فکری ماڈل کی تشکیل کر سکتا ہے جو نہ صرف مادی ترقی کو سراہتا ہے بلکہ اس کے اخلاقی، روحانی اور وجودی پہلوؤں کو بھی شامل کرتا ہے۔

ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد علمی و تحقیقی اداروں میں یہی کوشش کی گئی کہ دینی حکمت اور سائنسی علوم کے درمیان ربط قائم کیا جائے تاکہ علم ایک ہمہ گیر حقیقت کی جانب رہنمائی کرے، نہ کہ صرف ایک تخصصی یا سطحی عمل ہو۔

علمی, فکری جنگ کی اہمیت وافادیت

جہادِ تبیین، یعنی حقائق کو واضح کرنا، فکری اور نظریاتی میدان میں باطل کا مقابلہ کرنا، اسلامی تعلیمات میں انتہائی اہم مقام رکھتا ہے۔ نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں ہمیں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جہاں انھوں نے فکری اور نظریاتی جہاد کو محض عسکری تصادم سے زیادہ اہمیت دی۔ ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق، تعلیم و تربیت کا جہاد تلوار کے جہاد پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کا بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ تلوار کا جہاد عارضی ہوتا ہے اور مخصوص حالات میں کیا جاتا ہے، جبکہ جہادِ تبیین ہمیشہ جاری رہتا ہے اور پوری انسانی تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جہاد تبیین ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

اگر کسی قوم کے عقائد، نظریات اور افکار درست بنیادوں پر استوار ہوں، تو وہ ہر قسم کے چیلنجز کا سامنا کر سکتی ہے، لیکن اگر ذہنی غلامی مسلط کر دی جائے، تو کوئی بھی عسکری طاقت اسے بچا نہیں سکتی۔ اسی لیے قرآن میں بھی حق کے واضح بیان (تبیین) کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" (اور ان سے قرآن کے ذریعے بڑا جہاد کرو)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فکری جنگ، جو دلیل، برہان اور حقائق کی روشنی میں لڑی جاتی ہے، ایک عظیم جہاد ہے جو صرف ایک نسل تک محدود نہیں رہتا بلکہ صدیوں تک اثر رکھتا ہے۔

جہادِ تبیین کی فوقیت اس لیے بھی ہے کہ یہ انسان کی فکری آزادی کو یقینی بناتا ہے۔ اگر فکری اور نظریاتی طور پر ایک انسان غلام بنا دیا جائے، تو وہ خود اپنی بربادی کا سبب بن جاتا ہے، چاہے اس کے پاس عسکری طاقت ہی کیوں نہ ہو۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "جب عقل مغلوب ہو جائے تو بدن کا قوی ہونا کسی کام کا نہیں"۔ یعنی اگر نظریاتی اساس کمزور ہو، تو جسمانی طاقت بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استعمار ہمیشہ سب سے پہلے فکری غلامی مسلط کرتا ہے تاکہ تلوار اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہر انقلاب اور ہر بڑی تبدیلی کی بنیاد جہادِ تبیین تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے قیام کو ہی دیکھ لیں؛ انھوں نے اپنی شہادت سے قبل اپنے خطبات کے ذریعے معاملات کی وضاحت فرمائی۔ یزیدی ظلم کے خلاف تلوار تو بعد میں اٹھائی بلکہ اس سے زیادہ اہم کام وہ یہ کہ اگر ہمشیرہ و فرزند امام حسین ع کے خطبات کے ذریعے تبیین نہ ہوتی، تو آج بھی یزیدی افکار غالب ہوتے, امام سجاد علیہ السلام اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے کوفہ و شام میں جو خطبات دیے، وہ تلوار سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئے اور تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

آج کے دور میں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔ میڈیا، تعلیمی نظام، اور سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے ذہنوں کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اگر مسلمان صرف عسکری طاقت پر بھروسا کریں اور فکری و نظریاتی جنگ کو نظر انداز کر دیں، تو وہ ہمیشہ مغلوب رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری جہاد کو اصل فوقیت حاصل ہے، کیونکہ یہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ایک قوم کس سمت میں ترقی کرے گی۔

لہٰذا، جہادِ تبیین محض ایک نظریاتی بحث نہیں، بلکہ یہ وہی جنگ ہے جو تمام جہادوں کی اساس ہے۔ اگر ذہنوں کو آزاد نہ کرایا جائے، اگر سچ کو چھپنے دیا جائے، اگر باطل کے دلائل کا رد نہ کیا جائے، تو ظاہری فتح بھی اندرونی شکست میں بدل جاتی ہے۔ اس لیے تعلیم و تربیت، شعور و آگاہی، اور فکری مزاحمت ہی وہ اصل جہاد ہے جو ایک ملت کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے۔

جنگ نرم آج کے دور کی سب سے پیچیدہ اور مؤثر جنگ ہے، جس کا میدان نہ سرحدوں پر ہے، نہ توپ و تفنگ کی گھن گرج میں، بلکہ ذہنوں، نظریات اور ثقافتی رویّوں میں ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جو الفاظ، تصورات، نظریات، میڈیا، اور تعلیم کے ذریعے لڑی جاتی ہے۔ اس کا مقصد قوموں کی فکری، ثقافتی اور تہذیبی شناخت کو یا تو مضبوط کرنا ہوتا ہے یا انہیں شکست دے کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنا۔ جو قوم اس حقیقت کو نہیں سمجھتی، وہ اپنی بقاء کو خطرے میں ڈال دیتی ہے، کیونکہ آج کی دنیا میں طاقتور وہی ہے جو فکری محاذ پر غالب ہو۔

جو لوگ اس جنگ کو حقارت سے "ڈرائنگ روم کا جہاد" کہتے ہیں، وہ یا تو اس کی حقیقت سے نابلد ہیں یا پھر ان کے اندر خود کوئی فکری اور نظریاتی کمزوری ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا میں ہونے والی بڑی تبدیلیاں ہمیشہ میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ ذہنوں میں برپا ہوتی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ نظریات کی طاقت نے تخت الٹائے، سلطنتیں گرائیں، اور نئی تہذیبوں کی بنیاد رکھی۔ قرآن بھی فکری جہاد کو بہت بلند مقام دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: "وَجَاهِدُهُمْ بِهِ جِهَادًا کَبِیرًا" (اور ان سے قرآن کے ذریعے بڑا جہاد کرو)۔ یعنی حق کی وضاحت، باطل کا رد، اور فکری میدان میں دشمن کا مقابلہ ایک عظیم جہاد ہے۔

ایسے لوگ جو اس جنگ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور طعن و طنز کرتے ہیں، درحقیقت ان کے اندر خود کوئی فکری استقامت نہیں ہوتی۔ وہ احساسِ کمتری، بے حسی، یا کسی مخصوص ذہنی جمود میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انہیں شاید اس بات کا شعور نہیں کہ آج دنیا میں میڈیا، فلم، نصابِ تعلیم اور سوشل نیٹ ورکس کے ذریعے ذہنوں کو تبدیل کیا جا رہا ہے، اور جو لوگ اس کا ادراک رکھتے ہیں اور اس کے خلاف کام کرتے ہیں، وہی دراصل حقیقی مجاہد ہیں۔ طنز کرنے والے درحقیقت یا تو شعوری طور پر مغلوب ہو چکے ہوتے ہیں یا ان کے اندر خود کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لیے وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو اپنی استطاعت کے مطابق اس میدان میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نرم جنگ کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ہر شخص، چاہے وہ عالم ہو یا طالب علم، صحافی ہو یا لکھاری، استاد ہو یا فنکار، اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہی اس کی طاقت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا خطرہ بھی، کیونکہ اگر یہ جنگ نظر انداز کر دی جائے تو قوموں کے عقائد، تہذیب اور اقدار دھیرے دھیرے دشمن کی مرضی کے مطابق ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نرم جنگ کا مقابلہ کرنے والے ہمیشہ تاریخ میں روشن کردار کے حامل ہوتے ہیں، جبکہ ان پر طنز کرنے والے یا تو وقت کے ساتھ بے اثر ہو جاتے ہیں یا خود اسی مغلوبیت کا شکار ہو جاتے ہیں جسے وہ ابتدا میں مذاق سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

انسانی شخصیت سے باطل کو کھرچ دینے والے ذرائع

انسانی مجرد وجود دو اہم شعبوں میں تقسیم ہے ایک ذہن اور دوسرا قلب، یہ دونوں اتنے اہم ہیں کہ اگر ایک سے بھی غفلت کریں تو زندگی جہنم کا نمونہ بننے میں دیر نہیں لگاتی۔ ذہن وہ مرکز ہے جہاں انسان کے خیالات، تجزیے اور منطقی فیصلے تشکیل پاتے ہیں۔ یہ علم، حکمت، اور عقل کا سرچشمہ ہے۔ اگر ذہن بیدار ہو لیکن قلب غافل ہو تو انسان محض ایک مشین کی مانند بن جاتا ہے، جو احساسات اور روحانی بالیدگی سے محروم ہوتی ہے۔ قلب جذبات، روحانی کیفیات، محبت، نفرت، خوف اور امید کا مرکز ہے۔ اگر قلب بیدار ہو مگر ذہن غفلت میں ہو تو انسان جذبات کی رو میں بہہ کر ایسے فیصلے کر سکتا ہے جو عقل و حکمت سے عاری ہوں۔ خالق نے دین اسلام کے ذریعے اور وسیلے سے اپنی احسن ترین خلقت "انسان" کو کامیاب بننے کیلئے ان دونوں کی ہدایت کیلئے راہ حل عطا فرمایا۔ اس مادی دنیا میں سب سے بڑی آزمائش ان دونوں وجودوں کی ہے اور اسی سبب حکیم مطلق نے اس کا تدارک فرمایا۔

قرآن کی تلاوت انسان کی فکر، شعور اور طرزِ زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ حکمت اور نور کی وہ روشنی ہے جو ذہن کی تاریکیوں کو دور کرتی ہے اور انسانی شعور کو بلندی عطا کرتی ہے۔ دنیا ایک وسیع معلوماتی سمندر ہے جہاں ہر لمحہ نت نئے خیالات، نظریات اور تصورات کا سیلاب آتا رہتا ہے۔ اس سیلاب میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، مفید اور مضر نظریات کی پہچان ایک مشکل امر بن جاتی ہے۔ ہر طرف سے متضاد

خیالات، مختلف فلسفے، متنوع ثقافتی اثرات اور رنگ برنگی آراء انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک ایسی کسوٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان تمام چیزوں کو پرکھ کر انسان کے لیے صحیح راستہ متعین کرے۔

تلاوتِ قرآن محض الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ ایک گہرا نفسیاتی اور ذہنی تجربہ ہے جو انسانی شعور اور لاشعور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب انسان قرآن کی تلاوت کرتا ہے، تو اس کے دماغ میں الفاظ کی صوتیات، معانی اور جذباتی اثرات ایک مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کرتے ہیں، جسے cognitive psychology کے اصولوں سے سمجھنا ممکن ہے۔

علمِ ادراک (cognitive psychology) کے مطابق، انسانی ذہن میں معلومات کی پروسیسنگ کئی مراحل سے گزرتی ہے، جن میں توجہ، ادراک، یادداشت، اور فہم شامل ہیں۔ تلاوتِ قرآن میں سب سے پہلے توجہ کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص قرآن کی آیات کو غور سے پڑھتا ہے، تو اس کی توجہ غیر ضروری خیالات سے ہٹ کر متن پر مرکوز ہو جاتی ہے، جسے "focused attention" کہا جاتا ہے۔ یہ توجہ انسانی دماغ میں executive functions کو متحرک کرتی ہے، جو سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ سازی کے عمل کو بہتر بناتی ہیں۔

ادراکی نفسیات کے مطابق، جب انسان کسی نئے مفہوم کو دہراتا ہے، تو وہ اس کے ذہن میں زیادہ دیر تک محفوظ رہتا ہے، جسے "rehearsal effect" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت، بالخصوص جب مسلسل دہرائی جاتی ہے، انسانی یادداشت کو مضبوط بناتی ہے۔ قرآنی آیات میں موجود الفاظ اور ان کے مخصوص صوتی آہنگ دماغ کے

"phonological loop" کو متحرک کرتے ہیں، جو زبانی معلومات کو یاد رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا قرآن سے گہرا تعلق ہوتا ہے، ان کی working memory زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے۔

مزید بر آں، تلاوت کا اثر انسانی جذبات پر بھی پڑتا ہے۔ قرآن کی آیات میں موجود معنوی گہرائی، انسانی سوچ کے پیٹرن (cognitive patterns) پر اثر انداز ہوتی ہے، جسے "schema theory" کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب انسان بار بار قرآن پڑھتا ہے، تو اس کے ذہن میں ایک نیا "schema" بنتا ہے، جو دنیا کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن کی تلاوت مستقل کرنے والے افراد کا طرزِ فکر (cognitive framework) ایک مخصوص ترتیب میں آ جاتا ہے، جو انہیں بہتر فیصلہ سازی، استدلال، اور جذباتی استحکام فراہم کرتا ہے۔

قرآن کی تلاوت صرف دماغی نہیں بلکہ لاشعوری سطح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی مخصوص تحریکی (stimulus) کو بار بار سنتا یا دہراتا ہے، تو وہ اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے، جسے "priming effect" کہا جاتا ہے۔ تلاوتِ قرآن ایک قسم کی روحانی priming ہے، جو ذہنی فریم کو مثبت طور پر ترتیب دیتی ہے، اور انسانی افعال و اعمال کو ایک مخصوص رخ پر ڈالتی ہے۔

نیز، قرآن کی تلاوت تناؤ (stress) اور اضطراب (anxiety) کو کم کرنے میں بھی مدد دیتی ہے، کیونکہ اس عمل کے دوران دماغ کے اندرونی سکون کے لیے ذمہ دار ہارمونس، جیسے کہ dopamine اور serotonin ، کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

قرآن سننے یا پڑھنے سے اکثر لوگ سکون اور طمانیت محسوس کرتے ہیں، جو "cognitive relaxation" کا نتیجہ ہوتا ہے۔

علمِ ادراک کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی تلاوت محض ایک مذہبی عمل نہیں، بلکہ انسانی دماغ اور نفسیات کے لیے ایک گہری تربیت بھی ہے، جو سوچنے، سمجھنے، یادداشت کو مضبوط کرنے، جذباتی توازن قائم رکھنے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کے عمل میں مدد دیتی ہے۔

قرآن وہ معیار اور میزان فراہم کرتا ہے جس کی روشنی میں انسان حق اور باطل کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ جب انسان قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس کے معانی میں غور و فکر کرتا ہے، تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ کون سا نظریہ حقیقت پر مبنی ہے اور کون سا محض دھوکہ و فریب ہے۔ قرآن ہر دور کے باطل نظریات کی نشاندہی کرتا ہے اور سچائی کے ایسے اصول بیان کرتا ہے جو کسی زمانے میں بھی متغیر نہیں ہوتے۔ یہ کتاب انسان کو سوچنے، سمجھنے اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا سلیقہ سکھاتی ہے، اور اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی فکری بنیادوں کو مضبوط کر سکے۔

قرآن کی تلاوت صرف معلومات دینے کا ذریعہ نہیں بلکہ فکری اور شعوری طہارت بھی عطا کرتی ہے۔ انسانی ذہن میں کئی طرح کی فکری آلائشیں، شکوک و شبہات، تعصبات اور غیر حقیقی خیالات جمع ہو جاتے ہیں جو سوچنے کی صلاحیت کو کمزور کر دیتے ہیں۔ دنیاوی نظریات کی کثرت اور مسلسل پروپیگنڈہ انسان کے اندر الجھنیں اور بے یقینی پیدا کرتا ہے۔ قرآن ان الجھنوں کو ختم کر کے ذہن کو صاف اور سوچ کو شفاف کرتا ہے۔ جب انسان قرآن کو

دل کی گہرائیوں سے پڑھتا ہے، تو اس کا باطن منور ہو جاتا ہے، اس کی عقل میں بصیرت آ جاتی ہے اور وہ واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے کہ کون سی راہ حقیقت کی ہے اور کون سی گمراہی کی طرف لے جانے والی ہے۔

قرآن کی تلاوت شعور کو اس درجے پر لے جاتی ہے جہاں انسان صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ ہر چیز کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے معانی کو سمجھنے لگتا ہے، نظریات کے پس پردہ حقائق کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، اور دنیا کے فریب سے بچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ قرآن کے پیغام کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ نہ صرف فکری لحاظ سے مضبوط ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی بصیرت بھی ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر بات کو حق اور باطل کے پیمانے پر پرکھنے کے عادی بن جاتے ہیں۔

قرآن کی تلاوت انسان کے لیے مسلسل ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ جب ذہن میں وسوسے، شکوک، یا غیر یقینی کیفیت پیدا ہوتی ہے، تو قرآن کی تلاوت اسے دور کر کے یقین، اطمینان اور فکری وضاحت عطا کرتی ہے۔ یہ کتاب انسان کو اپنی اصل حقیقت سے روشناس کراتی ہے، اسے دنیا کی چکا چوند سے نکال کر اس کے حقیقی مقصد کی طرف متوجہ کرتی ہے، اور اسے ایک ایسی ذہنی اور فکری طہارت عطا کرتی ہے جو اسے ہر باطل نظریے اور ہر فکری آلودگی سے محفوظ رکھتی ہے۔

قرآن معلومات کے بے کراں سمندر میں وہ تلوار ہے جو باطل نظریات کو کاٹ کر حق اور سچائی کا راستہ واضح کرتی ہے۔ دنیا میں ہر دور میں مختلف فلسفے، نظریات اور عقائد جنم لیتے رہے ہیں، جن میں سے کچھ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور کچھ محض فریب اور دھوکہ ہوتے

ہیں۔ انسان کے لیے ان سب میں فرق کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا، کیونکہ باطل اکثر حق کا لبادہ اوڑھ کر آتا ہے۔ جدید دنیا میں، جہاں معلومات کی فراوانی ہے، وہاں حق اور باطل میں تمیز کرنا مزید مشکل ہو گیا ہے۔ ہر طرف نت نئے نظریات، سوشل میڈیا کا پروپیگنڈا، سیکولر ازم، لبرل ازم، اور مختلف فکری تحریکیں انسانی ذہن کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، اور اکثر لوگ ان نظریات کے دھارے میں بہہ جاتے ہیں۔

ایسے میں قرآن ایک ایسی الٰہی تلوار کی حیثیت رکھتا ہے جو باطل نظریات کے پردے چاک کر دیتی ہے اور حق کی روشنی کو واضح کر دیتی ہے۔ قرآن خود اپنے متعلق فرماتا ہے کہ یہ فرقان ہے، یعنی حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا۔ یہ کتاب ان تمام نظریات کو پرکھنے کا معیار مہیا کرتی ہے جو انسانی ذہن پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو شخص قرآن کی روشنی میں سوچتا ہے، وہ ہر نئے نظریے کو اس کے اصولوں پر پرکھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ آیا کوئی نظریہ حقیقت پر مبنی ہے یا محض دھوکہ ہے، آیا کوئی فلسفہ انسان کی فلاح کے لیے ہے یا اسے گمراہ کرنے کے لیے۔

قرآن صرف یہ نہیں کہ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا سکھاتا ہے، بلکہ یہ باطل کے خلاف ایک عقلی اور فکری ہتھیار بھی فراہم کرتا ہے۔ جب باطل نظریات اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، تو قرآن کے اصول ان کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، دنیاوی فکری تحریکیں انسان کو مادیت، خود غرضی، اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی طرف مائل کرتی ہیں، جبکہ قرآن ان سب کی حقیقت کھول کر بیان کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ اصل کامیابی اور فلاح تقویٰ، صبر، اور خدا کی اطاعت میں ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کو اپنی فکری بنیاد بنایا، وہ ہر باطل نظریے کے خلاف ایک چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ قرآن کے ساتھ رہنے والا کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ کتاب وہ نور ہے جو اندھیروں کو چیر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے ماننے والوں نے ہمیشہ علم، منطق اور دلیل کے ذریعے باطل نظریات کا مقابلہ کیا اور دنیا پر یہ ثابت کیا کہ سچائی وہی ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔

آج کے دور میں، جب کہ میڈیا اور انٹرنیٹ کے ذریعے نظریاتی حملے زیادہ شدید ہو چکے ہیں، قرآن کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اگر انسان قرآن کو اپنا معیار بنا لے، تو وہ ہر قسم کے فکری حملے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی تلوار ہے جو ہر اس بات کو کاٹ دیتی ہے جو انسان کو اللہ سے دور لے جانے والی ہو، اور ہر اس نظریے کو رد کر دیتی ہے جو حقیقت کے خلاف ہو۔ جو لوگ قرآن کو سمجھ کر اپناتے ہیں، وہ کسی بھی فکری فریب کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ دنیا کو حقیقت کی روشنی دکھانے والے بن جاتے ہیں۔

نماز اور روزہ انسان کے جذبات اور احساسات کی تطہیر کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اگرچہ فکری درستگی ضروری ہے اور عقل و منطق کی روشنی میں انسان حق و باطل میں فرق کر سکتا ہے، لیکن جب تک احساسات اور جذبات کی تربیت نہ ہو، صرف فکری اصلاح کافی نہیں ہوتی۔ انسان کی عملی زندگی میں جذبات اور احساسات کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے، اور اگر یہ غیر متوازن ہوں تو فکری بلندی کے باوجود انسان عملی طور پر گمراہی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ نماز اور روزہ ایسی مشق کراتے ہیں جو قلبی احساسات اور جذبات کو قرآنی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

نماز ایک مسلسل تربیت ہے جو انسان کو اللہ کے قریب کرتی ہے اور اس کے جذباتی وجود کو متوازن بناتی ہے۔ جب انسان دن میں پانچ مرتبہ اللہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے، تو وہ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر ایک اعلیٰ حقیقت سے جُڑ جاتا ہے۔ یہ تعلق اس کے دل کو سکون بخشتا ہے اور اس کے جذبات کو پاکیزہ بناتا ہے۔ جو انسان حقیقی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، وہ دنیا کی بے چینیوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کا دل اللہ کی محبت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ نماز میں قرآنی آیات کی تلاوت اور دعائیں انسان کے جذبات کو ایک بلند تر مقصد کے تابع کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں احساسات میں اعتدال اور جذبات میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح، روزہ انسان کی جذباتی تربیت کا ایک عملی درس ہے۔ بھوک اور پیاس کی شدت میں بھی اللہ کی رضا کو مقدم رکھنا انسان کے صبر، استقامت، اور قوتِ برداشت کو بڑھاتا ہے۔ روزہ صرف کھانے پینے سے رک جانے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی مشق ہے جو انسان کو اپنی خواہشات پر قابو پانے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی تربیت دیتی ہے۔ روزہ رکھنے والا شخص اپنی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہوئے دوسروں کے درد کو محسوس کرنا سیکھتا ہے، اور اس میں ہمدردی، ایثار اور قربانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

اگر کسی شخص کی فکر قرآنی تعلیمات کے مطابق ہو لیکن اس کے جذبات اور احساسات بے لگام ہوں، تو وہ اپنی عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نماز اور روزہ ایک ایسی مشق کے طور پر دیے گئے ہیں جو انسان کے جذبات کو فکری شعور کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ نماز کے ذریعے انسان کی روحانی وابستگی مضبوط ہوتی ہے اور اس کے

احساسات اللہ کی محبت میں ڈھل جاتے ہیں، جبکہ روزہ اس کی جذباتی برداشت اور خود پر قابو پانے کی صلاحیت کو مضبوط کرتا ہے۔ جب انسان کی فکر اور جذبات دونوں قرآنی تعلیمات کے مطابق ہو جائیں، تب ہی وہ حقیقی طور پر متوازن اور کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔

نماز اور روزہ جدید علم نفسیات خصوصاً ایموشنل انٹیلیجنس (Emotional Intelligence) کے تناظر میں گہرے مطالعے کے مستحق ہیں۔ ایموشنل انٹیلیجنس کا بنیادی مقصد انسان کی جذباتی فہم و فراست کو بڑھانا، اپنے اور دوسروں کے احساسات کو سمجھنا اور ان پر قابو پانا ہے، جو کہ نماز اور روزے کے بنیادی اثرات میں شامل ہے۔

نماز ایک مکمل ذہنی، جذباتی، اور روحانی مشق ہے جو انسان کے جذباتی اضطراب کو کم کرتی ہے اور اسے ایک متوازن نفسیاتی کیفیت میں رکھتی ہے۔ جدید نفسیات کے مطابق، ذہنی سکون اور جذباتی توازن برقرار رکھنے کے لیے ریگولر میڈیٹیشن، سیلف ریفلیکشن اور مثبت رویے اختیار کرنا ضروری ہے، اور نماز انہی اصولوں کو عملی طور پر نافذ کرتی ہے۔ جب کوئی شخص خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا سیکھتا ہے، منفی خیالات اور اضطراب سے نکل کر ایک مثبت ذہنی کیفیت میں آتا ہے اور اس کی توجہ اللہ کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ عمل ایموشنل انٹیلیجنس کے اہم ترین اصولوں جیسے سیلف اویئرنس (Self-Awareness) اور سیلف ریگولیشن (Self-Regulation) کو مضبوط کرتا ہے۔ نماز میں بار بار اللہ کی حمد و ثناء اور دعا کرنے سے انسان میں مثبت رویے پیدا ہوتے ہیں، غصہ کم ہوتا ہے، ہمدردی اور رحم دلی میں اضافہ ہوتا ہے، جو کہ جذباتی ذہانت کے لازمی عناصر ہیں۔

روزہ بھی ایموشنل انٹیلیجنس کی تربیت کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ روزہ رکھنے والا شخص نہ صرف کھانے پینے سے رک جاتا ہے بلکہ اپنے جذبات، خیالات، اور رویے پر بھی قابو رکھنا سیکھتا ہے۔ جدید نفسیات کے مطابق، صبر اور قوتِ برداشت (Resilience) جذباتی ذہانت کے کلیدی پہلو ہیں، اور روزہ انسان میں یہی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ جب انسان بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرتا ہے اور اپنی خواہشات کو محدود رکھتا ہے، تو وہ ایموشنل کنٹرول سیکھتا ہے۔ یہ عمل Impulse Control اور Delayed Gratification کی مہارت پیدا کرتا ہے، جو کہ نفسیاتی طور پر جذباتی استحکام کی بنیاد ہے۔

نماز اور روزہ انسان کو Empathy یعنی ہمدردی کا شعور بھی عطا کرتے ہیں۔ نماز میں جب انسان دوسروں کے لیے دعا کرتا ہے، اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہے اور اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کی نیت کرتا ہے، تو اس کی سماجی ذہانت (Social Intelligence) بھی ترقی کرتی ہے۔ روزہ رکھنے والا شخص جب بھوک اور پیاس محسوس کرتا ہے، تو وہ غریبوں اور محتاجوں کے درد کو بہتر سمجھنے لگتا ہے، اور اس میں ہمدردی اور ایثار کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، جو کہ جذباتی ذہانت کا ایک اور بنیادی پہلو ہے۔

نماز اور روزہ دونوں انسان میں Self-Discipline پیدا کرتے ہیں، جو کہ ایموشنل انٹیلیجنس کے لیے ناگزیر ہے۔ جو شخص پانچ وقت کی نماز کا پابند ہوتا ہے، اس میں وقت کی قدردانی، ضبطِ نفس، اور مستقل مزاجی جیسی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح، روزے کے ذریعے قوتِ ارادی (Willpower) بڑھتی ہے اور انسان اپنی خواہشات پر قابو پانے کی مہارت حاصل کرتا ہے۔

یہ تمام پہلو جدید نفسیات میں جذباتی ذہانت کے مرکزی عناصر تصور کیے جاتے ہیں، اور اسلام نے ان کی تربیت کے لیے نماز اور روزے کو عملی شکل میں پیش کیا ہے۔ جو شخص نماز اور روزے کو حقیقتاً اپناتا ہے، وہ نہ صرف روحانی طور پر بلکہ جذباتی اور نفسیاتی طور پر بھی ایک متوازن، مستحکم اور بامقصد زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انسانی شخصیت سے باطل کو کھرچ دینے والے وسائل میں قرآن کی تلاوت، نماز، اور روزہ سب سے مؤثر ذرائع ہیں۔ قرآن انسان کو فکری روشنی دیتا ہے، نماز جذباتی اور روحانی تربیت فراہم کرتی ہے، اور روزہ عملی ضبط نفس سکھاتا ہے۔ یہ تینوں عناصر مل کر ایک ایسی شخصیت تشکیل دیتے ہیں جو باطل نظریات، فکری حملوں، اور روحانی آلودگیوں سے محفوظ رہتی ہے اور دنیا میں حق و صداقت کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ تمام عوامل مل کر انسان کی شخصیت کو ایک متوازن، بااخلاق، اور باوقار حیثیت عطا کرتے ہیں۔ نماز اور روزے کے ذریعے انسان کی روحانی، ذہنی، اور جذباتی تطہیر ہوتی ہے، اور وہ ہر قسم کے باطل نظریات اور فکری آلودگیوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ان عبادات کو محض رسمی فرائض کے طور پر نہیں بلکہ ایک مکمل تربیتی نظام کے طور پر متعارف کرایا ہے، جو فرد کو داخلی اور خارجی سطح پر پاکیزگی اور استحکام عطا کرتا ہے۔

چاپلوسی کے اسباب و اثرات

چاپلوسی، مکھن لگانا، اور تلوے چاٹنے جیسے الفاظ بظاہر روزمرہ کی زبان میں طنز اور مزاح کے پیرایے میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے نفسیاتی اور سماجی حوالوں سے گہرے مفاہیم اور سنگین نتائج پوشیدہ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر جب کوئی انسان بار بار دوسروں کی بے جا تعریف کرتا ہے یا ان کے آگے خود کو بے وقعت بنا کر پیش کرتا ہے، تو اس کے پیچھے اکثر ایک کمزور خودی (weak self-concept) یا احساسِ کمتری (inferiority complex) کارفرما ہوتا ہے۔ ایسے افراد اپنے آپ کو دوسروں کے برابر یا ان کے قابل نہیں سمجھتے، اس لیے وہ دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی جھوٹی تعریف یا حد سے بڑھی ہوئی فرمانبرداری کو ایک حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

سماجی حوالے سے یہ رویہ صرف فرد کو نہیں بلکہ معاشرے کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ جب کسی ادارے، دفتر یا اجتماع میں چاپلوس افراد غالب آ جاتے ہیں، تو وہاں میرٹ کا قتل ہوتا ہے، سچ بولنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، اور ایک ایسا ماحول پروان چڑھتا ہے جہاں حق بات کہنا جرم اور جھوٹی مدح سرائی عزت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادارے ناکام ہو جاتے ہیں، انصاف کا معیار متاثر ہوتا ہے، اور سچائی پسِ پردہ چلی جاتی ہے۔

چاپلوسی کی نفسیاتی جڑیں اکثر خوف، عدم تحفظ، اور اپنی اہمیت ثابت کرنے کی کوشش سے جُڑی ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کی خوشنودی کے بغیر خود کو بے کار محسوس کرتے ہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ سچ بولیں گے یا تنقید کریں گے تو ان کا رشتہ یا مقام ختم ہو جائے گا، اس لیے وہ جھوٹی تعریف کے ذریعے اپنی جگہ بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کے اندر دوہرے معیار، منافقت، اور سچائی سے دوری جیسے منفی رویے پیدا ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ صفات ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں، اور وہ اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ چاپلوسی محض ایک انفرادی کمزوری نہیں بلکہ بعض اوقات یہ معاشرتی بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے معاشرے جہاں اقتدار، دولت یا شہرت کو معیارِ عزت بنا دیا جاتا ہے، وہاں لوگ سچائی کی بجائے طاقتور کی خوشامد کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ اس سے انصاف کا توازن بگڑ جاتا ہے اور ایک ایسا طبقہ پیدا ہوتا ہے جو طاقت کے بل پر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں چاپلوسی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ چاپلوس بدترین دوست ہے، اور وہ سچائی سے دشمنی کرتا ہے۔ دین ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ عزت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اگر کوئی اپنی خودی کو بچانا چاہتا ہے تو اسے سچائی، دیانت، اور وقار کے ساتھ جینا ہوگا، نہ کہ دوسروں کے قدموں میں پڑ کر۔ اس لیے ضروری ہے کہ فرد اپنی قدر پہچانے، خود کو دوسروں کے برابر سمجھے، اور تعلقات کو سچائی اور خلوص کی بنیاد پر قائم رکھے نہ کہ جھوٹ اور خود کو نیچا دکھانے کی بنیاد پر۔ یہی ایک باوقار زندگی اور ایک مہذب معاشرے کی ضمانت ہے۔

یہ رویہ کہ انسان اپنی شناخت، زبان، یا ثقافت پر فخر کرنے کے بجائے مغربی یا کسی طاقتور قوم کے انداز، زبان، یا طرزِ زندگی کی اندھی تقلید کرے، دراصل ایک گہرے نفسیاتی بحران کی

علامت ہے، جسے نفسیات کی زبان میں "کمزور خودی" یا "احساسِ کمتری" کہا جاتا ہے۔ جب کوئی فرد یا قوم مسلسل اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتی ہے، تو وہ اپنی اصل شناخت کو پیچھے چھوڑ کر اس طاقتور یا غالب ثقافت سے وابستگی کو فخر کا ذریعہ سمجھنے لگتی ہے۔ نتیجتاً، اپنی زبان کو کمتر سمجھ کر انگریزی کے الفاظ میں گفتگو کرنا، مغربی لباس و انداز کو تہذیب کی علامت سمجھنا، یا کسی عالمی طاقت سے اپنی وابستگی یا قربت کو اپنی بڑائی کی دلیل بنانا معمول بن جاتا ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ رویہ اس بات کا اظہار ہے کہ فرد کو اپنے اصل وجود، تاریخ، اور صلاحیتوں پر یقین نہیں رہا۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ "اپنا" ہے وہ ناکافی یا غیر معیاری ہے، اور جو کچھ "باہر" سے آیا ہے وہی ترقی، عزت اور قبولیت کی ضمانت ہے۔ یہ سوچ آہستہ آہستہ شخصیت کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے، کیونکہ انسان دوسروں کی آنکھ سے خود کو دیکھنے لگتا ہے، اور خود اپنے اندرونی معیار سے محروم ہو جاتا ہے۔

سماجی طور پر بھی یہ رویہ شدید نقصان دہ ہے۔ جب ایک معاشرہ اپنی زبان، اقدار، اور تاریخ پر شرمندگی محسوس کرنے لگے، تو اس کے نوجوان خود کو اس معاشرے کا فرد ماننے کے بجائے بیرونی شناختوں کی طرف جھکاؤ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں فکری غلامی پیدا ہوتی ہے، جہاں سوچنے، بولنے، اور عمل کرنے کا ہر پیمانہ کسی دوسرے کے طے کردہ معیار پر قائم ہوتا ہے۔ نتیجتاً خود اختیاری، تنقیدی سوچ، اور تخلیقی صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔

یہ مسئلہ صرف فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ قومی سطح پر بھی اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ اپنی تعلیمی پالیسیاں، ثقافتی مظاہر، اور ترقی کے ماڈل بھی بیرونی طاقتوں کی مرضی کے مطابق بنائے جانے لگتے ہیں، جس سے ایک مستقل انحصار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس رویے سے نہ صرف فکری آزادی متاثر ہوتی ہے بلکہ ایک ایسی ذہنی غلامی جنم لیتی ہے جو بظاہر مہذب نظر آتی ہے مگر درحقیقت اندر سے مکمل خالی اور غیر مستقل مزاج ہوتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بھی یہ رویہ ناپسندیدہ ہے۔ قرآن بارہا انسان کو اس کی کرامت، فطری عزت، اور خداداد صلاحیتوں کی یاد دہانی کراتا ہے۔ قرآن کا تصور انسان وہ ہے جو زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، نہ کہ کسی طاقت کے آگے جھکنے والا، یا اپنی شناخت کو ترک کرنے والا۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ "جس نے خود کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا"، یعنی خودی کا شعور اللہ شناسی کی طرف لے جاتا ہے، اور جو اپنی ذات کو کم تر سمجھتا ہے، وہ دراصل اپنی روحانی اور فطری عظمت سے غافل ہے۔

لہٰذا، ضروری ہے کہ ہم نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی سطح پر بھی اپنی شناخت، زبان، اور اقدار پر فخر کریں۔ خود کو دوسروں کے برابر سمجھنا اور اپنی خوبیوں کو تسلیم کرنا ہی اصل آزادی اور عزت کا راستہ ہے۔ بیرونی اثرات سے مکمل انکار ممکن نہیں، مگر ان اثرات کو اختیار کرنے کا پیمانہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہماری بنیادوں کو مضبوط کریں، نہ کہ ہمیں جڑوں سے کاٹ کر ایک جعلی شان و شوکت کا عادی بنا دیں۔ سچی ترقی تب ہی ممکن ہے جب انسان اپنی اصل پہچان کے ساتھ جیتا ہے، اور اپنے نظریات، اصولوں، اور زبان کے ساتھ فخر محسوس کرتا ہے۔

کمزور خودی (weak self-concept) اور احساسِ کمتری (inferiority complex) جیسی نفسیاتی و سماجی بیماریوں کا علاج ممکن ہے، بشرطیکہ انسان سنجیدگی سے اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو۔ ان امراض کا علاج کئی جہتوں سے کیا جا سکتا ہے، جن میں تربیتِ نفس، فکری رہنمائی، روحانی تعلق، اور معاشرتی اصلاح سب شامل ہیں۔

سب سے پہلے انسان کو خود شناسی (self-awareness) کی راہ پر گامزن ہونا چاہیے۔ جب تک انسان خود کو پہچانے گا نہیں، وہ اپنی قدر بھی نہیں جان سکے گا۔ خود شناسی کا ایک مؤثر ذریعہ قرآن مجید ہے، جہاں بار بار انسان کی فطرت، کرامت، اور اللہ کی طرف سے دی گئی صلاحیتوں کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ اسی لیے امام علیؑ کا قول ہے ": **من عرف نفسه فقد عرف ربه** — " جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

دوسرا اقدام یہ ہے کہ انسان اپنی زبان، ثقافت، اور مذہبی اقدار پر فخر کرنا سیکھے۔ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ شعور، شناخت اور فکر کی بنیاد ہے۔ جو قومیں اپنی زبان اور تاریخ سے محبت کرتی ہیں، وہ اندر سے مضبوط ہوتی ہیں۔ اردو یا دیگر قومی زبانوں کو کمتر سمجھنا، انگریزی یا مغربی طور پر "cool" بننے کی کوشش، دراصل ایک نفسیاتی فرار ہے جس کا خاتمہ تعلیم، تربیت، اور فکری شعور سے ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ روحانیت اور عبادت بھی اس بیماری کا زبردست علاج ہے۔ جب انسان خود کو اللہ سے جوڑتا ہے، اور اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ میری اصل عزت میرے خالق کے نزدیک ہے، نہ کہ کسی انسان یا معاشرتی معیار کے مطابق، تو وہ اندر سے

مضبوط ہو جاتا ہے۔ نماز، دعا، ذکرِ خدا، اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت کو اپنانا، انسان کے دل و دماغ کو استقامت اور وقار عطا کرتا ہے۔

ایک اور اہم علاج تربیتی ماحول کی تشکیل ہے۔ گھریلو، تعلیمی، اور سماجی سطح پر ایسے ادارے اور روابط قائم کیے جائیں جہاں انسان کو اس کی صلاحیتوں کا شعور دلایا جائے، جہاں خوشامد اور دکھاوے کی حوصلہ شکنی ہو، اور جہاں حقیقی عزت، سچائی، اور محنت کی بنیاد پر دی جائے۔

آخر میں، اس بیماری کا ایک مستقل علاج تنقیدی سوچ (critical thinking) اور خود احتسابی (self-reflection) ہے۔ جب انسان سیکھتا ہے کہ وہ ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ اپنی عقل، دین، اور شعور کی بنیاد پر پرکھے، تو وہ اس ذہنی غلامی سے باہر نکل آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی، اور عزت صرف اس میں ہے کہ انسان سچائی، حق، اور اپنے اصولوں پر ڈٹا رہے، چاہے دنیا کچھ بھی کہے۔

لہٰذا، ان بیماریوں کا علاج محض معلوماتی یا وقتی مشق نہیں بلکہ ایک جامع فکری، روحانی، اور معاشرتی اصلاحی عمل ہے، جس میں فرد کو خود اپنی ذات سے، اپنے خالق سے، اور اپنی قوم و امت سے جڑنے کی ضرورت ہے۔ جب انسان اپنی اصل پہچان کو پا لے، تو پھر کوئی بیرونی طاقت یا ثقافت اسے جھکا نہیں سکتی۔

عقل کو خطاب یا احساسات کو سہارا

انسان ایک پیچیدہ اور متنوّع وجود ہے، جو نہ صرف عقل رکھتا ہے بلکہ جذبات، احساسات، اور اندرونی کیفیات کا بھی حامل ہے۔ وہ محض ایک منطقی مخلوق نہیں جس سے ہر وقت دلیل اور تجزیہ کی توقع کی جائے، بلکہ وہ دل رکھتا ہے جو محسوس کرتا ہے، جو درد سے گزر سکتا ہے، جو خوشی اور غم کی لَہروں میں بہتا ہے۔ بہت سی ایسی زندگی کی گھڑیاں آتی ہیں جہاں انسان کو کسی حل، مشورے یا نصیحت کی تلاش نہیں ہوتی، بلکہ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کے درد کو سمجھے، اس کے دکھ کو سنے، اور اسے جذباتی سہارا دے۔ وہ یہ محسوس کرنا چاہتا ہے کہ اس کے جذبات کی اہمیت ہے، اور اس کا غم کسی اور کے دل کو بھی چھو رہا ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جب انسان کسی صدمے، پریشانی یا ذہنی دباؤ کا شکار ہوتا ہے، تو اس کی عقلی صلاحیتیں وقتی طور پر ماند پڑ جاتی ہیں۔ ایسے وقت میں کسی بھی قسم کی منطق، مشورہ یا ہدایت اُس کے دل و دماغ میں اثر پیدا نہیں کرتی، بلکہ وہ مزید الجھن اور بیگانگی کا سبب بن سکتی ہے۔ اُس وقت جس چیز کی انسان کو شدید ضرورت ہوتی ہے، وہ ہے غیر مشروط توجہ، ہمدردانہ رویہ، اور جذباتی رفاقت۔ کسی کا صرف موجود ہونا، خاموشی سے ساتھ بیٹھ جانا، یا بغیر کسی فیصلہ سنائے اس کے دل کی بات کو سن لینا ایک بے حد مؤثر اور شفابخش عمل ہوتا ہے۔

سماجی سطح پر بھی یہی رویہ انسانی تعلقات کو گہرائی اور مضبوطی بخشتا ہے۔ جب ہم دوسروں کے لیے صرف ایک بولنے والا منبر نہیں بلکہ ایک سننے والا دل بن جاتے ہیں، تو ہم اُن کے وجود کو اہمیت دیتے ہیں۔ کسی کو یہ احساس دینا کہ اُس کی بات سنی جا رہی ہے، اُس کا درد محسوس کیا جا رہا ہے، اور اُس کے احساسات کی بے قدری نہیں ہو رہی—یہ اُس کی خود اعتمادی کو بحال کرتا ہے، اُسے جذباتی طور پر متوازن کرتا ہے، اور اُسے تنہائی کے احساس سے نکالتا ہے۔ یہ رویہ محض ایک سماجی برتاؤ نہیں بلکہ انسانی اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہے، جو ہمارے تعلقات کو با معنی بناتا ہے۔

تبلیغِ دین کے میدان میں کام کرنے والے مبلغین کے لیے یہ پہلو اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مبلغ کا کام صرف شرعی مسائل بیان کرنا یا احکام کی فہرست پڑھ دینا نہیں، بلکہ اُس کا اصل کردار ایک روحانی رہنما، ایک شفیق دوست، اور ایک حساس ہم درد کا ہوتا ہے۔ ہر سننے والا شخص فوراً فتوے یا شرعی جواب کی طلب میں نہیں آتا، بعض اوقات وہ صرف ایک نرم گوشہ، ایک توجہ بھری نظر، یا ایک مہربان دل کی خواہش رکھتا ہے۔ اگر مبلغ محض عقل سے بات کرے، صرف نصیحت کی زبان استعمال کرے، اور سننے، سمجھنے، اور محسوس کرنے کے جذبے سے خالی ہو، تو اس کی بات مخاطب کے دل تک نہیں پہنچ پاتی، اور تبلیغ کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں دل جوئی اور ہمدردی کو بہت بلند مقام دیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت اس بات کا عملی مظہر ہے کہ وہ سب سے پہلے لوگوں کے دکھوں کو سنتے تھے، ان کے دلوں کی حالتوں کو محسوس کرتے تھے، اور پھر

نہایت حکمت، نرمی اور شفقت سے اُن سے بات کرتے تھے۔ ان کی باتیں دل میں اُترتی تھیں، کیونکہ وہ دل سے نکلی ہوتی تھیں۔ وہ سامع کو ایک مسئلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک انسان سمجھتے تھے، جس کے اندر ایک عالم پوشیدہ ہے، ایک کہانی ہے، ایک زخم ہے۔

یہی سیرت مبلغین کے لیے ایک کامل نمونہ ہے۔ مبلغ کو چاہیے کہ وہ خود کو صرف وعظ اور ہدایت تک محدود نہ کرے بلکہ ایک ایسا شخص بنے جو خاموشی سے کسی کا درد سن سکے، اُس کے جذبات کو سہار دے سکے، اور اُس کی کیفیت کو سمجھ کر اُس کے دل تک رسائی حاصل کرے۔ جب مبلغ دل کے ساتھ بات کرے، ہم دردی سے قریب ہو، اور سننے کے فن میں مہارت حاصل کرے تو وہ نہ صرف دلوں کو جیتتا ہے بلکہ حقیقتاً دین کی روح کو بھی پہنچاتا ہے۔

تبلیغ صرف زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہوتی ہے۔ اور دل تک رسائی اُسی کو حاصل ہوتی ہے جو سننا جانتا ہو، محسوس کرنا جانتا ہو، اور انسان کو انسان سمجھ کر اُس کے ساتھ بیٹھ سکے۔ یہی وہ اسلوب ہے جس سے تبلیغ میں جان پیدا ہوتی ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جو انسانوں کو دین کے نور تک پہنچاتا ہے۔

ہر ایک سے دوستی رکھنا منافقت کی علامت ہے

ہر ایک سے دوستی رکھنا، بظاہر ایک خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر اس رویے کی تہہ میں جھانکا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر کسی سے بنا رکھنا اور ہر وقت سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا درحقیقت ایک منافقانہ طرزِ عمل ہو سکتا ہے۔ یہ رویہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ انسان اپنی اصل سوچ، اپنے ضمیر اور باطنی کیفیت کو چھپا کر، صرف دوسروں کو خوش کرنے کے لیے مختلف چہرے اختیار کر رہا ہے۔ وہ اپنے اصل جذبات، نظریات اور موقف کو دبا کر لوگوں کی رائے کے تابع ہو جاتا ہے، اور ہر موقع پر اپنی شخصیت کی ایک نئی شکل پیش کرتا ہے، تاکہ کوئی اس سے ناراض نہ ہو اور سب اسے پسند کریں۔

ایسا طرزِ عمل نہ صرف شخصیت کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے بلکہ ایک طرح کی اندرونی بے چینی اور غیر یقینی کی حالت کو بھی جنم دیتا ہے۔ جو شخص ہر وقت دوسروں کی رائے کے مطابق خود کو ڈھالتا ہے، وہ اپنی خودی، خود اعتمادی اور سچائی کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی "لوگ کیا کہیں گے" کے اصول پر چلتی ہے، اور وہ رفتہ رفتہ اپنی اصل شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ ایسے لوگ معاشرے میں بظاہر ہر دلعزیز بننے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ نہ کسی کے سچے دوست بن پاتے ہیں اور نہ خود اپنے آپ سے وفادار رہتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں دوستی اور تعلقات کی بنیاد خوشامد، مفاد یا بناوٹ پر نہیں رکھی گئی بلکہ تقویٰ، اخلاص، خیر خواہی اور صداقت پر رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید ہمیں صاف طور پر ہدایت دیتا ہے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" (توبہ:119)، یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ہماری صحبتیں، ہماری دوستی اور ہمارے تعلقات سچائی پر مبنی ہونے چاہئیں، نہ کہ صرف تعلقات نبھانے یا سب کو راضی کرنے کی نیت سے۔ اگر ہم ہر کسی کے ساتھ خوش اخلاقی کے پردے میں اصولوں سے دستبردار ہو جائیں تو ہم نہ خود کے ساتھ سچے رہیں گے اور نہ اسلام کے اس پیغام سے وفادار جو ہمیں باوقار، بااخلاق اور بااصول انسان بنانے کے لیے آیا ہے۔

ایسے لوگ جو ہر کسی سے بنا کر رکھتے ہیں، ہر محفل میں اپنے چہرے کا زاویہ تبدیل کرتے ہیں، اور کبھی کسی غلط بات پر اعتراض نہیں کرتے، وہ اصل میں اپنی شناخت کو مٹاتے جا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ایک مستقل خوف رہتا ہے کہ اگر انہوں نے سچ کہا یا کسی غلطی پر تنقید کی تو لوگ انہیں ناپسند کرنے لگیں گے۔ یہ خوف ان کی خودداری کو ختم کر دیتا ہے، اور وہ ایسے انسان میں بدل جاتے ہیں جو ہر وقت دوسروں کی منظوری کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ کبھی اپنی رائے کا کھل کر اظہار نہیں کرتے، اور نہ کسی واضح موقف کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک ایسے مصنوعی خول میں بند ہو جاتے ہیں جس میں نہ ان کی سچائی ہوتی ہے اور نہ سکون۔

حسنِ اخلاق، نرمی، اور دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ بے شک بلند صفات ہیں، لیکن جب ان صفات کا استعمال صرف اس لیے ہو کہ کوئی ناراض نہ ہو، یا کوئی ناپسند نہ کرے، تو یہ صفات

اپنے مقصد کو کھو بیٹھتی ہیں۔ ہر انسان کو یہ جاننا چاہیے کہ وہ ہر ایک کو خوش نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اسے ہر ایک کی رضا کے لیے اپنی اصولوں کی قربانی دینی چاہیے۔ اگر کوئی شخص بار بار آپ کے وقت، توانائی یا احساسات کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور آپ محض خوش اخلاقی کے نام پر اس کا ساتھ دیتے رہتے ہیں، تو یہ آپ کی ہمدردی نہیں بلکہ اپنی حدوں سے ناواقفیت ہے۔ ایسے طرزِ عمل سے نہ صرف دوسرے لوگ آپ کو کمزور اور بے اصول سمجھنے لگتے ہیں بلکہ آپ خود بھی اندر سے ٹوٹنے لگتے ہیں۔

خودداری اور اصول پسندی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان سخت، بدتمیز یا کڑوا ہو جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہوئے، نرمی، شائستگی اور وقار کے ساتھ اپنی حدوں اور ترجیحات کو واضح کرے۔ جب انسان ایک متوازن شخصیت کے ساتھ سامنے آتا ہے، جو نرم بھی ہے اور اصول پر بھی قائم ہے، تو لوگ نہ صرف اس کی عزت کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ تعلق میں اطمینان محسوس کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص دکھاوا نہیں کرتا، بلکہ جیسا ہے، ویسا ہی نظر آتا ہے۔

لہٰذا، انسان کو چاہیے کہ وہ مہربانی کے ساتھ ساتھ صداقت، اصول پسندی اور خودداری کو بھی اپنی شخصیت کا حصہ بنائے۔ وہ ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش میں اپنی پہچان نہ کھوئے، اور نہ اپنے رب کی رضا کو بھولے۔ اصل کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اپنے ضمیر کے ساتھ سچا رہے، اللہ کی خوشنودی کو مقدم رکھے، اور اپنے اصولوں کو زندگی کی بنیاد بنائے۔ یہی وہ راستہ ہے جو انسان کو باوقار، بااعتماد اور مخلص بناتا ہے، اور یہی وہ معیار ہے جس پر کھرا اترنے والا ہی اصل کامیاب انسان کہلاتا ہے۔

مزاحمت و مقاومت کی اہمیت

مزاحمت یا مقاومت ایک ایسا رویہ ہے جو انسان کی شخصیت کے وقار، خود اعتمادی اور اخلاقی بیداری کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ رویہ صرف سیاسی یا انقلابی سطح پر ہی نہیں بلکہ انفرادی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی سطح پر بھی بے حد اہم اور ضروری ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ شعور رکھا گیا ہے کہ وہ ناانصافی، ظلم، یا کسی بھی قسم کے استحصال کے خلاف ردِ عمل دے۔ جب کوئی فرد ایسے حالات کا سامنا کرتا ہے جہاں اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، اس پر ناحق الزام لگایا جاتا ہے، یا اس کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے، اور وہ پھر بھی خاموشی اختیار کرتا ہے تو وہ درحقیقت ظالم کو مزید طاقتور بنانے کا سبب بنتا ہے۔ ایسی خاموشی وقتی طور پر حالات کو قابو میں رکھنے یا تعلقات کو بچانے کے لیے تو فائدہ مند دکھائی دے سکتی ہے، لیکن یہ طرزِ عمل انسان کی روحانی اور نفسیاتی ساخت کو اندر سے کھوکھلا کرنے لگتا ہے۔ خاموشی ہمیشہ سمجھداری نہیں ہوتی، خاص طور پر ان مواقع پر جب بولنا ضروری ہو، کیونکہ مسلسل خاموشی بالآخر خود احترام کی کمی اور شخصیت کی کمزوری میں بدل جاتی ہے۔

مزاحمت کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انسان بدتمیزی، تلخی یا جھگڑے پر اتر آئے۔ اصل مزاحمت تو وہ ہے جو وقار، بردباری، حکمت اور دانائی کے ساتھ کی جائے۔ ایک مہذب، باوقار اور باشعور شخص وہی ہے جو نرمی کے ساتھ اپنی بات کہے، اپنی حدود کا دفاع کرے، اور اصولوں پر ڈٹے رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ جب انسان جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر،

پر امن اور دلیل سے بات کرتا ہے، تو اس کا اثر دوسروں پر بھی گہرا ہوتا ہے۔ ایسے افراد کا مؤقف سنا بھی جاتا ہے اور ان کی عزت بھی کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مسلسل خاموشی اختیار کرتا ہے، تو نہ صرف وہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے بلکہ دوسروں کو یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ اس کی ذات کو پامال کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔

خاص طور پر قریبی رشتوں میں یہ صورتحال مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں سے جذباتی وابستگی ہو، ان کے خلاف بولنا یا ان کی زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی لوگ بار بار آپ کی عزتِ نفس کو مجروح کریں، آپ کی رائے کو نظر انداز کریں، یا آپ کی حدود کو مسلسل پامال کرتے رہیں، اور آپ خاموش رہیں تو دراصل آپ خود اپنی اہمیت کو ان کی نگاہوں میں کم کر رہے ہوتے ہیں۔ انسانیت اور محبت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسروں کو ہر بار اپنے اوپر حاوی ہونے دیں۔ ایک صحتمند رشتہ وہی ہوتا ہے جس میں احترام باہمی ہو، اور اگر وہ ختم ہو جائے تو اسے واپس بحال کرنا صرف خاموشی سے نہیں بلکہ وقار کے ساتھ ردعمل ظاہر کرنے سے ممکن ہے۔

ہمارا معاشرہ بھی اس سلسلے میں کئی طرح کی الجھنوں کا شکار ہے۔ ہمیں بچپن سے یہ سکھایا جاتا ہے کہ بڑوں کی بات ماننی ہے، خاموش رہنا ہے، جھگڑا نہیں کرنا، بدتمیزی نہیں کرنی۔ یہ تعلیم اپنی جگہ درست ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نکالنا کہ ظلم کے آگے بھی چپ سادھ لی جائے، ایک خطرناک خاموشی کو جنم دیتا ہے۔ ہم نے مزاحمت کو بدتمیزی کا مترادف بنا دیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ظلم سہنے کو صبر کا نام دے کر اسے تقدیر کا حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ رویہ نہ صرف فرد کو نفسیاتی دباؤ میں رکھتا ہے بلکہ ظالم کے حوصلے کو بھی بڑھاتا ہے۔ اگر

معاشرے کے ہر فرد کو اپنی عزتِ نفس کی حفاظت، اصولوں پر ڈٹ جانے، اور نرمی سے حد بندی کرنے کا شعور دیا جائے، تو یہ معاشرہ ایک بہتر اور زیادہ منصفانہ سمت میں بڑھ سکتا ہے۔

مزاحمت کا ایک بہت اہم فائدہ انسان کے اندرونی سکون، خوداعتمادی اور جذباتی توازن کی بحالی ہے۔ جب انسان کسی کے ناروا سلوک پر خاموش نہیں رہتا بلکہ وقار سے اپنی بات رکھتا ہے، تو وہ اپنے اندر ایک طاقت، روشنی اور فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ شعور کہ میں نے اپنی عزت کو پامال ہونے سے بچایا، اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا، اور حق کے لیے کھڑا ہوا، انسان کو اندر سے مضبوط کرتا ہے۔ یہی اعتماد انسان کی شخصیت میں ایسی چمک اور کشش پیدا کرتا ہے جس سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں اور اسے سنجیدگی سے لینے لگتے ہیں۔

بالآخر یہ حقیقت ذہن نشین کرنی چاہیے کہ مزاحمت کوئی وقتی جذباتی ردِعمل نہیں بلکہ ایک مسلسل شعوری طرزِ عمل ہے۔ یہ نہ صرف ایک فرد کا ذاتی فریضہ ہے بلکہ اجتماعی سطح پر بھی اصلاح و تعمیر کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ خودداری، وقار اور اصولوں کی حفاظت صرف زبان یا لباس سے نہیں بلکہ کردار، طرزِ عمل اور مزاحمت سے ممکن ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے اندر یہ ہنر پیدا کریں کہ ہم نرمی سے، وقار سے، اور اصولوں کے ساتھ جینا سیکھیں، اور جب بھی ناانصافی، بے احترامی یا استحصال کا سامنا ہو تو مؤثر انداز میں اپنی آواز بلند کریں۔ یہی رویہ ایک باوقار، باشعور اور زندہ معاشرے کی بنیاد بنتا ہے، جہاں نہ کوئی ظالم بلاخوف و خطر ظلم کر سکتا ہے اور نہ کوئی مظلوم خاموشی سے سب کچھ سہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

سفر کی ابتداء میں مقابلہ کا فریب

انسان کی زندگی میں ترقی، کامیابی اور کمال ایک تدریجی اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ سفر کسی جادوئی چھلانگ کا محتاج نہیں بلکہ وقت، صبر، اور تجربے کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اکثر اپنی ابتدائی کوششوں کو دوسروں کی دہائیوں پر محیط کامیابیوں سے موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ موازنہ نہ صرف غیر منصفانہ ہوتا ہے بلکہ ہماری اپنی راہ میں مایوسی، کم ہمتی اور بداعتمادی کو جنم دیتا ہے۔ اگر ہم نے آج ہی کوئی نیا ہنر سیکھنا شروع کیا ہے، یا کسی نئے میدان میں قدم رکھا ہے، تو یہ فطری امر ہے کہ ہمیں ابھی بہت کچھ سیکھنا اور کرنا باقی ہے۔ ایسے میں اگر ہم ان لوگوں سے اپنا موازنہ کریں جو دس برسوں سے اسی میدان میں محنت کر رہے ہیں، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک پودے سے اس کی پہلی کونپل پر پھل کی توقع رکھنا۔

ہر انسان کا سفر الگ ہوتا ہے، اور اس کے پس منظر، وسائل، تجربات اور مواقع بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کی ظاہری کامیابی درحقیقت ان گنت ناکامیوں، قربانیوں اور صبر کے لمحات کا حاصل ہوتی ہے، جن کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ ہم صرف اس کا نتیجہ دیکھتے ہیں، مگر اس کے سفر کے نشیب و فراز، آنسو، پسینہ اور وقت کی بھینٹ چڑھائی گئی قربانیاں نہیں دیکھ پاتے۔

مزید یہ کہ جب ہم دوسروں کے نتائج سے متاثر ہو کر خود کو کمتر سمجھتے ہیں، تو ہم اپنی صلاحیتوں، اپنے سفر اور اپنی رفتار کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو منفرد فطرت، الگ استعداد اور مختلف مواقع کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: "وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ" یعنی "کسی احسان کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرو"۔ اس آیت کی روشنی میں ہمیں نہ صرف دوسروں کی کوششوں کو بڑھا چڑھا کر دیکھنے سے بچنا چاہیے، بلکہ اپنے راستے پر خلوص اور ثابت قدمی سے چلتے رہنا چاہیے، چاہے ابتدا میں ہمیں سست رفتاری یا ناتجربہ کاری کا سامنا ہو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ہر ماہر بھی کبھی مبتدی ہی تھا۔ ہر کامیاب انسان کے پیچھے ابتدا کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں وہ بھی شک، ناکامی، اور الجھنوں سے دوچار ہوتا تھا۔ لیکن اس نے وقت کے ساتھ سیکھا، سنوارا، اور آگے بڑھا۔ اگر ہم بھی اپنے پہلے دن یا پہلے سال کو سیکھنے، بنانے اور بہتر کرنے کی نیت سے گزاریں، تو ایک دن ہماری محنت بھی وہ مقام حاصل کرے گی جس پر آج ہم دوسروں کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔

لہٰذا خود سے موازنہ کیجیے —اپنی سابقہ حالت سے، اور دیکھئے کہ آپ کتنے بہتر ہو چکے ہیں۔ یہ وہی اندازِ فکر ہے جو نہ صرف حوصلہ بڑھاتا ہے بلکہ حقیقی ترقی کی بنیاد بھی رکھتا ہے۔ جب ہم صبر، محنت، اور وقت کے اصول کو تسلیم کر لیتے ہیں، تب ہی ہم دوسروں کی کامیابیوں کو حسد کی نگاہ سے نہیں بلکہ ترغیب و تحریک کے ذریعہ دیکھتے ہیں، اور اپنے سفر کو اعتماد اور سکون کے ساتھ جاری رکھتے ہیں۔

اسلام میں عمر رسیدہ افراد، بزرگانِ دین اور تجربہ کار انسانوں کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے، وہ صرف ان کی عمر کی زیادتی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان برسوں میں حاصل کی گئی حکمت، صبر، عمل، تجربہ اور قربانیوں کی بنا پر ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو لوگ وقت کے نشیب و فراز سے گزر کر، آزمائشوں کا سامنا کر کے، اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے دین، علم یا اخلاق میں کمال حاصل کرتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے ذاتی دائرہ کار میں بلکہ پورے معاشرے کے لیے رہنما بن جاتے ہیں۔

یہی وہ بنیادی اصول ہے جو اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ہم کسی نو آموز یا نئے قدم رکھنے والے شخص کو ان بزرگوں کے مقام سے برابر نہیں کر سکتے جنہوں نے اپنی عمر کے قیمتی لمحات خدا کی عبادت، علم کے حصول، خدمتِ خلق، اور حق کے دفاع میں صرف کیے۔ نبی کریم صل اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: "من لم یوقر کبیرنا و لم یرحم صغیرنا فلیس منا" —یعنی "جو ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔" اس حدیث میں عزتِ بزرگان کی اصل وجہ ان کی عمر نہیں، بلکہ وہ شعور، تقویٰ، اور قربانی ہے جو وقت کے ساتھ ان میں پروان چڑھی ہے۔

اسلامی معاشرہ اس فطری اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ وقت کے ساتھ انسان پختہ تر ہوتا ہے۔ اس کی سوچ میں وسعت آتی ہے، عمل میں گہرائی آتی ہے اور نظریات میں ٹھہراو پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا بزرگوں کی رائے کو اہمیت دینا، ان سے سیکھنا اور ان کی زندگی کے تجربات سے رہنمائی لینا محض اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ عملی دانشمندی بھی ہے۔ یہ بھی ایک سبق ہے کہ کسی بھی شعبے میں کامیابی یا فضیلت محض خواہش یا جلد بازی سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ

مستقل مزاجی، مسلسل محنت اور وقت کی آزمائش سے گزرنے کے بعد آتی ہے۔ اس لیے اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اپنے سفر کے آغاز میں دوسروں کے تجربے اور مقام سے متاثر ضرور ہوں، لیکن خود کو ان سے کمتر نہ سمجھیں، بلکہ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے صبر اور سیکھنے کے جذبے کو اپنائیں۔

جس طرح کوئی عالم دین یا فقہی ماہر برسوں کے مطالعے، تفکر، مناظرہ اور ریاضت کے بعد اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں اس کا ایک لفظ قوم کی سمت متعین کر سکتا ہے، اسی طرح ہر بزرگ انسان بھی ایک خاموش کتاب کی مانند ہوتا ہے جس کے اوراق پر وقت نے حکمت و بصیرت رقم کی ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم نہ صرف ان کی عزت کریں بلکہ ان سے فیض حاصل کریں، اور یاد رکھیں کہ اگر آج ہم سفر کے آغاز میں ہیں تو کل انہی تجربات اور صبر کے مراحل سے گزر کر ہم بھی دوسروں کے لیے مثال بن سکتے ہیں۔

اگرچہ اسلام میں عمر رسیدہ افراد کے احترام اور ان کی بزرگی کا عمومی اصول موجود ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ صرف عمر کی زیادتی ہی علم، تجربے یا ہدایت کا معیار بن جائے۔ ہر عمر رسیدہ شخص لائقِ تقلید یا قابلِ مشورہ نہیں ہوتا۔ زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ وقت کا گزر جانا لازمی طور پر شعور، معرفت یا بصیرت کے اضافے کی ضمانت نہیں دیتا۔ بعض افراد پوری عمر گزار دیتے ہیں لیکن ان کا فہم و ادراک محدود ہی رہتا ہے، اور وہ نہ اپنے تجربات سے سیکھتے ہیں، نہ دین کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوتے ہیں، نہ دنیا کے حقائق کو صحیح تناظر میں پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اسلام ہمیں صرف ظاہری عمر یا سماجی حیثیت کی بنیاد پر کسی کو مطلقاً فالو کرنے یا اس سے مشورہ لینے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ عقل و فراست کو معیار بناتا ہے۔ قرآن ہمیں غور و فکر، تدبر اور بصیرت کی دعوت دیتا ہے۔ یہ بھی فرمایا گیا: "فَبَشِّرْ عِبَادِ۔ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ" یعنی "میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور پھر اس میں سے بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں"۔ اس آیت میں ہمیں سکھایا گیا ہے کہ سننے اور سمجھنے کی ذمہ داری فرد کی اپنی عقل پر ہے، اور فیصلہ اسی کی بنیاد پر ہونا چاہیے کہ کس کی بات میں بصیرت، حقانیت اور توازن موجود ہے۔

ایک سمجھدار نوجوان اپنی عقل، مشاہدے اور مطالعے کی روشنی میں یہ پہچان سکتا ہے کہ کون بزرگ واقعتاً علم و فہم کا حامل ہے، اور کون صرف عمر کے لحاظ سے بڑا ہے لیکن فکری طور پر کمزور یا گمراہ کن خیالات کا ترجمان ہے۔ تاریخ میں بہت سے مثالیں ملتی ہیں جہاں بزرگوں نے نوجوانوں کو غلط مشورے دیے، اور بعض اوقات نوجوانوں نے زیادہ بصیرت سے فیصلے کیے۔ واقعۂ کربلا میں امام حسینؑ کے قافلے میں شامل جوان، جنہوں نے انتہائی شعور اور قربانی کا مظاہرہ کیا، ان کا کردار ہمیں سکھاتا ہے کہ سچائی کا معیار عمر نہیں بلکہ علم، اخلاص اور شعور ہے۔

اسی تناظر میں ہمیں چاہیے کہ ہم ہر بزرگ کی عزت ضرور کریں، کیونکہ یہ اخلاق کا تقاضا ہے، لیکن ان کی ہر بات کو آنکھ بند کر کے قبول نہ کریں۔ جہاں تقلید اور مشورے کی بات آئے، وہاں بصیرت، دین داری، عملی کردار اور فہم و فراست کو معیار بنایا جائے۔ ایک ایسا بزرگ جس نے زندگی علم و دین کی خدمت میں گزاری ہو، جو قول و فعل میں یکساں ہو، جو

معاملات میں انصاف پسند اور نکتہ رس ہو، وہی ہماری رہنمائی کا اہل ہے۔ لیکن اگر کوئی صرف عمر کی بنیاد پر خود کو برتر سمجھتا ہے اور اس کی باتوں میں نہ علم ہو نہ حکمت، نہ حلم ہو نہ دیانت، تو ایسے شخص سے مشورہ لینا خود کو گمراہی کے سپرد کرنے کے مترادف ہو سکتا ہے۔

پس اسلام ایک معتدل اور متوازن زاویۂ نگاہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے: ہم بزرگوں کی تعظیم کریں، ان کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، مگر تقلید صرف اس کی کریں جو عقل، علم اور تقویٰ میں واقعی بڑا ہو۔ یہی عقل مند مومن کی پہچان ہے۔ زندگی کا ہر سفر تدریج سے مکمل ہوتا ہے، اس لیے اپنی ابتدا کو دوسروں کی انتہا سے نہ تولیں۔ اسلام ہمیں بصیرت، صبر اور اخلاص کے ساتھ اپنے راستے پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ بزرگی کا احترام لازم ہے، مگر تقلید صرف اسی کی جو علم، تقویٰ اور فہم کا حامل ہو۔ اصل کامیابی اپنے نفس کی بہتری اور حق کی پہچان میں ہے، نہ کہ محض عمر یا ظاہری مقام میں۔

تلاوت قرآن کے انسانی جسم و روح پر اثرات

قرآن مجید ایک ایسا آسمانی کلام ہے جو نہ صرف انسان کی روح کی گہرائیوں کو منور کرتا ہے بلکہ اس کے جسمانی وجود پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ کتابِ ہدایت، الفاظِ الٰہی کی وہ تجلی ہے جو انسان کے اندرونی نظام کو بیدار کرتی ہے، روح کو جلا بخشتی ہے اور جسم کو ایسی طاقت عطا کرتی ہے جو ہر قسم کے باطنی اور ظاہری حملوں کے خلاف ڈھال بن جاتی ہے۔ قرآن کی تلاوت، اس کی تفسیر، اور اس پر تدبر، سب انسان کے فکری، نفسیاتی اور روحانی نظام کو ایک ہم آہنگی عطا کرتے ہیں جو اسے شیطانی وساوس، ذہنی خلفشار، اور باطنی بے چینی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

قرآن خود کہتا ہے " :يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ "(یونس:57)، یعنی اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور وہ چیز آئی ہے جو دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔ اس آیت میں "ما فی الصدور" صرف جذباتی یا روحانی امراض کی بات نہیں بلکہ وہ نفسیاتی الجھنیں، خوف، اضطراب، اور فکری انتشار بھی شامل ہیں جو انسان کے باطن کو کمزور کرتے ہیں اور دشمن کے روحانی حملوں کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں۔ قرآن ان تمام امراض کے لیے شفا بن کر آتا ہے۔

روایاتِ معصومین علیہم السلام میں قرآن کو "روح کی بہار"، "دلوں کی روشنی"، اور "دردوں کی دوا" کہا گیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں " :قلب المؤمن یتجلی بالنور إذا قرأ القرآن "یعنی مومن کا دل قرآن کی تلاوت سے نورانی ہو جاتا ہے۔ یہ نورانی کیفیت صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی سطح پر بھی انسان کو تقویت دیتی ہے۔ جب انسان قرآن کے الفاظ کو دل سے پڑھتا ہے، تو اس کا دماغ، دل، اور اعصابی نظام ایک ایسی لَے میں آ جاتے ہیں جو ذہنی سکون، مثبت توانائی اور اندرونی اطمینان پیدا کرتی ہے۔ جدید سائنس اس بات کی تائید کرتی ہے کہ صوتی لہریں (sound frequencies) جسم کے خلیوں، دل کی دھڑکن اور دماغ کی لہروں کو متاثر کرتی ہیں، اور قرآن کی تلاوت کی مخصوص صوتیات ایک ایسی خاص اثر انگیزی رکھتی ہیں جو انسان کی اندرونی کیفیت کو بدل دیتی ہے۔

علم نفسیات کی رُو سے، انسان کے جذبات، افکار اور جسمانی کیفیات آپس میں گہرے تعلق رکھتے ہیں۔ جب انسان قرآن کو شعور اور تدبر کے ساتھ سنتا ہے یا پڑھتا ہے، تو وہ اپنے باطن کی گہرائیوں سے جڑتا ہے، اور یہ تعلق اسے احساسِ مقصد، روحانی تحفظ، اور نفسیاتی استحکام عطا کرتا ہے۔ قرآن میں بارہا شیطان کے وسوسوں، خوف، غم، اور مایوسی کے خلاف ذکرِ الٰہی اور قرآن کی طرف رجوع کی تاکید کی گئی ہے۔ یہی چیز دشمن کے روحانی حملوں کے خلاف سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔ انسان جب اپنی روح کو قرآن کے نور سے منور کرتا ہے تو اس کے اندر ایک ایسی بصیرت پیدا ہوتی ہے جو ظاہری چالوں اور باطنی وساوس کے درمیان فرق کر سکتی ہے۔

قرآن جسم کو بھی ایک خاص انداز میں تقویت دیتا ہے۔ آیاتِ رحمت کے ذریعے دل کو سکون ملتا ہے، آیاتِ وعدہ انسان کو امید دیتی ہیں، آیاتِ عذاب اسے چوکنا رکھتی ہیں، اور آیاتِ علم و حکمت عقل کو تقویت دیتی ہیں۔ یہ سب عوامل انسان کے جسمانی رویے، اس کی نیند، ہارمونی نظام، اور مدافعتی قوت پر مثبت اثر ڈالتے ہیں۔ ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ جب انسان کسی طاقتور ماورائی نظام سے جڑتا ہے، جیسے کہ وحی یا روحانی کلام، تو اس کے جسم میں Endorphins اور Dopamine جیسے کیمیکل متحرک ہوتے ہیں جو نہ صرف درد کم کرتے ہیں بلکہ خوشی، سکون، اور طاقت کا احساس دلاتے ہیں۔

قرآن دشمن کے روحانی حملوں سے بچاؤ کا ایک محفوظ قلعہ ہے۔ جب انسان قرآن کو دل سے اپناتا ہے، تو اس کے اندر ایک الہامی خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ وہ وسوسوں میں نہیں بہکتا، فتنوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا، اور شیطانی الجھنوں میں گم نہیں ہوتا۔ یہ کتاب انسان کو ایسی نگاہ عطا کرتی ہے جو حق کو باطل سے، روشنی کو تاریکی سے اور سچ کو فریب سے الگ کر سکتی ہے۔ یہی روحانی فراست انسان کو باطنی دشمنوں کے وار سے محفوظ رکھتی ہے۔

اس طرح قرآن صرف روح کا چراغ نہیں بلکہ جسم کی طاقت، دل کا سکون، عقل کی روشنی اور دشمن کے ہر حملے کے مقابل ایک ابدی ڈھال ہے۔ یہ انسان کو اپنے رب سے جوڑ کر اس کے وجود کو وہ حصار فراہم کرتا ہے جو دنیا و آخرت کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

تلاوتِ قرآن محض الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ ایک گہرا نفسیاتی اور ذہنی تجربہ ہے جو انسانی شعور اور لاشعور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب انسان قرآن کی تلاوت کرتا ہے، تو اس کے دماغ میں الفاظ کی صوتیات، معانی اور جذباتی اثرات ایک مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کرتے ہیں، جسے cognitive psychology کے اصولوں سے سمجھنا ممکن ہے۔

علمِ ادراک (cognitive psychology) کے مطابق، انسانی ذہن میں معلومات کی پروسیسنگ کئی مراحل سے گزرتی ہے، جن میں توجہ، ادراک، یادداشت، اور فہم شامل ہیں۔ تلاوتِ قرآن میں سب سے پہلے **توجہ** کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص قرآن کی آیات کو غور سے پڑھتا ہے، تو اس کی توجہ غیر ضروری خیالات سے ہٹ کر متن پر مرکوز ہو جاتی ہے، جسے "focused attention" کہا جاتا ہے۔ یہ توجہ انسانی دماغ میں executive functions کو متحرک کرتی ہے، جو سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ سازی کے عمل کو بہتر بناتی ہیں۔

ادراکی نفسیات کے مطابق، جب انسان کسی نئے مفہوم کو دہراتا ہے، تو وہ اس کے ذہن میں زیادہ دیر تک محفوظ رہتا ہے، جسے "rehearsal effect" کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت، بالخصوص جب مسلسل دہرائی جاتی ہے، انسانی یادداشت کو مضبوط بناتی ہے۔ قرآنی آیات میں موجود الفاظ اور ان کے مخصوص صوتی آہنگ دماغ کے "phonological loop" کو متحرک کرتے ہیں، جو زبانی معلومات کو یاد رکھنے میں مدد

دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا قرآن سے گہرا تعلق ہوتا ہے، ان کی working memory زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے۔

مزید برآں، تلاوت کا اثر انسانی جذبات پر بھی پڑتا ہے۔ قرآن کی آیات میں موجود معنوی گہرائی، انسانی سوچ کے پیٹرن (cognitive patterns) پر اثر انداز ہوتی ہے، جسے "schema theory" کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ جب انسان بار بار قرآن پڑھتا ہے، تو اس کے ذہن میں ایک نیا "schema" بنتا ہے، جو دنیا کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن کی تلاوت مستقل کرنے والے افراد کا طرزِ فکر (cognitive framework) ایک مخصوص ترتیب میں آ جاتا ہے، جو انہیں بہتر فیصلہ سازی، استدلال، اور جذباتی استحکام فراہم کرتا ہے۔

قرآن کی تلاوت صرف دماغی نہیں بلکہ لاشعوری سطح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی مخصوص تحریکی (stimulus) کو بار بار سنتا یا دہراتا ہے، تو وہ اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے، جسے "priming effect" کہا جاتا ہے۔ تلاوتِ قرآن ایک قسم کی روحانی priming ہے، جو ذہنی فریم کو مثبت طور پر ترتیب دیتی ہے، اور انسانی افعال و اعمال کو ایک مخصوص رخ پر ڈالتی ہے۔

نیز، قرآن کی تلاوت تناؤ (stress) اور اضطراب (anxiety) کو کم کرنے میں بھی مدد دیتی ہے، کیونکہ اس عمل کے دوران دماغ کے اندرونی سکون کے لیے ذمہ دار ہارمونس، جیسے کہ dopamine اور serotonin، کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

قرآن سننے یا پڑھنے سے اکثر لوگ سکون اور طمانیت محسوس کرتے ہیں، جو "cognitive relaxation" کا نتیجہ ہوتا ہے۔

علمِ ادراک کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی تلاوت محض ایک مذہبی عمل نہیں، بلکہ انسانی دماغ اور نفسیات کے لیے ایک گہری تربیت بھی ہے، جو سوچنے، سمجھنے، یادداشت کو مضبوط کرنے، جذباتی توازن قائم رکھنے اور ذہنی سکون حاصل کرنے کے عمل میں مدد دیتی ہے۔

دعا اور دوا ساتھ ساتھ

انسان کی زندگی محض جذبات یا خواہشات کی بنیاد پر نہیں چلتی، بلکہ اس میں ایک حکیمانہ توازن درکار ہوتا ہے جس میں خدائی مدد اور مادی اسباب دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ خدا پر ایمان انسان کو حیات کی ہر کروٹ پر ایک اندرونی استحکام، تسلی اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔ مشکلات چاہے کتنی ہی سنگین ہوں، جب بندہ جانتا ہے کہ ایک قوتِ لایزال اس کے ساتھ ہے، تو وہ نہ ٹوٹتا ہے اور نہ بکھرتا ہے۔ دعا، توکل اور ایمان کے سہارے انسان وہ حوصلہ پاتا ہے جو محض ظاہری وسائل سے نہیں ملتا۔

لیکن اسلام کی تعلیمات ہمیں یہ بھی سکھاتی ہیں کہ خدا پر بھروسہ کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ظاہری اسباب کو ترک کر دیا جائے یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا جائے بلکہ دوا اور دعا ساتھ ساتھ ہونے چاہییں جس طرح خدا کا بسیط وجود (Simple Non-Composite Existence) کے ساتھ ظاہری اور مادّی طور پر انبیاءؑ اور ائمہؑ کے وجود ضروری ہیں۔ خدا نے مادی اسباب کو بھی اپنی حکمت کے تحت انسان کی سہولت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ یہ ضرورت سائنس اور مذہب کے رابطے میں بھی ہے یعنی مادّی شہود کے ساتھ غیب بھی ضروری ہے۔ رزق کمانے کے لیے محنت کرنا، علم حاصل کرنے کے لیے سعی کرنا، علاج کے لیے دوا لینا، دشمن سے بچنے کے لیے حفاظت کے ذرائع اپنانا—یہ سب اسی توازن کا حصہ ہیں جو خدا نے مقرر کیا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے: "انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس

نے کوشش کی" (سورہ نجم، آیت 39)۔ یہ واضح پیغام ہے کہ محض دعا کافی نہیں، عمل اور محنت لازم ہے۔

مشکلات میں خدا پر ایمان انسان کو مایوسی اور ناامیدی سے بچاتا ہے، کیونکہ جب دنیاوی اسباب کمزور پڑ جاتے ہیں تو یہی روحانی سہارا اسے نئے راستے تلاش کرنے اور شکست کو قبول کرنے کے بجائے اسے ایک نئے موقع میں تبدیل کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ لیکن اسی ایمان کے ساتھ اگر انسان مادی اسباب کو نظر انداز کرے تو وہ گویا خدا کے قانونِ فطرت سے روگردانی کر رہا ہوتا ہے۔ جیسے طوفان کے وقت پناہ تلاش کرنا عقل کا تقاضا ہے، ویسے ہی زندگی کے ہر میدان میں اسباب اختیار کرنا حکمت اور دین کا تقاضا ہے۔

البتہ، مادی اسباب میں ڈوب جانا اور خدا کو فراموش کر دینا بھی ایک دوسری انتہا ہے جو انسان کو غرور، خودپسندی اور بالآخر تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ جب انسان محض اپنی تدابیر اور وسائل پر بھروسہ کرتا ہے اور خدا کی ربوبیت کا انکار کرتا ہے تو وہ ایک نازک دھاگے پر چلنے لگتا ہے، جہاں ذراسی لغزش اسے اندھیرے میں گرا سکتی ہے۔ اس لیے اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اسباب کو اپنانے کے باوجود دل کو اللہ کی طرف جھکائے رکھنا چاہیے، ہر قدم پر اس کی مدد مانگنی چاہیے، اور یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اصل تدبیر کرنے والا وہی ہے۔

زندگی گزارنے کے لیے مادی اسباب اختیار کرنا اللہ کی سنت کا احترام ہے، اور مشکلات میں خدا سے لو لگانا اس کی بندگی کا اظہار ہے۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے باہمی ربط کے بغیر نہ دنیا میں کامیابی ممکن ہے نہ آخرت میں فلاح۔ اسی توازن کی خوبصورت تصویر ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں دکھائی

دیتی ہے، جہاں وہ ظاہری اسباب کا اہتمام بھی کرتے تھے اور ہر لمحہ خدا کی مدد کے محتاج بھی رہتے تھے۔

یوں انسان جب خدا پر بھروسہ اور اسباب کا استعمال ساتھ ساتھ کرتا ہے تو وہ ایک ایسی زندگی گزارتا ہے جو عقل، حکمت اور روحانیت کا حسین امتزاج بن جاتی ہے، اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں سرخرو ہوتا ہے۔

انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، اور اسی مٹی کے عناصر اس کی بقا اور صحت کے لیے بھی کارگر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دار الاسباب بنایا ہے، یعنی یہاں ہر اثر کے لیے کوئی سبب مقرر فرمایا ہے۔ انسان کو جو جسم عطا ہوا ہے، اس کی حفاظت اور بیماری کی حالت میں اس کی اصلاح کے لیے اللہ نے بے شمار مادی اسباب پیدا فرمائے ہیں، جن میں سے ایک دوا بھی ہے۔ دوا کا استعمال دراصل اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے استفادہ کرنا ہے، اور یہ ایمان و توکل کے منافی نہیں بلکہ اس کا تقاضا ہے۔

دوا کو اختیار کرنا اللہ کی سنتِ تکوینی (قانونِ فطرت) کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر انسان کسی بیماری کے وقت دوا نہ لے اور صرف دعا پر بھروسہ کرے تو گویا وہ اللہ کے بنائے ہوئے اسباب کو نظر انداز کر رہا ہے۔ جیسے کوئی زخم آنے پر مرہم نہ رکھے یا بھوک لگنے پر کھانے سے انکار کرے اور صرف دعا کرتا رہے تو یہ اللہ کے وضع کردہ نظامِ دنیا کی توہین اور اپنے نفس پر ظلم ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی زندگیوں میں ہمیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دوا لینا اور علاج کروانا ایمان کا حصہ ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: "اللہ تعالیٰ

نے کوئی بیماری ایسی نہیں پیدا کی جس کی دوا نہ بنائی ہو، پس دوا تلاش کرو۔" یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ مادی اسباب کو اپنانا دینی حکم کا ایک تقاضا ہے۔

دوا کے استعمال کے ساتھ ساتھ دعا کی اہمیت ایک دوسرا گہرا پہلو ہے۔ دعا انسان کے روحانی تعلق کا اظہار ہے، یہ اس کا اپنے رب کے ساتھ عاجزی سے جڑنے کا ذریعہ ہے۔ دعا سے انسان کو یہ احساس رہتا ہے کہ ظاہری اسباب محض وسیلہ ہیں، اصل مؤثر ذات اللہ کی ہے۔ دوا خود اپنے اندر کوئی مطلق تاثیر نہیں رکھتی جب تک اللہ کا حکم اور اذن شامل نہ ہو۔ دعا انسان کے دل میں توکل اور امید کو زندہ رکھتی ہے، اسے مایوسی سے بچاتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ ہر ظاہری عمل کے پیچھے ایک غیبی طاقت کارفرما ہے۔

دوا اور دعا کا یہ باہمی ربط انسان کو دو انتہاؤں سے محفوظ رکھتا ہے: ایک جانب مادی اسباب پر اندھا انحصار کرنے کی غفلت، جس میں انسان دوا کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے؛ اور دوسری طرف محض دعا پر اکتفا کرنے کی سستی، جس میں انسان عمل سے ہاتھ کھینچ کر معجزے کی امید لگائے بیٹھتا ہے۔ اسلام نے ان دونوں رویوں کو غلط قرار دیا ہے۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ انسان مادی اسباب کو مکمل شعور، ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ اختیار کرے، بہترین معالجین سے مشورہ لے، دوا کا مناسب استعمال کرے، مگر ساتھ ہی دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے حقیقی شفا کی درخواست کرتا رہے۔

دعا اور دوا کا تعلق ایک گہرے حکیمانہ نظم کی نشاندہی کرتا ہے۔ دوا انسان کے عمل کا مظہر ہے اور دعا اس کی بندگی اور توکل کا۔ دوا اختیار کرنا تدبیر ہے اور دعا کرنا تقدیر کو اللہ کی رضا کے حوالے کرنا ہے۔ تدبیر اور توکل کو اسلام میں ایک دوسرے کا مخالف نہیں سمجھا گیا بلکہ

ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "دوا کرو کیونکہ جس نے بیماری پیدا کی ہے، اس نے اس کی شفا بھی رکھی ہے۔" یہاں دوا اختیار کرنے کو تقدیر پر ایمان کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

لہٰذا، مومن کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ بیماری آئے تو سب سے پہلے اپنی ذمہ داری کو سمجھے، دوا کا انتظام کرے، اس کے اسباب مہیا کرے، علاج میں کوتاہی نہ کرے، اور ساتھ ہی ہر قدم پر دعا کے ذریعے اللہ سے مدد طلب کرے کہ وہ دوا کو مؤثر بنائے اور حقیقی شفا عطا کرے۔ یہی وہ فہم ہے جو انسان کو ظاہری اور باطنی زندگی میں توازن عطا کرتا ہے، اسے نہ دنیا میں سرگردان کرتا ہے اور نہ ہی روحانیت میں بے عملی کا شکار ہونے دیتا ہے۔

آخرکار، انسان کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ دوا کے اثر میں برکت بھی دعا سے آتی ہے، اور دعا کی قبولیت میں حکمت بھی دوا کے ذریعے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اس لیے دعا اور دوا کو الگ الگ خانوں میں رکھ کر دیکھنے کے بجائے ان دونوں کو ایک مکمل نظام کا حصہ سمجھنا چاہیے جس میں بندہ اپنی کوشش بھی کرتا ہے اور اپنے رب پر اعتماد بھی رکھتا ہے۔ دوا کے بغیر دعا، اور دعا کے بغیر دوا، دونوں ادھورے ہیں؛ مکمل کامیابی تب حاصل ہوتی ہے جب دونوں ایک ساتھ چلیں۔

دین سے بغاوت کے اسباب اور راہ حل

شیعہ اثنا عشری مکتب ایک ایسا الٰہی، فکری اور روحانی سرمایہ ہے جو نہ صرف فردِ مؤمن کو اپنے رب، اپنے نفس اور اپنے معاشرے کے ساتھ مربوط کرتا ہے، بلکہ عالمگیر سطح پر عدل، آزادی، مساوات اور معرفت جیسے اصولوں کو انسانی زندگی کا محور بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ مکتب قرآنِ حکیم کی روشنی اور اہل بیت علیہم السلام کی حکمتوں سے ایسا جامع نظامِ فکر فراہم کرتا ہے جو ہر دور، ہر مسئلہ، اور ہر انسانی سوال کا الٰہی و عقلی جواب دے سکتا ہے۔ تاہم ایک دردناک حقیقت یہ ہے کہ اس قدر مکمل، آفاقی اور انسان ساز مکتب کے پیروکار بعض اوقات اپنے ہی مکتب سے بدظن ہو کر، مغرب کے بنائے ہوئے نظریات جیسے مارکس ازم، سوشلزم، کمیونزم، لبرل ازم اور سیکیولرازم کی طرف جھکاؤ اختیار کر لیتے ہیں، اور وہ ان باطل نظریات میں وہی حل تلاش کرنے لگتے ہیں جو ان کے مکتب نے اصل اور فطری صورت میں پہلے سے فراہم کر رکھا ہوتا ہے۔

یہ انحراف صرف شیعہ حلقوں میں نہیں بلکہ اہل سنت میں بھی کم و بیش انہی وجوہات کی بنیاد پر پایا جاتا ہے، کیونکہ بنیادی مسئلہ فقہی اختلافات یا مسلکی امتیاز کا نہیں، بلکہ دین کے زندہ، فکری، روحانی اور انقلابی تصور سے عمومی دوری کا ہے۔ جب دین کو رسمی، محدود، اور غیر مربوط انداز میں پیش کیا جائے، تو وہ افراد، خصوصاً نوجوان نسل، جن کے دل میں انسانی عظمت، معاشرتی عدل، اور فکری آزادی کی طلب ہو، وہ دین کو اپنے سوالات کے جوابات

کے لیے ناکافی سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ صرف ان کی محدود علمیت یا ناقص تبلیغ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مسئلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ جب دین کو مولویانہ، سطحی اور رسوماتی انداز میں سکھایا جاتا ہے، جہاں فقط عبادات، مکروہات، اور جزئی فقہی احکام پر زور ہو، اور دین کے سماجی، سیاسی، معاشی، اور انقلابی پہلوؤں کو یا تو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے، یا انہیں بدعت، خطرہ، یا اختلاف کا باعث قرار دے دیا جائے، تو نتیجتاً دین کا وہ چہرہ سامنے آتا ہے جو فکری تحریکوں کی قیادت کرنے کے بجائے صرف ماضی کے نوحوں، تعزیوں، اور مجازی تقدس کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ جب کسی نسل کو دین کے اس محدود تصور سے روشناس کرایا جاتا ہے، اور ساتھ ہی دنیا کے ظلم، طبقاتی ناانصافی، سرمایہ داری کی درندگی، اور سماجی جبر سے بھی سابقہ پڑتا ہے، تو وہ فطری طور پر ایسے نظریات کی طرف دیکھتی ہے جو عدل اور انقلابی اقدام کی بات کرتے ہیں، چاہے وہ نظریات اصل میں انسان کو روحانی اور اخلاقی زوال کی طرف ہی کیوں نہ لے جا رہے ہوں۔

مارکس ازم، سوشلسٹ اور لبرل فکر اپنی بنیاد میں الہامی یا روحانی نہیں بلکہ خالص مادی، انسان پرست اور بعض اوقات خدا دشمن بنیادوں پر قائم ہیں۔ یہ نظریات اگرچہ ظاہراً انسانی حقوق، مساوات، یا مظلوم کی حمایت کی بات کرتے ہیں، لیکن ان کے اندر وہ روحانی توازن، اخلاقی تطہیر اور فطری وحدت موجود نہیں جو ایک انسان کو ظاہری نجات سے باطنی کمال کی طرف بھی لے جائے۔ جب ایک شیعہ نوجوان، جس کے پاس نہج البلاغہ کا امام، دعاوں کا زین العابدین، قربانی کا حسین، اور عدل کا مہدی ہو، وہی نوجوان جب مغربی

فلسفوں سے روشنی لینے کی کوشش کرے، تو دراصل یہ اس مکتب کی عظمت سے لاعلمی، یا اس کی غلط نمائندگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اکثر لوگ مکتب اہل بیت سے اس لیے بدظن ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اس مکتب کو صرف فقہ کے چند مسائل، روزہ نماز کے احکام، یا علماء کے اندرونی اختلافات کی صورت میں دیکھا ہے۔ ان تک امام علیؑ کی حکومت کا وژن، امام حسینؑ کی انقلابی روح، امام سجادؑ کی دعاؤں میں چھپے نظریاتی نکات، یا امام باقر و امام صادق علیہما السلام کی علمی تحریکات کی گہرائی نہیں پہنچی۔ جب علماء خود ان بلند افکار کو عوام تک لے جانے میں کوتاہی برتیں، جب منبر پر صرف روایتی خطابت ہو، اور جب تعلیمی ادارے جدید انسان کے سوالات کو دین کے تناظر میں حل کرنے کی کوشش نہ کریں، تو لوگ اپنے ذہن کے خلا کو مغربی اصطلاحات سے بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب نے اپنے فکری نظریات کو سائنسی اصطلاحات، جدلیاتی بحثوں، اور انسان دوستی کی زبان میں ایسا لپیٹ کر پیش کیا ہے کہ وہ بظاہر دین سے زیادہ عقلی، زیادہ عادلانہ اور زیادہ سائنسی نظر آتے ہیں، حالانکہ وہ صرف ایک خالی اور مصنوعی ساخت رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر دین کی زبان وہی پرانی، جامد، اور جذباتی رکھی جائے، جس میں جدید انسان کی فہم اور سوالات کے لیے کوئی جگہ نہ ہو، تو دین کی تاثیر محض رسوم و روایات تک محدود ہو جاتی ہے۔

اس افسوسناک صورتِ حال کا حل نہ صرف ممکن ہے بلکہ ذمہ داری بھی ہے۔ ہمیں مکتب اہل بیت کو محض فقہی دائرے سے نکال کر، اسے انسانی زندگی کے ہر پہلو میں زندہ، مربوط،

اور فعال نظامِ ہدایت کے طور پر پیش کرنا ہو گا۔ ہمیں امام خمینی، شہید مطہری، شہید صدر، علامہ طباطبائی اور علامہ اقبال جیسے مفکرین کی طرح دین کو فلسفہ، سیاست، اقتصاد، تعلیم اور تربیت کے میدان میں فعال کرنا ہو گا۔ دین کو دلائل، حکمت، اور جدید استدلال کے ساتھ پیش کرنا ہو گا، نہ کہ محض حرام و حلال کے فتووں یا بدعت و ثواب کے جذباتی بیانات میں محدود کر دینا چاہیے۔

دین کے انقلابی پہلو کو زندہ کرنے کے لیے منبر، مدرسہ، یونیورسٹی، میڈیا، اور والدین سب کو مشترکہ حکمت عملی کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ اگر ہم نے دین کے اس اصل اور روشن چہرے کو وقت کی زبان میں پیش نہ کیا، تو مغرب اپنی باطل روشنیوں سے ہماری نسلوں کو اندھیروں میں گم کرتا رہے گا، اور ہم خاموشی سے ان کے فریب کو اپنی نجات سمجھتے رہیں گے۔

پس آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مکتب اہل بیت کی عقلانی، روحانی، اور انقلابی بصیرت کو مٹی سے جھاڑ کر، اسے امت کی آنکھوں کے سامنے حقیقی عظمت کے ساتھ رکھا جائے تاکہ وہ نہ صرف اس پر فخر کریں بلکہ اپنی زندگی کی سمت اور شعور کا مرکز بھی اسی کو بنائیں۔ کیونکہ یہ مکتب ہی ہے جو دنیا کو حقیقی آزادی، عدل، نجات اور خدا سے جوڑنے والی سب سے روشن راہ فراہم کرتا ہے۔

ذھین دماغوں کی چوری, ہماری کوتاہیاں اور اس کا علاج

استعمار کی ٹیلنٹ امیگریشن یا دماغوں کی برآمدگی ایک نہایت چالاکی سے ترتیب دی گئی حکمتِ عملی ہے، جس کا بظاہر مقصد تو عالمی ہنرمندوں کو بہتر زندگی کے مواقع فراہم کرنا ہے، لیکن باطن میں یہ کئی گہرے سیاسی، معاشی، اور فکری مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ ماضی میں استعماری طاقتیں نوآبادیاتی نظام کے ذریعے قوموں کے وسائل، زمینیں اور بازار لوٹتی تھیں، لیکن آج کے دور میں وہی عمل علمی، فکری اور انسانی سرمایہ کی شکل میں جاری ہے۔ ترقی یافتہ ممالک جانتے ہیں کہ کسی قوم کی اصل طاقت اس کے پڑھے لکھے، باصلاحیت، اور باکردار نوجوان ہوتے ہیں۔ جب یہی نوجوان بہتر مواقع، امن و اطمینان، اور سائنسی ترقی کی امید پر مغرب کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو ان کے اپنے معاشرے خالی ہو جاتے ہیں۔ ذہانت، مہارت، اور قائدانہ صلاحیتیں وہاں کی خدمت میں لگ جاتی ہیں جہاں کبھی ان کے آباو اجداد کو غلام بنایا گیا تھا۔

یہ برین ڈرین اس وقت ایک غیر محسوس لیکن مؤثر استعماری ہتھیار بن چکا ہے۔ مغرب کی طاقت کا راز صرف ٹیکنالوجی یا معیشت میں نہیں بلکہ ان دماغوں میں ہے جنہیں وہ سستے داموں حاصل کر لیتا ہے، جن کی تربیت پر ہمارے تعلیمی نظام نے سالہا سال خرچ کیا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلم یا تیسری دنیا کے معاشرے، جنہیں ان دماغوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، خالی الذہن اور محتاج بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی لیڈرشپ، ان کی

یونیورسٹیاں، ان کے ہسپتال، اور ان کے تحقیقی ادارے عالمی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ دوسری طرف، انہی دماغوں سے مغربی سسٹم ترقی کرتا ہے، اور انہی کی بنیاد پر وہ باقی دنیا کو مزید علمی اور اقتصادی غلامی کی طرف دھکیلتا ہے۔

یہ ایک ایسا استعماری فریم ورک ہے جس میں طاقتور قومیں کمزور اقوام کے سب سے قیمتی اثاثے—یعنی ان کے انسان—کو انہی کی رضا مندی سے لے لیتی ہیں۔ اس عمل کو اتنا خوشنما اور پُرکشش بنادیا گیا ہے کہ متاثرہ اقوام خود اسے کامیابی اور ترقی سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ اپنے فکری، سائنسی اور تہذیبی مستقبل سے محروم ہو رہی ہوتی ہیں۔ اگرچہ فرد کی سطح پر یہ امیگریشن نفع بخش اور قابلِ فخر نظر آتی ہے، لیکن قوموں کی سطح پر یہ وہی پرانی لوٹ مار ہے، جو اب ذہانت اور ہنر کے ذریعے کی جا رہی ہے۔

یہ بھی سوال اٹھتا ہے کہ اگر ٹیلنٹ امیگریشن اور برین ڈرین سے مقامی معیشتوں کو نقصان پہنچتا ہے، تو مقامی حکومتیں اس پر روک کیوں نہیں لگاتیں؟ اس کا جواب صرف اقتصادی یا تعلیمی نہیں بلکہ سیاسی، تہذیبی، اور نظریاتی تناظر میں بھی تلاش کرنا ہو گا۔

درحقیقت، مقامی حکومتیں اکثر اس قابل ہی نہیں ہوتیں کہ وہ باصلاحیت افراد کے لیے ایسا ماحول فراہم کر سکیں جہاں وہ عزت، مواقع، آزادیِ فکر، اور تحقیق و ترقی کے وسائل حاصل کر سکیں۔ بدعنوانی، اقربا پروری، ادارہ جاتی زوال، اور سیاسی عدم استحکام وہ وجوہات ہیں جو ایک باشعور نوجوان کو اپنے ملک میں پنپنے سے پہلے ہی توڑ دیتی ہیں۔ جب تعلیم یافتہ نوجوان دیکھتا ہے کہ قابلیت کے بجائے سفارش، وژن کے بجائے چاپلوسی، اور سچ کے بجائے

سازباز کو اہمیت دی جارہی ہے، تو وہ اپنی قدر دانی کے لیے کسی ایسے ماحول کی طرف دیکھتا ہے جہاں اس کی مہارت کو پہچانا اور استعمال کیا جاسکے۔

مزید یہ کہ بعض اوقات مقامی حکومتیں خود بھی عالمی مالیاتی اداروں، ترقیاتی ایجنسیوں، یا استعماری ذہنیت رکھنے والے ملکوں کے دباؤ میں ہوتی ہیں۔ یہ دباؤ کبھی قرضوں کی صورت میں، کبھی تجارتی معاہدوں کے ذریعے، اور کبھی تعلیمی پروگراموں اور اسکالرشپ پالیسیوں کی شکل میں سامنے آتا ہے، جو درحقیقت بہترین دماغوں کو باہر لے جانے کا منظم جال ہوتا ہے۔ ان حکومتوں کو برین ڈرین ایک وقتی ریلیف دیتا ہے، کیونکہ ہجرت کرنے والے افراد جو ریمیٹنس بھیجتے ہیں، وہ ملک کے زرمبادلہ کے ذخائر کو سہارا دیتے ہیں۔ یہ ایک سستا اور فوری نفع ہے، جس کے بدلے میں حکومتیں طویل المدتی فکری و صنعتی ترقی کی قربانی دے دیتی ہیں۔

اصل المیہ یہ ہے کہ ان ممالک میں ایسا قومی وژن، مستقل تعلیمی پالیسی، یا صنعتی حکمتِ عملی موجود نہیں جو نوجوانوں کو مقامی سطح پر ترقی کے مواقع دے سکے۔ حکومتیں اکثر صرف "باہر جا کر کچھ بن جاؤ" کی ذہنیت پر کام کرتی ہیں، نہ کہ "یہاں رہ کر کچھ بنا دو" کی فضا فراہم کرتی ہیں۔ اگر ان باصلاحیت افراد کو مقامی سطح پر وہی سہولیات، عزت اور ترقی کی سیڑھیاں دی جاتیں، تو وہ نہ صرف اپنی قوم کے لیے اثاثہ بنتے، بلکہ سائنسی، صنعتی، تعلیمی، اور معاشی شعبہ جات میں ایک انقلابی تبدیلی لا سکتے تھے۔ یوں ریمیٹنس پر انحصار کرنے کی سست اور غیر مستحکم معیشت کی جگہ ایک باوقار، خود انحصار، اور جدید سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔

یہ ایک افسوسناک سچ ہے کہ جہاں مغرب ہمارے دماغوں کو قیمتی سرمایہ سمجھ کر حاصل کرتا ہے، وہیں ہم خود انہیں بوجھ یا صرف رقم کمانے کا ذریعہ سمجھ کر باہر بھیجنے پر خوش ہوتے ہیں۔ اصل تبدیلی تب ممکن ہے جب مقامی حکومتیں صرف افرادی قوت کو باہر بھیج کر ڈالر کمانے کے بجائے ان کے دماغوں کو یہاں بروئے کار لانے کا شعور اور ارادہ پیدا کریں۔

اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ لوکل سماج ترقی کرے اور ہمارا علمی و فکری سرمایہ مغرب کی لیبارٹریوں اور دفتروں میں ضائع ہونے کے بجائے ہمارے اپنے اداروں اور صنعتوں کو روشنی دے، تو اس کے لیے ہمیں صرف سطحی اصلاحات یا وقتی اسکیموں سے آگے بڑھ کر ایک جامع اور بصیرت افروز حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ سب سے پہلے ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ ترقی محض انفراسٹرکچر، بیرونی سرمایہ کاری، یا ریمیٹنس پر نہیں بلکہ انسانی شعور، تعلیم، اور خود مختار وژن پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک ہمارا تعلیمی نظام صرف ڈگری یافتہ ملازمین پیدا کرتا رہے گا، اور معاشرہ صرف پیسے کو کامیابی کا معیار بنائے رکھے گا، تب تک ذہن مغرب کی طرف بھاگتے رہیں گے اور وطن صرف خالی خول بن کر رہ جائے گا۔

ترقی کے لیے سب سے پہلے ہمیں ایک ایسا قومی وژن وضع کرنا ہوگا جو مقامی اقدار، روایات، اور دینی و تہذیبی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اس وژن کے تحت تعلیم کو ایک روحانی، فکری، اور عملی عمل کے طور پر تشکیل دینا ہوگا، جہاں نوجوانوں کو محض نوکری کے لیے نہیں، بلکہ خدمتِ خلق، قیادت، تحقیق، اور جدت کے لیے تیار کیا جائے۔ انہیں یہ شعور دیا جائے کہ ان کا اصل سرمایہ صرف ان کی مہارت نہیں بلکہ ان کی نیت، مقصد، اور

نظریہ ہے۔ وہ اگر اپنے وطن میں رہ کر کچھ پیدا کریں تو وہ صرف خود کو نہیں بلکہ اپنی قوم کو نئی زندگی بخش سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہمیں مقامی صنعتوں، تحقیقی اداروں، اور تعلیمی اداروں کو ریاستی سرپرستی کے تحت مضبوط کرنا ہوگا۔ ہر ضلع، ہر شہر میں علم و ہنر کے مراکز قائم کیے جائیں جہاں نوجوان اپنی صلاحیتوں کو بغیر کسی سفارشی دروازے کے استعمال کر سکیں۔ پبلک سیکٹر میں ریسرچ کے لیے بجٹ بڑھایا جائے اور نجی شعبے کو تحقیق و تخلیق کی طرف مائل کیا جائے، بجائے اس کے کہ صرف تجارت یا کنزیومرزم پر توجہ دی جائے۔ چھوٹے کاروبار، دیہی صنعتیں، اور مقامی ایجاد کاروں کو قومی سطح پر آگے لایا جائے تاکہ وہی لوکل ٹیلنٹ جو بیرونِ ملک جانے کی تیاری میں ہوتا ہے، اپنی مٹی سے جڑا رہے۔

ثقافتی سطح پر بھی ہمیں اپنی عزتِ نفس کو بحال کرنا ہوگا۔ جب تک ایک نوجوان یہ سمجھے گا کہ باہر کی زمین میں ہی عزت، ترقی اور فخر چھپا ہے، تب تک وہ یہاں جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ ہمیں اپنے میڈیا، نصاب، اور اجتماعی شعور کو اس نہج پر لانا ہوگا جہاں مقامی خدمات، مقامی کامیابیاں، اور مقامی جدوجہد کو اصل معیار مانا جائے۔ یہی سوچ ہو جو ایک استاد کو عزت دے، ایک سائنسدان کو مقام دے، ایک کسان کو وقار دے، اور ایک مخلص رہنما کو اختیار دے۔

اس عمل میں دینی رہنماؤں، علمی اداروں، اور باشعور طبقے کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اسلام ہمیں زمین کو آباد کرنے، علم کو عام کرنے، اور خود کو خدا کے نائب کے طور پر قائم کرنے کا نظریہ دیتا ہے۔ یہ نظریہ صرف نماز روزہ تک محدود نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی و

معاشی نظام کے قیام کا داعی ہے۔ جب ہم اس قرآنی اصول کو اپنی قومی پالیسی کا حصہ بنائیں گے کہ "وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنيَا" اور "يَرْفَعِ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ"، تو تب ہم سمجھ سکیں گے کہ ترقی کا راستہ اپنے گھروں، درسگاہوں، کارخانوں اور کھیتوں سے نکلتا ہے، نہ کہ کسی غیر ملکی سرزمین سے۔

ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سوچ بدلیں، اپنے نظاموں کو مقامی بنائیں، نوجوانوں کو مقصد دیں، اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیں جسے صرف معیشت نہیں بلکہ نظریہ، شعور اور بصیرت چلاتی ہو۔ یہی وہ جامع حکمت عملی ہے جو برین ڈرین کو برین گین میں تبدیل کر سکتی ہے، اور ہمارے خوابوں کو ہماری سرزمین پر حقیقت کا روپ دے سکتی ہے۔

ہجرت کی حوصلہ شکنی صرف نعروں یا جذباتی تقریروں سے ممکن نہیں، بلکہ یہ ایک فکری، تہذیبی، اور عملی جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے جو فرد سے آغاز لے کر پورے معاشرے میں سرایت کرے۔ اس جدوجہد کی بنیاد سب سے پہلے خود شعور ہے۔ ہر پڑھا لکھا نوجوان جب تک اپنے آپ کو صرف نوکری کے قابل "سرمایہ" سمجھتا رہے گا، اور اپنی صلاحیتوں کو کسی امیر اور بااختیار ملک میں کیش کرانے کا خواب دیکھتا رہے گا، تب تک وہ اپنی مٹی، اپنی قوم، اور اپنے معاشرتی بگاڑ سے کٹتا جائے گا۔ اس سوچ کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ نوجوان کو یہ یقین دلایا جائے کہ اس کے علم، صلاحیت، اور جدوجہد کی سب سے زیادہ ضرورت اس کے اپنے معاشرے کو ہے، نہ کہ کسی ایسے ملک کو جس نے صدیوں سے ہماری تہذیب، دولت، اور دماغ کا استحصال کیا ہے۔

اس تبدیلی کا آغاز سب سے پہلے فرد کے اندر سے ہونا چاہیے۔ وہ نوجوان جو ہجرت کا ارادہ رکھتا ہے، اُسے یہ سوال خود سے کرنا ہوگا کہ کیا وہ کسی اور کی ترقی کا زینہ بننا چاہتا ہے یا اپنی قوم کی خودمختاری کا معمار؟ اس شعور کی تربیت گھروں، مساجد، تعلیمی اداروں، اور فکری مجالس میں ہونی چاہیے۔ اگر دین ہمیں سکھاتا ہے کہ زمین خدا کی ہے اور اس پر امن و عدل قائم کرنا ہماری ذمہ داری ہے، تو پھر ہم کیوں اپنی زمین چھوڑ کر اس نظام کا حصہ بننا چاہتے ہیں جو خود ظلم و استعمار پر قائم ہے؟ یہاں نوجوانوں کے لیے امام حسین علیہ السلام کا یہ اصولی پیغام مشعلِ راہ ہو سکتا ہے کہ عزت کے ساتھ جینا اور ظلم کے خلاف کھڑے ہونا مومن کا شیوہ ہے۔ کیا ہجرت اُس وقت عزت ہے جب وہ اپنی قوم کو کمزور کر کے کسی غیر قوم کو فائدہ دے؟ یا اصل عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے زخموں پر مرہم رکھے؟

نوجوانوں کو اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ مل کر چھوٹے مگر معنی خیز اقدامات کا آغاز کرنا ہوگا۔ وہ تعلیمی گروپس، تحقیقی حلقے، اور سوشل ایکشن فورمز بنائیں جہاں خود تعلیم، ٹیکنالوجی، کاروبار، اور اخلاقی تربیت پر توجہ دی جائے۔ وہ ہر اُس شعبے کو پہچانیں جہاں مقامی بگاڑ ہے، جیسے تعلیم کا معیار، بے روزگاری، کرپشن، یا ذہنی غلامی، اور اس کو ٹھیک کرنے کے لیے منصوبہ بندی کریں۔ جو نوجوان ایک ملک کی ویزا پالیسی سمجھ سکتا ہے، وہ اپنی قوم کے مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کے دل میں احساسِ ذمہ داری ہو۔

ان نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ ہجرت کو ایک حل کے بجائے ایک سوال کے طور پر دیکھیں۔ کیا میں جا کر اس قوم کا ملازم بننا چاہتا ہوں جس نے میری قوم کو غلام بنایا؟ کیا میری صلاحیت

میرے شہروں، میرے اسکولوں، اور میرے نوجوانوں کی نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک کی میراث ہے؟ یہ سوالات جب سچائی اور احساس کے ساتھ اٹھیں گے، تو دل ہجرت سے متنفر ہونے لگے گا، اور نگاہ واپس اپنی سرزمین کی طرف پلٹے گی۔

اس بیداری کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو اپنی فکری تربیت بھی کرنی ہوگی تاکہ وہ خود کو صرف معاشی جاندار نہ سمجھیں بلکہ ایک فکری اور نظریاتی وجود مانیں، جو دنیا میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ وہ تاریخ کو، تہذیب کو، قرآن کو، اور ائمہ کی سیرت کو اپنا رہنما بنائیں، اور جانیں کہ وہ اکیلے نہیں، بلکہ ایک عالمی امت کا حصہ ہیں جسے زمین پر عدل قائم کرنا ہے۔ وہ اپنے چھوٹے دائرے سے بڑے کام کا آغاز کریں، اور اپنے ساتھیوں کو یہ دکھائیں کہ کامیابی صرف ڈالر یا پاسپورٹ کا نام نہیں، بلکہ یہ اس خودی کا نام ہے جو خدا پر بھروسہ کر کے تبدیلی کا علم اٹھاتی ہے۔

اگر آج کا نوجوان اپنی مٹی سے محبت کرنا سیکھ جائے، تو کل وہی مٹی دوبارہ گلزار بن سکتی ہے۔ اور اگر آج وہ خود کو یہاں کے بگاڑ سے لاتعلق سمجھ کر ہجرت کر جائے، تو کل وہ بھی ایک بے چہرہ فرد بن جائے گا، جس کی شناخت صرف ایک ورک ویزا ہوگی۔ اس لیے ہمیں آج ہی سے اپنے دل، دماغ، اور ارادے کو بیدار کر کے اپنے گھروں، مدرسوں، اور محفلوں میں یہ عہد لینا ہوگا کہ ہم اس زمین کو چھوڑیں گے نہیں، سنواریں گے۔

مولوی کی عدمِ خود شناسی اور نوجوانوں کی تشنگی

مولوی کی شخصیت مسلمانوں کے معاشرے میں صدیوں سے دین، علم، اور رہنمائی کا استعارہ رہی ہے، لیکن آج کے دور میں "مولوی" کا لفظ اکثر طنز، تنگ نظری، دقیانوسیت اور حتیٰ کہ منافقت کی علامت بن چکا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس منصب کو معاشرے کی اصلاح، انسانوں کی ہدایت، اور امت کے فکری و اخلاقی نظام کی رہبری کا مرکز ہونا چاہیے تھا، وہ خود اپنی عوام، اپنے پیروکاروں اور حتیٰ کہ اپنے پیشہ ور ساتھیوں کی زبان پر تنقید کا نشانہ بن چکا ہے۔

اس بدنامی کی کئی گہرائی میں چھپی ہوئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ مولوی کی شخصیت عمومی طور پر ایک مخصوص ظاہری ڈھانچے، محدود فکری دائرے اور غیر عملی طرزِ زندگی کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ اس کی گفتگو دنیا سے کٹی ہوئی، حقیقت سے دور، اور وقت کے مسائل سے نابلد نظر آتی ہے۔ وہ جدید علوم، سائنس، سیاست، معیشت، اور انسانی نفسیات جیسے بنیادی موضوعات سے اجتناب کرتا ہے یا انہیں بدعت اور دنیا پرستی کے زمرے میں ڈال دیتا ہے، جس سے دین ایک محدود، رسمی اور خشک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مولوی کی دعوت وہ کشش کھو دیتی ہے جو روح کو بیدار کرے، عقل کو متوجہ کرے اور معاشرے کو حرکت دے۔

دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ بعض مولوی حضرات دین کو محض ذریعہ معاش یا سماجی اثر و رسوخ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کی خطابت میں جذباتی استحصال، شخصیت پرستی، اور بعض اوقات فرقہ واریت کو ہوا دینے والے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ جب عوام دیکھتی ہے کہ دین کے نام پر ذاتی مفادات کی تکمیل ہو رہی ہے، اخلاص کی جگہ شہرت، تقویٰ کی جگہ چالاکی، اور فقر کی جگہ دنیا داری نے لے لی ہے، تو وہ دین سے نہیں بلکہ دین کے نمائندہ بننے والے مولوی سے بدظن ہو جاتی ہے۔ یہ بدگمانی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ بعض دیندار طبقے بھی مولوی کے کردار سے دامن بچاتے ہیں اور دین کی اشاعت کے لیے نئی اصطلاحات، جیسے "اسکالر"، "فکرِ دینی ماہر"، یا "علمی و فکری رہنما" کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ عوام کو اس پچھلی مایوسی سے نکالا جا سکے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ مولوی کے بیچ خود بھی تنقیدی بصیرت کا فقدان ہوتا ہے۔ وہ اپنے حلقے کے سوا دوسروں کو گمراہ، بدعتی یا کم فہم سمجھتا ہے، اور اس میں اپنی صفوں کی اصلاح کی جرأت یا خواہش نہیں پائی جاتی۔ جب کبھی کوئی مولوی حضرات خود اپنے طبقے کی کوتاہیوں پر بات کرتا ہے تو وہ عوام میں مقبول تو ہوتا ہے، لیکن اپنے طبقاتی حلقے میں مشکوک، حتیٰ کہ "باغی" قرار دیا جاتا ہے۔ یہی تضاد بتاتا ہے کہ مسئلہ صرف عوام کے فہم کا نہیں، بلکہ خود مولوی کے طرزِ فکر، اندازِ دعوت، اور عملی کردار کا بھی ہے۔

بعض دینی مدارس میں پائی جانے والی تربیت بھی اس مسئلے کا حصہ ہے۔ جب طلباء کو دنیا کے فکری چیلنجز، جدید انسانی علوم، اور بین الاقوامی سیاسی منظرنامے سے کٹا ہوا رکھا جاتا ہے، اور ان کی دینی تربیت کو صرف ماضی کی کتب، لغوی بحثوں اور رسمی اسناد تک محدود کر دیا

جاتا ہے، تو ان سے ایک ایسا مولوی پیدا ہوتا ہے جو فتوے دے سکتا ہے لیکن دلوں کو جیتنے، قوم کو جگانے، یا دین کی روحانی و تمدنی رہنمائی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ میڈیا اور مغربی تہذیب نے دانستہ طور پر مولوی کی شخصیت کو طنز، ہنسی مذاق، اور دقیانوسیت کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے تاکہ عوام دین سے دور ہو جائیں۔ لیکن اگر مولوی خود اپنی اصلاح کرتا، سچے علم و عمل کا پیکر بنتا، اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ دعوتی زبان اختیار کرتا، تو یہ سازش کامیاب نہ ہوتی۔

آخرکار، مسئلہ خود لفظ "مولوی" یا اس کے لباس و وضع قطع کا نہیں، بلکہ اس کے علم، اخلاص، وسعتِ نظر، اور فکری رہنمائی کی صلاحیت کا ہے۔ جب تک مولوی کا کردار قرآن، نہج البلاغہ، سیرتِ معصومین، اور انسان کی جدید نفسیاتی و معاشرتی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں ہو گا، وہ عوام کے لیے رہنما بننے کے بجائے الزام بن کر رہ جائے گا۔ اور جب وہ خود کو فقط محراب و منبر کے قیدی سے نکال کر قوم کے فکری معمار کے طور پر پیش کرے گا، تبھی اس کی حیثیت، وقار اور اعتماد بحال ہو گا۔ بصورت دیگر، لوگ دین کو مولوی سے جدا کر کے نجات تلاش کرتے رہیں گے، اور یہ نجات اگر دین کی حقیقی روح تک نہ لے جائے تو وہی مارکس، فرائڈ، یا نیٹشے کی بھول بھلیوں میں کھو جانے کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

اسلامی احکام میں تضاد کی حقیقت

اسلام ایک ایسا دین ہے جو فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے اور انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں توازن اور اعتدال کو بنیادی اصول قرار دیتا ہے۔ قرآنِ مجید اور سیرتِ معصومین علیہم السلام میں ہمیں بارہا ایسی تعلیمات ملتی ہیں جن میں بظاہر تضاد محسوس ہوتا ہے، مگر حقیقت میں وہ ایک عمیق حکمت اور جامع توازن کا مظہر ہوتی ہیں۔ اسلام نہ افراط کی اجازت دیتا ہے اور نہ تفریط کی، بلکہ ہر شے میں میانہ روی کو اپناتا ہے تاکہ انسان اپنی روحانی، جسمانی، معاشرتی اور اخلاقی ترقی میں متوازن راستہ اختیار کرے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے " :وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَٰكُمۡ أُمَّةٗ وَسَطٗا "یعنی "ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت بنایا۔" (البقرہ:143)۔ اس آیت میں واضح طور پر امتِ مسلمہ کی پہچان ہی اعتدال اور توازن قرار دی گئی ہے۔ نہ صرف عبادات میں بلکہ عقائد، اخلاق، معیشت، معاشرت، سیاست، جہاد اور حتیٰ کہ لباس، کھانے پینے اور تفریح تک میں اسلام اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔

اگر ہم اسلامی احکام میں بظاہر تضاد محسوس کریں تو ان میں گہرائی سے غور کرنے پر ہمیں حکیمانہ توازن نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک طرف اسلام دنیا سے بے رغبتی یعنی زہد کی تلقین کرتا ہے، جیسے فرمایا" :إِنَّمَا ٱلۡحَيَوٰةُ ٱلدُّنۡيَا لَعِبٞ وَلَهۡوٞۚ "یعنی "دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشہ ہے" (الانعام: 32)، دوسری طرف یہی اسلام محنت، تجارت، زراعت، خدمتِ

خلق، رزقِ حلال کمانے اور دنیاوی معاملات میں سستی نہ برتنے کا حکم دیتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص دنیا کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ حلال کمائے، اپنے اہل وعیال کی کفالت کرے اور دوسروں سے بے نیاز رہے، وہ اللہ کے راستے میں مجاہد کی طرح ہے۔" پس اصل اعتراض دنیا پر نہیں، دنیا پرستی پر ہے۔ یہ توازن انسان کو دنیا کی سہولیات سے استفادہ کرنے کی اجازت دیتا ہے، مگر ساتھ ہی آخرت کی یاد دہانی کراتا ہے تاکہ وہ مقصدِ حیات کو نہ بھولے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر عبادت کے سلسلے میں بھی اعتدال کی تلقین کی گئی ہے۔ بعض افراد اتنے عبادات میں مشغول ہو جاتے تھے کہ بیوی بچوں کو نظر انداز کر دیتے، نیند و آرام کو ترک کر دیتے، اور دنیاوی فرائض سے غفلت برتتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے افراد کی سختی سے مذمت کی اور فرمایا: "میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کی عبادت کرنے والا ہوں، مگر میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور کھاتا بھی ہوں، عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، شادی بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقے (سنت) سے منہ موڑے وہ مجھ سے نہیں۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف عبادات میں بلکہ طرزِ زندگی میں بھی اسلام سختی، رہبانیت یا ترکِ دنیا کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ متوازن طرزِ حیات کو پسند کرتا ہے۔

اسلام میں خرچ کرنے کے بارے میں بھی یہی توازن نظر آتا ہے۔ ایک طرف صدقہ، انفاق، اور ایثار کی ترغیب ہے، اور دوسری طرف قرآن کہتا ہے" : وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومًا مَّحۡسُورًا" (بنی اسرائیل:29) یعنی "نہ تو

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ رکھو (بخیل بن جاؤ)، اور نہ ہی اسے حد سے زیادہ کھول دو (فضول خرچی کرو)، ورنہ ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو جاؤ گے۔" یہاں بھی اعتدال ہی بہترین راہ قرار پایا۔

جہاد اور صبر کی مثال بھی قابلِ توجہ ہے۔ اسلام ایک طرف مظلوموں کے دفاع اور حق کی سربلندی کے لیے جہاد کا حکم دیتا ہے، مگر ساتھ ہی صبر، برداشت، صلح، اور عفوو درگزر کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ ہر مقام پر مختلف رویوں کا حکم دینا دراصل حالات، مقاصد اور مصلحتوں کے مطابق توازن پیدا کرنا ہے، نہ کہ کوئی تضاد۔ کبھی دشمن کے سامنے ڈٹ جانا افضل ہوتا ہے، اور کبھی عفوو درگزر، جیسا کہ امام حسن علیہ السلام کا صلح کرنا اور امام حسین علیہ السلام کا قیام کرنا، دونوں ہی اسلام کے توازن کی دو روشن مثالیں ہیں۔

حتیٰ کہ خوف اور امید کے درمیان توازن بھی اسلام کی نفسیاتی تربیت کا حصہ ہے۔ ایک طرف جنت کی نعمتوں اور اللہ کی رحمت کا تذکرہ ہے، اور دوسری طرف جہنم کی وعید اور اللہ کے عذاب کا ذکر۔ مقصد یہ ہے کہ انسان نہ تو صرف امید میں غرق ہو کر غافل ہو جائے، نہ ہی صرف خوف سے مایوس ہو جائے، بلکہ ان دونوں کے درمیان چل کر بیداری اور رجوع الی اللہ کی راہ پر قائم رہے۔

اسلامی اخلاقیات میں بھی یہی اصول جاری ہے۔ تواضع کو پسند کیا گیا مگر ذلت اور کم ہمتی سے روکا گیا۔ خودداری کی حوصلہ افزائی کی گئی مگر تکبر کی مذمت کی گئی۔ محبت و شفقت کو فضیلت قرار دیا گیا مگر بے جا نرمی اور بے غیرتی سے منع کیا گیا۔ یہ سب اعتدال ہی کے مظاہر ہیں۔

اسی طرح ایک مثال کو ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں جیسے کہ ایک طرف اسلامی تعلیمات کہتی ہیں کہ دنیا بری جگہ ہے دنیا میں مگن نہ ہو دوسری طرف دوسرے مسلمانوں کیلئے ان کی دنیا کے مسائل کے حل کرنے کو فضیلت گردانتا ہے۔ یہ بات بظاہر متضاد لگ سکتی ہے کہ ایک طرف اسلامی تعلیمات دنیا سے دل نہ لگانے اور اسے فانی، دھوکہ دینے ولی جگہ قرار دیتی ہیں، اور دوسری طرف لوگوں کے دنیاوی مسائل کو حل کرنے کو عظیم نیکی اور قربتِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیتی ہیں۔ مگر حقیقت میں ان دونوں باتوں میں گہرا توازن اور حکمت ہے۔

اسلام دنیا کو بذاتِ خود برا نہیں کہتا، بلکہ اس دنیا میں معن ہونا، اس سے دل لگا لینا، اسے مقصدِ حیات بنا لینا اور آخرت کو بھول جانا قابلِ مذمت ہے۔ ورنہ یہی دنیا امتحان کی جگہ ہے، یہی وہ میدان ہے جہاں انسان اپنی نجات یا ہلاکت کا سامان تیار کرتا ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے اگر کوئی شخص صرف اپنی ذات کی فکر کرے، مال و دولت، شہرت اور لذتوں میں کھو جائے تو وہ قابلِ مذمت ہے۔ لیکن اگر وہی انسان دوسروں کے دکھ درد بانٹے، معاشرے کے مسائل حل کرے، فقر و فاقہ میں مبتلا لوگوں کی مدد کرے، عدل قائم کرے، اور کمزوروں کی پشت پناہی بنے تو وہی دنیا اس کے لیے آخرت کی کھیتی بن جاتی ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگیوں سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے دنیا سے زہد بھی برتا، مگر اسی دنیا میں لوگوں کے حقوق کے لیے کھڑے ہوئے، ان کی غربت، بیماری، جہالت اور ظلم کے خلاف جدوجہد کی۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: "دنیا کی سب سے بہتر چیز یہ ہے کہ اس میں کسی مظلوم کی مدد کی جائے یا کسی نیکی کا موقع ہاتھ آئے۔"

پس اسلام کا پیغام یہ ہے کہ دنیا کو مقصد نہ بناؤ، اسے ذریعہ بناؤ۔ اللہ کی رضا کے لیے بندوں کی خدمت کرو، مگر دنیا کے عیش و عشرت میں نہ کھو جاؤ۔ یہی ظاہری تضاد کا دراصل توازن ہے، جو ایک بامقصد زندگی کی بنیاد بنتا ہے۔

خلاصتاً یہ کہ اسلام کی روح سراسر اعتدال ہے۔ اس کا ہر حکم انسانی فطرت، سماجی حقیقت اور روحانی ضرورت کے توازن پر مبنی ہے۔ بظاہر جو احکام ایک دوسرے سے مختلف یا متضاد لگتے ہیں، وہ دراصل مختلف حالات و مزاج کے تقاضوں کے مطابق دی گئی رہنمائی ہے۔ یہی جامعیت، یہی حکمت، یہی اعتدال اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات بناتا ہے، جو نہ صرف روح کو سیراب کرتا ہے بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں توازن عطا کرتا ہے۔

تبرا کی نفسیاتی، سماجی اور روحانی جہتیں

تبرا یا براءت کا عمل، شیعہ عقیدے میں حق و باطل کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کا ایک روحانی و نظریاتی عمل ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے منافقوں پر کھل کر تبرا کیا جاتا ہے جبکہ موجودہ دور کے استعمار، منافق حکمرانوں یا صہیونی نظام پر اتنی شدت سے آواز بلند نہیں کی جاتی تو یہ ایک گہری نفسیاتی و سماجی جہت رکھتا ہے۔

انسانی نفسیات کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ ماضی کی چیزوں پر رائے دینا یا ردِ عمل ظاہر کرنا آسان سمجھتا ہے، کیونکہ وہ غیر متحرک، محفوظ اور نسبتاً بے ضرر ہوتا ہے۔ تاریخ کے فسادی کرداروں پر تبرا کرنے سے انسان کو نہ تو سماجی ردعمل کا خوف ہوتا ہے، نہ ہی معاشی یا سیاسی نقصان کا۔ یہ ایک محفوظ دائرہ ہے جس میں فرد یا گروہ اپنی عقیدت، وابستگی اور وفاداری کو بغیر کسی خطرے کے ظاہر کر سکتا ہے۔ اسے نہ کسی ملازمت کے جانے کا اندیشہ ہے، نہ ہی سوشل بائیکاٹ یا ریاستی انتقامی کارروائی کا خوف۔

دوسری طرف، جب موجودہ دور کے منافقوں پر بات کرنے کی بات آتی ہے تو انسانی نفسیات میں خطرے کا سگنل فوراً متحرک ہو جاتا ہے۔ "فائٹ یا فلائٹ" ریسپانس، جسے دماغ کا ایمیگڈیلا کنٹرول کرتا ہے، فوری طور پر انسان کو یہ باور کراتا ہے کہ اب جو بات کہی جا رہی ہے وہ سماجی یا جسمانی خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ مثلاً، اگر کوئی صہیونی استعمار یا مقامی منافق حکمرانوں پر تنقید کرے، تو اسے ملازمت، سوشل اسٹیٹس، یا حتیٰ کہ جان کے خطرے

کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ ذہن بے ساختہ طور پر خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح کا تنقیدی تبرا ترک کر دیتا ہے یا اسے کسی محفوظ، مبہم پیرائے میں پیش کرتا ہے۔

اس کیفیت کو "کو نگنیٹیوڈس آنینس (Cognitive Dissonance) " کہا جا سکتا ہے، جب فرد کا اعتقادی نظام ایک طرف حق گوئی کا مطالبہ کرتا ہے مگر عملی دنیا کے خطرات اسے خاموشی یا نرمی پر مجبور کرتے ہیں۔ اس تضاد کو دور کرنے کے لیے انسان اپنی خاموشی کو "حکمت" یا "مصلحت" کا نام دیتا ہے تاکہ اندرونی بے چینی سے بچا جا سکے۔ مگر اصل میں یہ نفسیاتی دفاعی میکانزم ہوتا ہے، جو فرد کو ذہنی سکون دینے کے لیے حقائق کی تلخی سے نظریں چرا لیتا ہے۔

مزید بر آں، جدید دنیا میں میڈیا، سرمایہ، اور طاقت کا جو نیٹ ورک ہے وہ اس قدر طاقتور ہے کہ انسان خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ تاریخ کے منافقوں پر تبرا کرنے سے ایک قسم کا جذباتی ریلیف (catharsis) حاصل ہوتا ہے، جبکہ موجودہ استعمار کے خلاف بولنا ایک لاحاصل جدوجہد محسوس ہوتی ہے، جس کا نتیجہ شاید صرف نقصان کی صورت میں نکلے۔

اس تمام عمل کو اگر روحانیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ انسان کی آزمائش کی ایک اہم شکل ہے۔ وہی تبرا جو ماضی میں محض جذباتی نعرے بن چکا ہے، اگر حال کے منافقوں پر کیا جائے تو یہ قربانی، اخلاص، اور شہادت کے مفہوم سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

قرآن میں "وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا" کی وعید صرف ماضی کے ظالموں کے لیے نہیں بلکہ ہر دور کے منافقین کے لیے ہے، جن کے خلاف خاموشی اختیار کرنا اصل امتحان ہے۔ پس فرق دراصل نفس کے خوف، دنیاوی فائدے کے عشق، اور اجتماعی بے حسی کا نتیجہ ہے، جس کا علاج صرف اس وقت ممکن ہے جب انسان کی بصیرت، شجاعت اور توکل، شعور کے درجے سے آگے عمل کے درجے تک پہنچ جائے۔

اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ تاریخ کو صرف عبرت کے طور پر نہ دیکھا جائے بلکہ اسے حال میں عمل کی بنیاد بنایا جائے۔ ماضی کے منافقوں پر تبرا کرنا اس وقت تک مفید نہیں جب تک اس کے ذریعے ہم اپنے حال کی پہچان اور اصلاح نہ کریں۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ماضی کے فسادی صرف اس لیے ظلم کر سکے کہ ان کے زمانے کے لوگ خاموش رہے، مصلحتوں میں الجھے رہے یا وقتی فوائد کے عوض حق کا ساتھ نہ دے سکے۔ اگر ہم بھی آج کے فسادی نظام، منافق کرداروں، اور استعمار کے نمائندہ رویوں کے سامنے خاموش رہیں تو ہمارا انجام بھی تاریخ کے ان گمراہوں کی صف میں شامل ہونے جیسا ہو گا جنہوں نے امامِ حق کا ساتھ نہ دیا۔

لہٰذا سب سے پہلے ہمیں اپنے اندر یہ شعور بیدار کرنا ہو گا کہ برائی کے خلاف کھڑا ہونا صرف زبان سے نہیں، بلکہ عمل سے ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں وہ تمام چیزیں ترک کرنا ہوں گی جو کسی بھی سطح پر ظلم، منافقت یا استعمار کی تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ چاہے وہ حرام کمائی ہو، ظلم پر خاموشی ہو، یا ناحق طاقتوں کی تائید ہو، ہمیں اپنے وجود کو ان سے پاک کرنا ہو گا۔

ساتھ ہی، ہمیں اپنی ذات کی تعمیر ایسے کردار پر کرنی ہوگی جو حق گو، با اخلاق، اور سماجی انصاف کا داعی ہو۔ اپنے عمل سے ہمیں معاشرے میں وہ تبدیلی لانی ہوگی جو فساد کے خلاف دیوار بن سکے۔ اگر ہم سچ بولیں، عدل پر چلیں، کمزوروں کا ساتھ دیں، اور حق کے راستے پر استقامت دکھائیں تو ہم نہ صرف اپنے زمانے کے فسادیوں کا راستہ روک سکتے ہیں بلکہ اپنی آخرت کی بنیاد بھی اللہ کی رضا پر رکھ سکتے ہیں۔

یہی وہ اصل تبرا ہے جو صرف ماضی کے چہروں کو لعن طعن کرنے تک محدود نہیں، بلکہ حال کے طاغوت کے خلاف عمل، قربانی اور شعور سے لبریز ایک زندہ موقف ہے۔ اور یہی وہ راہ ہے جو ہمیں ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت سے ملتی ہے—کہ جہاں حق ہو، وہیں کھڑے ہو جاؤ، چاہے تمہیں تنہا ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

جدید دور میں "تولّا" کیا ہے؟

تولّا، یعنی اہل بیت (علیہم السلام) سے محبت اور ان کی حمایت کرنا، شیعہ عقیدے میں ایک بنیادی اور اہم اصول ہے جو ایمان کے حصہ کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ تولّا کا مفہوم صرف جذباتی محبت یا ظاہری تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مکمل عقیدہ ہے جس میں انسان اپنے عمل، فکر، اور زندگی کے ہر پہلو میں اہل بیت (علیہم السلام) کے راستے کو اختیار کرتا ہے۔ تولّا کا یہ عمل دراصل حق و باطل کے درمیان ایک واضح تفریق قائم کرتا ہے، جیسے کہ تبرا باطل کے خلاف ایک اعلان ہے، تولّا حق کے ساتھ وابستگی اور اس کی حمایت کا عملی اظہار ہے۔

تولّا کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماضی اور حال دونوں تناظرات میں اس کے اثرات کو دیکھنا ضروری ہے۔ تاریخ میں جب اہل بیت (علیہم السلام) کے دشمنوں کے سامنے کھڑا ہونے کی بات آئی، تو تولّا کے پیروکاروں نے اپنی جان و مال کی قربانی دینے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ حضرت علی (علیہ السلام) کی حمایت میں اور امام حسین (علیہ السلام) کی جدوجہد میں شریک ہونا، حقیقتاً تولّا کے عملی اظہار کے مختلف مظاہرے تھے۔ تولّا کا یہ عمل انسان کو صرف ایک عقیدہ تک محدود نہیں کرتا بلکہ اس کے عمل، کردار اور روزمرہ کی زندگی میں انقلاب لاتا ہے۔ جب انسان اہل بیت (علیہم السلام) سے محبت اور ان کی حمایت کو اپنے نظریات کا حصہ بناتا ہے تو وہ ان کے اصولوں، تعلیمات اور سیرت کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیتا ہے۔

موجودہ دور میں تولّا کا مفہوم اور اس کا اطلاق ایک پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس دور میں جب انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف سیاسی، سماجی، اور ثقافتی چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے، تولّا صرف ایک نظریاتی وابستگی نہیں رہتا بلکہ یہ ایک عملی ترجیح بن جاتا ہے۔ موجودہ دور میں جب ہم اہل بیت (علیہم السلام) کی محبت کو اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہمیں ان کے ساتھ اپنی وفاداری کو محض عقیدت تک محدود نہیں رکھنا پڑتا، بلکہ اس وفاداری کو عمل میں لانے کے لیے کئی بار ہمارے سامنے ایسی آزمائشیں آتی ہیں جہاں ہمیں حق کی حمایت میں جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات، افعال، اور اعمال میں اہل بیت (علیہم السلام) کے اصولوں کے مطابق چلیں، چاہے اس کے نتیجے میں ہم دنیاوی طور پر نقصان اٹھائیں یا مشکل میں پڑیں۔

یہاں تولّا کا تصور ایک مکمل طرزِ زندگی بن جاتا ہے، جو انسان کو ہر لمحہ یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ کس راستے پر چل رہا ہے اور کس مقصد کے لیے اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم صرف اپنی عبادات اور عقائد میں اہل بیت (علیہم السلام) سے محبت دکھائیں، بلکہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں، اپنے برتاؤ، اپنے فیصلوں، اپنے رویوں اور حتیٰ کہ اپنے رشتہ داریوں میں بھی ان کے اصولوں اور اخلاقی سیرت کو اپنائیں۔ تولّا کا مقصد صرف یہ نہیں کہ ہم اہل بیت (علیہم السلام) کے ساتھ محبت کریں، بلکہ اس محبت کا عملی اظہار کرتے ہوئے ہم اپنی زندگی کو ان کے ساتھ جڑ کر جئیں۔

جب ہم تولّا کی حقیقت کو اس گہرائی سے سمجھتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہ محض ایک روحانی جذبہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی انقلاب کا پیغام بھی ہے۔ امام حسین

(علیہ السلام) کی کربلا میں دی گئی قربانی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے کہ تولّا صرف محض محبت نہیں بلکہ ان کے اصولوں کی حمایت اور ان کے راستے پر چلنا ہے۔ آج کے دور میں بھی ہم جب تولّا کو اپنانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کے ساتھ جڑ کر ہم ظالموں اور منافقوں کے خلاف اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے ہیں اور حقیقت کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

تولّا کے اس تصور کو اگر ہم مزید گہرائی سے دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبت کا ایک ذاتی، انقلابی اور اجتماعی عمل ہے جو انسان کو ہر سطح پر مضبوط بناتا ہے۔ اسے صرف فردی تعلقات یا جذبات کی حد تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو اہل بیت (علیہم السلام) کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کو بنانے اور دنیا میں عدل قائم کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

جدید دور میں تولّا کا سیاسی، سماجی، اور معاشی مصداق دراصل ایک جامع اور پیچیدہ عمل بن چکا ہے جو انسان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں اہل بیت (علیہم السلام) کی تعلیمات کو عملی طور پر نافذ کرنے کی ایک جدوجہد کی شکل اختیار کرتا ہے۔ سیاسی سطح پر تولّا کا مصداق اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ہم کسی بھی معاشرتی، سیاسی، یا عالمی نظام میں اہل بیت (علیہم السلام) کے اصولوں کے مطابق حق اور انصاف کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا مظاہرہ ہے کہ ہم ظالم حکمرانوں یا استعماری طاقتوں کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں، اور اس راستے پر چلتے ہیں جو انسانیت کے مفاد میں ہو، چاہے اس میں ہمیں کسی بھی قسم کا سیاسی یا سماجی خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ امام حسین (علیہ السلام) کی کربلا میں دی جانے والی قربانی اس بات کا عملی

نمونہ ہے کہ کس طرح ایک فرد اپنی سیاسی اور سماجی ذمہ داریوں کو قبول کر کے اصولوں پر ثابت قدم رہتا ہے، چاہے اس کے نتیجے میں اس کی جان بھی جا سکے۔

سماجی سطح پر تولّا کا مصداق اس وقت نظر آتا ہے جب ہم اپنے معاشرتی تعلقات میں اہل بیت (علیہم السلام) کے اخلاقی اصولوں کو اپنانا شروع کرتے ہیں۔ یہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر انصاف، محبت، قربانی، اور ہمدردی کی بنیاد پر معاشرتی تعلقات قائم کرنے کا عمل ہے۔ اگر ہم اپنے گھریلو اور سماجی تعلقات میں اہل بیت (علیہم السلام) کے اخلاقی اصولوں کے مطابق چلیں، تو ہم نہ صرف اپنے اندر کی اصلاح کرتے ہیں بلکہ اپنے ار دگرد کے افراد کے ساتھ بھی بہتر تعلقات قائم کرتے ہیں۔ یہ اصول معاشرتی انصاف، اخلاقی بلندیاں، اور انسانی حقوق کے احترام کے تحت سامنے آتے ہیں، جہاں ہم کسی بھی سطح پر کسی کے ساتھ ظلم یا ناانصافی کو برداشت نہیں کرتے۔

معاشی سطح پر تولّا کا مصداق اس وقت بنتا ہے جب ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اہل بیت (علیہم السلام) کے اصولوں کے مطابق انصاف پر مبنی اقتصادی فیصلے کرتے ہیں۔ یہ عمل صرف معاشی نفع کو نہیں دیکھتا بلکہ اس میں انسانیت کی فلاح اور فقر و غنا کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تولّا کا ایک عملی مظاہرہ یہ ہے کہ ہم اپنی کمائی اور کاروبار میں ہر قسم کی دھوکہ دہی، بدعنوانی، اور ناجائز ذرائع سے بچیں، اور اس کے بجائے حلال اور پاکیزہ ذرائع سے رزق کمائیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم دوسروں کی مدد کرنے، غریبوں کا خیال رکھنے، اور معاشی انصاف کی فراہمی کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں۔

جدید دور میں تولّا صرف ایک روحانی اور عقیدتی عمل نہیں بلکہ ایک انقلابی تحریک بن چکا ہے جو نہ صرف فرد کی زندگی بلکہ پورے معاشرے کی اصلاح کا سبب بن سکتی ہے۔ اس میں ہمیں اہل بیت (علیہم السلام) کی سیرت سے نہ صرف رہنمائی ملتی ہے بلکہ اس سیرت کو اپنی سیاست، سماج اور معیشت میں عملی طور پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تولّا کا یہ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ ہمارے عقیدے کا اثر ہماری روزمرہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر ہونا چاہئے اور اس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنی فردی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایک بہتر معاشرہ بھی قائم کر سکتے ہیں۔

لہذا تولّا صرف اہل بیت (علیہم السلام) سے محبت اور ان کی حمایت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ ایک ایسا شعور ہے جو انسان کو ہر دور میں باطل کے خلاف کھڑا کرتا ہے اور حق کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ یہ صرف جذباتی وابستگی کا نام نہیں بلکہ ایک عملی انقلابی فکر ہے جو انسان کو اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور عالمی سطح پر انصاف کے قیام کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

فقیری میں خدا سے تجارت

اسلامی تعلیمات میں صدقہ ایک بنیادی اور جامع تصور ہے، جو نہ صرف فقر اور محتاجی کے خاتمے کا ذریعہ ہے بلکہ ایک روحانی، نفسیاتی، اور سماجی تربیت کا عمل بھی ہے۔ رسول خدا صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث "اذا املقتم فتاجروا اللہ بالصدقۃ" یعنی "جب فقر چھا جائے تو صدقے کے ذریعہ خدا سے بیوپار کرو"، دراصل ایک عظیم تربیتی پیغام ہے۔ بظاہر یہ حدیث ایک معمولی مالی ترغیب کی دعوت دیتی محسوس ہوتی ہے، لیکن اس کی گہرائی میں وہ فہم اور بصیرت موجود ہے جو انسان کے فقر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور بدلنے کی دعوت دیتی ہے۔

صدقہ کی عمومی اقسام میں مالی صدقہ جیسے نقد رقم، کھانا، لباس یا دیگر اشیائے ضروریہ شامل ہیں۔ اسی طرح غیر مالی صدقات بھی ہیں جن میں علم دینا، کسی کو راستہ دکھانا، بیمار کی تیمارداری، مظلوم کی مدد، کسی کو مسکرا کر دیکھنا، یا راستے سے رکاوٹ ہٹانا شامل ہیں۔ ان سب کو اسلام میں صدقہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان نہ صرف دوسروں کی مدد کرتا ہے بلکہ اپنی ذات کی بھی اصلاح کرتا ہے۔ صدقہ دینا مالدار اور محتاج، دونوں کے لیے باعث خیر ہے؛ مالدار کے لیے تزکیہ نفس اور مال کی تطہیر کا ذریعہ، اور محتاج کے لیے تعاون و سہارا۔

جب کوئی شخص فقر میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ ایک ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی دباؤ میں آجاتا ہے۔ فقر صرف پیسے کی کمی نہیں بلکہ اعتماد کی کمی، مقصدیت کا زوال، اور مستقبل کے حوالے سے غیر یقینی کی کیفیت بھی ہے۔ اس وقت اگر اسے یہ سکھایا جائے کہ "تو خود کو بے بس نہ سمجھ، بلکہ خدا کے ساتھ بیوپار کر" تو وہ اپنی حالتِ فقر کو کمزوری یا ذلت کی علامت نہیں بلکہ ایک روحانی فرصت سمجھنے لگتا ہے۔ یہ تصور انسان کے اندر ایک نئے اعتماد، ایک نئے حوصلے کو جنم دیتا ہے، جہاں وہ محرومی کو صدقے کے ذریعہ امید میں بدلتا ہے۔ وہ کسی سے مانگنے کے بجائے دینے والا بننے کی خواہش پال لیتا ہے، خواہ اس کے پاس تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ یہی تبدیلی اس کی نفسیات کو اندر سے روشن کرتی ہے اور خود اعتمادی کو جنم دیتی ہے۔

نفسیات کی زبان میں جب انسان کسی مصیبت یا فقر کا سامنا کرتا ہے تو وہ یا تو helplessness کا شکار ہوتا ہے یا resilience پیدا کرتا ہے۔ صدقے کی تعلیم اس کے اندر وہ "resilient" شخصیت پیدا کرتی ہے جو صرف اپنی ذات کی بہتری پر قانع نہیں رہتی بلکہ دوسروں کے لیے سہارا بننے کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔ صدقہ دینے والا شخص اپنے اندر ایک نفسیاتی قوت محسوس کرتا ہے کیونکہ اس نے کسی کو دیا ہے، کسی کی مدد کی ہے، اور یوں وہ اپنے آپ کو قابل، مؤثر، اور مؤمن تصور کرتا ہے۔ یہ احساس اس کے اضطراب، بے اعتمادی، اور خوف کو کم کرتا ہے، اور اس میں ایک روحانی روشنی کو جگاتا ہے جو اسے فقر سے بھی بالاتر بنا دیتا ہے۔

سماجی لحاظ سے صدقہ ایک معاشرتی توازن پیدا کرتا ہے۔ جب مالدار افراد صدقہ دیتے ہیں تو وہ اپنی دولت کو سماج کے مختلف طبقات میں تقسیم کرتے ہیں، جس سے غربت اور احساسِ محرومی کم ہوتا ہے۔ لیکن جب فقر کا شکار شخص بھی، اگرچہ معمولی، صدقہ دیتا ہے تو وہ سماج کو یہ پیغام دیتا ہے کہ دینے والا ہونا صرف مال کی زیادتی سے نہیں، بلکہ نیت، یقین اور روحانی بلندی سے ہوتا ہے۔ یہ پیغام معاشرے میں احساسِ برتری و کمتری کو ختم کرتا ہے اور باہمی ہم آہنگی کو فروغ دیتا ہے۔ صدقے کی اس نوعیت سے انسان کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی بلکہ بلند ہوتی ہے۔

یہ حدیث صدقہ کو محض ایک خیرات کا عمل نہیں بلکہ ایک بیوپار قرار دیتی ہے۔ بیوپار ہمیشہ نفع کے ارادے سے کیا جاتا ہے، اور یہاں نفع صرف دنیاوی دولت یا مال میں اضافے کا نہیں بلکہ خدا کی رضا، دل کا سکون، دعا کی قبولیت، اور مصیبتوں سے حفاظت کا ہے۔ یہ تصور انسان کو ایک روحانی سرمایہ کاری کی طرف مائل کرتا ہے۔ جب وہ خدا سے بیوپار کرتا ہے تو وہ اپنی دنیا و آخرت کو ایک ہی عمل سے سنوارتا ہے۔ یہ یقین کہ خدا اس بیوپار میں خسارہ نہیں دے گا، انسان کو ایک خاص سکون، عزم اور روحانی طاقت عطا کرتا ہے۔

پس، صدقہ دراصل ایک ایسا عمل ہے جو بیک وقت انسانی نفس کی اصلاح، روحانیت کی بلندی، سماجی ہم آہنگی اور معاشی توازن کا ضامن ہے۔ فقر کی حالت میں صدقہ دینا انسان کو مایوسی، احساسِ شکست، اور خود ترسی سے نکال کر ایک فعال، مؤثر، اور خوددار مومن میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ عمل انسان کو یاد دلاتا ہے کہ وہ صرف لینے والا نہیں بلکہ دینے والا بھی

بن سکتا ہے، کہ اس کے اندر خیر موجود ہے، اور کہ اس کا ربط ایک ایسے خدا سے ہے جو اس کے تھوڑے کو بھی بہت بنا سکتا ہے۔ اس حدیث کا نفسیاتی اور سماجی پیغام یہی ہے کہ محرومی کو امید میں بدلا جا سکتا ہے، اگر انسان اپنے دل میں یقین، عمل میں خیر، اور نگاہ میں خدا کو رکھے۔

صدقہ دینا انسانی نفسیات اور سائنسی مشاہدات کے اعتبار سے ایک ایسا طاقتور عمل ہے جو انسان کی داخلی کیفیت، سماجی روابط، اور عملی رویّوں کو اس انداز سے متاثر کرتا ہے کہ فقر، یعنی غربت، محرومی یا تنگی کا دائرہ محدود ہو کر کشادگی، خیر و برکت اور خوشحالی کی طرف منتقل ہونے لگتا ہے۔ اس تبدیلی کو سادہ الفاظ میں سمجھنے کے لیے ہمیں انسانی دماغ، جذبات، معاشی نظام اور سماجی تعلقات کی باہمی کارکردگی کو سائنسی زاویے سے دیکھنا ہو گا۔

جب کوئی انسان صدقہ دیتا ہے، تو اس کے دماغ میں "reward system" متحرک ہوتا ہے۔ سائنس کے مطابق، جب انسان کسی کے لیے کوئی خیر یا مدد کا عمل انجام دیتا ہے، تو دماغ "ڈوپامین" اور "آکسیٹوسن" جیسے کیمیکل خارج کرتا ہے۔ یہ کیمیکل انسان کو سکون، خوشی، اعتماد اور تعلق کا احساس دیتے ہیں۔ یہی کیمیکل وہی اثرات پیدا کرتے ہیں جو کامیابی یا دولت کے حصول پر ہوتے ہیں۔ لہذا صدقہ دینا دماغ کو اس طرح ٹرین کرتا ہے کہ وہ مثبت سوچ، خود اعتمادی، اور خوشی کی فضا میں کام کرے، اور یہی کیفیت اس کے روزمرہ کے فیصلوں، رویّوں اور اہداف پر مثبت اثر ڈالتی ہے۔ جب کوئی شخص نفسیاتی طور پر بہتر محسوس

کرتا ہے، تو وہ زندگی میں زیادہ متحرک اور کارآمد ہو جاتا ہے، جس سے فقر کے اسباب آہستہ آہستہ کم ہونے لگتے ہیں۔

صدقہ دینے سے انسان کے اندر "abundance mindset" یعنی فراوانی کی سوچ پیدا ہوتی ہے، جو اس کے طرزِ زندگی، کاروباری ذہن، خرچ کے انداز، اور روزگار کے مواقع پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، جو لوگ "scarcity mindset" یعنی کمی و خوف کی سوچ میں جیتے ہیں، وہ زیادہ خطرہ مول لینے سے کتراتے ہیں، مواقع کھو دیتے ہیں، اور دوسروں پر اعتماد نہیں کرتے، جس سے وہ مزید غربت کا شکار ہوتے ہیں۔ صدقہ دینے والا انسان دراصل اپنے نفس کو کمی سے نکال کر فراوانی کی سوچ میں منتقل کرتا ہے۔ وہ دوسروں پر خرچ کرتا ہے، دوسروں کے ساتھ تعلقات بناتا ہے، دل کھول کر بات کرتا ہے، اور یوں اس کا سماجی دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ سوشل سائنسز کی رو سے، انسان کے مالی حالات اس کے سماجی تعلقات، نیٹ ورک، اور روابط سے گہرے تعلق رکھتے ہیں۔ جو جتنا دوسروں سے جُڑا ہوتا ہے، اس کے مواقع بھی اتنے ہی بڑھتے ہیں۔

مزید یہ کہ صدقہ دینے والا فرد عام طور پر زیادہ شکر گزار، مثبت، اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ رویے اس کی شخصیت میں قیادت، کارکردگی، اور تعاون کا رنگ بھرتے ہیں۔ ایسی صفات ملازمت، کاروبار، اور معاشرتی اعتبار سے کامیابی کا زینہ بنتی ہیں۔ ایک شخص جو دوسروں کے لیے فائدہ مند ہے، اس کی قدر کی جاتی ہے، اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، اور وہ زیادہ مواقع کا حقدار بنتا ہے۔ یوں وہ فقر کے دائرے سے نکل کر خوشحالی کی طرف بڑھتا ہے، اور یہ سب

صدقے کے اس عمل سے شروع ہوتا ہے جو نہ صرف خدا کی رضا کے لیے کیا گیا تھا، بلکہ خود اس کے لیے دنیاوی کامیابیوں کا بھی ذریعہ بن گیا۔

سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ جب انسان دوسروں کی مدد کرتا ہے تو اس کی جسمانی صحت بہتر ہوتی ہے، نیند اچھی آتی ہے، اور دماغی دباؤ کم ہوتا ہے۔ یہ چیزیں مجموعی طور پر اس کی productivity یعنی کام کرنے کی صلاحیت کو بہتر بناتی ہیں۔ بہتر صحت اور بہتر کارکردگی مالی حالات کو سنوارنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

یعنی جب انسان صدقہ دیتا ہے تو وہ ایک ایسا نفسیاتی، اخلاقی اور عملی نظام چلاتا ہے جس کے اثرات اس کی سوچ، جذبات، تعلقات، صحت، مواقع اور زندگی کے ہر شعبے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کے نتیجے میں اس کا فقر صرف مالی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ فکری، جذباتی اور سماجی سطح پر بھی خوشحالی میں بدل جاتا ہے۔ گویا صدقہ دینا ایک ایسا بظاہر معمولی عمل ہے جو انسانی نظامِ وجود کو اس کی اصل منزل یعنی سُرخروئی، فراوانی اور برکت کی طرف لے جاتا ہے، اور یہ بات جدید سائنسی تحقیق سے بھی ثابت ہو چکی ہے کہ "دینے والے ہمیشہ پانے والوں سے زیادہ خوش اور مطمئن ہوتے ہیں۔"

زیاراتِ قبور اور جدید سائنس

زیاراتِ قبور کا عمل، جو کہ انبیاء، ائمہ، علماء، شہداء اور عام مومنین کے قبور پر جا کر انجام دیا جاتا ہے، محض ایک مذہبی رسم نہیں بلکہ اس کے اندر گہرے نفسیاتی، سماجی اور حتیٰ کہ سائنسی اثرات پنہاں ہیں۔ یہ عمل ایک زندہ انسان کے روحانی، جذباتی اور فکری توازن میں مدد دیتا ہے اور مرنے والوں کے ساتھ ایک غیر مادی تعلق کو تقویت بخشتا ہے۔

سائنسی طور پر، انسان ایک جذباتی مخلوق ہے جو تعلق، وابستگی اور یادداشت سے جڑا ہوتا ہے۔ قبور کی زیارت کے دوران انسان ماضی سے جڑتا ہے، اپنے اسلاف کو یاد کرتا ہے اور اپنی اصل کی طرف پلٹتا ہے۔ اس پلٹنے میں جو شعوری عمل ہے وہ نہ صرف روحانی سکون دیتا ہے بلکہ دماغ میں موجود limbic system کو متحرک کرتا ہے، جو جذبات اور یادداشت کا مرکز ہے۔ اس نظام کی تحریک سے انسان کو حزن، توبہ، شکر گزاری، وفاداری اور عاجزی جیسے جذبات کا تجربہ ہوتا ہے، جو نفسیاتی صحت کے لیے بے حد ضروری ہیں۔

قبور کی زیارت انسان کو اپنی فنا اور موت کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے، جسے سائیکولوجی میں "mortality salience" کہا جاتا ہے۔ یہ شعور کہ انسان فانی ہے، فرد کو غرور، دنیا پرستی اور خود غرضی سے نکال کر عاجزی، خدمت، قناعت اور آخرت کی تیاری کی طرف

لے جاتا ہے۔ یہی ذہنی تبدیلی اس کے رویوں میں اخلاقی بہتری اور سماجی ذمہ داری کو جنم دیتی ہے، جس کا فائدہ نہ صرف فرد بلکہ پورے معاشرے کو ہوتا ہے۔

زیارات کے دوران دعا، قرآن خوانی، استغفار اور مرحومین کے لیے بخشش طلب کرنا درحقیقت مثبت ارتعاشات (positive vibrations) کے اخراج کا سبب بنتا ہے۔ روحانی سائنس کی روشنی میں، انسان کی نیت، الفاظ اور احساسات سے ایک توانائی خارج ہوتی ہے جو کائنات میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ جب مخلص دل سے کوئی دعا کرتا ہے تو اس کے جذبات اور خیالات قبر کے اطراف میں موجود توانائی کو متاثر کرتے ہیں، جو نہ صرف زندہ افراد کے لیے بلکہ مرنے والے کی روح کے لیے بھی سکون و راحت کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیارت کے بعد انسان خود کو ہلکا، پرسکون اور متحرک محسوس کرتا ہے۔

قبور پر جانے سے انسان کو یہ موقع بھی ملتا ہے کہ وہ ان عظیم شخصیات کی زندگیوں کا مشاہدہ کرے جنہوں نے ایمان، قربانی، علم، اخلاص، اور شجاعت کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ ان کی زندگیوں کا مطالعہ اور قبروں کی زیارت انسان کے اندر ایک اخلاقی اور فکری بیداری پیدا کرتی ہے، جو اس کی شخصیت سازی میں کردار ادا کرتی ہے۔ جدید ماہرین نفسیات اس عمل کو "role model proximity effect" کہتے ہیں، یعنی جب انسان کسی عظیم ہستی کے نشانِ قدم یا مقام سے قریب ہوتا ہے تو اس کے اندر غیر شعوری طور پر وہی اوصاف ابھرنے لگتے ہیں جنہیں وہ ہستی مجسم کرتی تھی۔

مزید بر آں، قبور کی زیارت سوشل بانڈنگ کا بھی ذریعہ بنتی ہے۔ یہ اجتماعی عمل رشتہ داروں، احباب اور برادری کے افراد کو روحانی سرگرمی میں یکجا کرتا ہے، جو اجتماعی شعور، ہم آہنگی اور تعلقات کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ سماجی یکجہتی نہ صرف روحانی لحاظ سے مفید ہے بلکہ انسانوں کے درمیان باہمی ہمدردی اور تعاون کے جذبے کو بھی فروغ دیتی ہے۔

اس سب کے ساتھ ساتھ زیارت کے دوران انسان جو آنسو بہاتا ہے، جو رقت قلبی محسوس کرتا ہے، وہ نہ صرف قلبی سکون کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ میڈیکل سائنس کے مطابق آنسوؤں کے بہاؤ سے جسم میں موجود "cortisol" یعنی تناؤ پیدا کرنے والے ہارمون میں کمی آتی ہے، اور "oxytocin" جیسے سکون آور کیمیکل کا اخراج ہوتا ہے جو انسان کے موڈ اور نیند کو بہتر بناتا ہے۔

لہٰذا، زیارتِ قبور ایک ایسا ہمہ جہت عمل ہے جس میں روحانیت، نفسیات، معاشرت، سوشیالوجی، اور حتیٰ کہ نیوروسائنس کی جہات شامل ہو جاتی ہیں۔ یہ نہ صرف ایک عبادت ہے بلکہ انسان کے باطن، شخصیت، اور سماجی زندگی کو متوازن بنانے کا ایک سائنٹفک اور معنوی ذریعہ بھی ہے۔

قبور پر جائے بغیر بھی مرحومین کے لیے کی جانے والی دعا، فاتحہ، درود، تلاوت قرآن اور صدقہ و خیرات نہ صرف مرحومین کے لیے نفع بخش ہوتی ہیں بلکہ زندہ افراد کے نفسیاتی اور روحانی وجود پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اسلام کی روح میں "نیت" اور "اخلاص" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہی اخلاص وہ روحانی کنکشن پیدا کرتا ہے جو فاصلہ،

زمانہ یا مکان سے محدود نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص مخلص دل سے کسی مرحوم کے لیے دعا کرتا ہے، اس کے حق میں صدقہ دیتا ہے یا نیک عمل انجام دیتا ہے تو وہ ایک قسم کی "روحانی توانائی" یا ارتعاش پیدا کرتا ہے جو عالمِ مثال میں مرحوم تک پہنچتا ہے۔

سائنس کی زبان میں، یہ عمل توانائی کے اصولوں کے تحت "non-local interaction" سے مشابہ ہوتا ہے، جہاں جذبات، خیالات یا دعاؤں کی ارتعاشات کسی فزیکل رابطے کے بغیر بھی دوسرے شعور پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر جب دعا یا صدقہ والدین یا عزیز مرحومین کے لیے ہو تو اس میں جذباتی گہرائی زیادہ ہوتی ہے، جو دعا کے اثر کو اور بھی قوی بنا دیتی ہے۔ جدید نیورو سائنس اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ انسان کے شعور میں موجود جذبات، نیتیں اور تصوراتی توجہ نہ صرف اس کے اپنے دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ ایک قسم کی "quantum entanglement" کی طرز پر دوسرے وجود سے بھی جڑ سکتی ہیں۔

روحانی اور روایتی اسلامی تعلیمات کے مطابق، دعا، فاتحہ، درود اور صدقہ ایک ایسا تحفہ ہے جو زندہ انسان سے مرحوم کی روح تک پہنچتا ہے، جیسے روشنی اندھیرے میں راہ دکھاتی ہے۔ اس کے اثرات محض اجر و ثواب تک محدود نہیں بلکہ یہ عمل مرحوم کے عالمِ برزخ میں راحت، درجات کی بلندی، اور تنہائی کی انسیت کا باعث بنتا ہے۔ احادیث کے مطابق جب کوئی زندہ انسان اپنے مرحوم کے لیے نیک عمل انجام دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نیکی کو نور میں تبدیل کر کے اس کی قبر کو منور فرماتا ہے، خواہ وہ شخص ہزاروں میل دور ہو۔

یہی عمل دعا کرنے والے پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرنے والا دراصل اپنے دل میں رحم، تواضع، شکر، اور اخلاص کو جگہ دیتا ہے۔ یہ جذبات خود اس کی روحانی پاکیزگی، ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کے مطابق جب انسان کسی دوسرے کے لیے خیر کی نیت کرتا ہے، تو اس کے اندر endorphins اور serotonin جیسے کیمیکلز خارج ہوتے ہیں، جو اسے ذہنی خوشی، سکون اور مقصدیت عطا کرتے ہیں۔

البتہ، قبور پر جانا ایک روحانی اضافی ذریعہ ہے جو ظاہری احساسات، یادوں، اور جسمانی تجربے کو تقویت دیتا ہے، لیکن اگر انسان کسی مجبوری یا مسافت کی وجہ سے قبور پر نہ جا سکے تو نیت اور اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہر عمل روحانی طور پر اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک فاصلے کا کوئی معنی نہیں، اور نیت ہر عمل کی بنیاد ہے۔ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ قبور پر جانا ایک ذریعہ ہے جو انسان کی توجہ اور روحانی ارتکاز کو بڑھاتا ہے، لیکن اصل عمل اور اس کا اثر دل کی حالت، نیت، اور اخلاص پر موقوف ہے، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے سے انجام دیا جائے۔

پس، چاہے کوئی شخص قبور پر جائے یا نہ جائے، اگر وہ دل سے دعا کرے، قرآن پڑھے، درود بھیجے یا صدقہ دے، تو یہ اعمال مرحومین کی روحوں کے لیے تسکین اور خود اس کے لیے نیکی، سکون اور معنویت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

دُعا مومن کا ہتھیار ہے

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عظیم الشان حدیث کہ "الدعاء سلاح المؤمن" یعنی "دعا مؤمن کا ہتھیار ہے"، انسانی حیات اور نفسیاتی بقا کی ایک نہایت عمیق اور حکیمانہ بصیرت کی حامل تعبیر ہے۔ اس میں جہاں دعا کے روحانی اثرات کا بیان ہے، وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعا صرف ایک مذہبی رسم یا الفاظ کی تکرار نہیں بلکہ مومن کے دفاع، بقاء اور ترقی کا ایک حقیقی اور موثر وسیلہ ہے۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کو ہتھیار کے طور پر بیان کیا تو اس میں ایک غیر معمولی حکمت پوشیدہ ہے، جسے جدید سائنسی اور نفسیاتی تحقیق کی روشنی میں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

سائنس کے شعبہ نفسیات میں ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کی ذہنی حالت اور اس کا باطنی طرزِ فکر براہِ راست اس کے جسم، رویے، فیصلوں، تعلقات اور حتیٰ کہ بیماریوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب انسان کسی بحران، پریشانی، بیماری، خوف یا نا امیدی کا شکار ہوتا ہے، تو اس کا دماغ "اسٹریس رسپانس" یعنی "جنگ یا فرار" کے نظام کو متحرک کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جسم میں کورٹیسول اور ایڈرینالین جیسے ہارمونز خارج ہوتے ہیں جو وقتی دفاعی کیفیت تو پیدا کرتے ہیں لیکن طویل عرصے میں یہ ہارمونز انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ اب ایسے میں دعا ایک ایسا روحانی، نفسیاتی اور حتیٰ کہ حیاتیاتی نظام فراہم کرتی

ہے جو اسٹریس کے اس دائرے کو توڑ دیتا ہے۔ جب انسان دل سے دعا کرتا ہے، تو وہ ایک اعلیٰ طاقت، ایک مہربان خالق، ایک سننے والے اور سمجھنے والے خدا سے جُڑتا ہے۔ یہ تعلق محض ایک عقیدتی رابطہ نہیں بلکہ انسانی شعور ولاشعور میں تحفظ، یقین، تسکین اور مقصدیت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

نیوروسائنس نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ جب انسان خلوص نیت سے دعا یا مراقبہ کرتا ہے تو اس کے دماغ میں خاص حصے مثلاً prefrontal cortex اور anterior cingulate cortex متحرک ہوتے ہیں، جو فیصلہ سازی، ہمدردی، توجہ، اور جذباتی استحکام سے متعلق ہیں۔ اس دوران دماغ کے سکون بخش کیمیکل جیسے serotonin ، dopamine اور oxytocin کا اخراج بڑھتا ہے، جس سے انسان کو تسلی، خوشی، اعتماد اور روحانی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ گویا دعا نہ صرف اضطراب اور ذہنی الجھن کو کم کرتی ہے بلکہ جسمانی سطح پر بھی قوتِ مدافعت، نیند کے معیار، دل کی دھڑکن، اور خون کے دباؤ کو بہتر بناتی ہے۔ اس طرح دعا ایک نفسیاتی اور جسمانی ہتھیار بن جاتی ہے جو انسان کو زندگی کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے میں مدد دیتا ہے۔

دعا کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ انسان کو بے بسی سے نکال کر فعال امید، توکل اور خود اعتمادی کی طرف لے جاتی ہے۔ سوشیالوجی اور پیرا سائیکولوجی کے شعبوں میں یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ جب انسان کسی بھی مشکل وقت میں دعا کرتا ہے تو وہ صرف اپنی فریاد پیش نہیں کر رہا ہوتا بلکہ وہ درحقیقت اپنے اندرونی شعور کو یہ باور کرا رہا ہوتا ہے کہ اس کے مسائل کا

کوئی سننے والا، کوئی نگران اور کوئی مدد کرنے والا موجود ہے۔ یہ شعور اسے مایوسی، خود ترسی یا بے عملی سے نکال کر جدوجہد، مثبت رویے، اور نتائج کی بہتری کی سمت میں متحرک کرتا ہے۔ دعا انسان کو passive بننے کے بجائے proactive بناتی ہے، یعنی وہ اپنے حالات کی ذمہ داری لیتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ حتمی نتائج خالص انسان کی تدبیر پر نہیں بلکہ خدائی تقدیر پر منحصر ہیں۔ اس توازن سے انسان ایک ہم آہنگ اور باوقار نفسی حالت میں آجاتا ہے۔

دعا کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ یہ انسان کے اندر اخلاقی تطہیر کا آغاز کرتی ہے۔ دعا کے ذریعے وہ اپنے گناہوں کا اعتراف، اپنے نفس کا محاسبہ، اور اپنے کردار کی اصلاح کے لیے اللہ سے مدد مانگتا ہے۔ یہ اعترافِ کمزوری اسے باطنی قوت عطا کرتا ہے، کیونکہ یہ کمزوری کو تسلیم کر کے اس کی اصلاح کی طرف قدم اٹھانا ہوتا ہے، جو نفسیاتی طور پر خود شعوری (self-awareness) اور تبدیلی کے اولین مراحل ہیں۔ اس زاویے سے دعا صرف ایک روحانی عمل نہیں بلکہ ایک نفسیاتی انقلاب کا آغاز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "دعا" کو کسی تلوار، نیزے یا ظاہری طاقت کے بجائے "ہتھیار" کے طور پر بیان کیا، کیونکہ ظاہری ہتھیار دشمن کو ختم کرتا ہے، جب کہ دعا انسان کے اندرونی دشمنوں، جیسے خوف، حرص، حسد، غم، خود ترسی، اور گناہ پر غالب آتی ہے۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جو خاموش ہوتا ہے، لیکن اس کی طاقت ناقابلِ تسخیر

ہے۔ یہ دل سے نکل کر کائنات کے قوانین پر اثر انداز ہوتا ہے اور بظاہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

یوں رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ مختصر حدیث اپنے اندر ایک عظیم الشان نفسیاتی، روحانی اور سائنسی حقیقت کو سموئے ہوئے ہے کہ دعا مؤمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، کیونکہ یہ اس کی سوچ، احساس، ارادے، صحت، کردار اور مستقبل کو ایک مثبت، مربوط اور پر اُمید سمت عطا کرتی ہے

بد دعا یعنی کسی کے خلاف دل سے یا زبان سے بدی کی دعا کرنا ایک ایسا عمل ہے جسے اکثر غصے، تکلیف، یا ظلم کے رد عمل میں انجام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ مذہبی متون میں بد دعا کے اثرات کو ایک روحانی سطح پر بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس کو سائنسی اور نفسیاتی زاویے سے دیکھا جائے تو یہ عمل کئی پہلوؤں سے انسان کے شعور، جسم، تعلقات اور ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بد دعا سب سے پہلے ایک جذباتی اور نفسیاتی کیفیت سے جنم لیتی ہے۔ یہ کیفیت عموماً غصے، بے بسی، انتقام یا شدید تکلیف کی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت دماغ کا وہ حصہ جسے amygdala کہتے ہیں، خطرے یا غصے کے رد عمل میں شدید متحرک ہو جاتا ہے اور جسم میں cortisol ، adrenaline جیسے تناؤ پیدا کرنے والے ہارمونز کی مقدار بڑھنے لگتی ہے۔ یہ ہارمونز اگر وقتی طور پر خارج ہوں تو انسان کو اپنی حفاظت کے لیے توانائی فراہم کرتے ہیں، لیکن اگر بد دعا جیسا عمل کسی مستقل غصے یا نفرت کی بنیاد پر کیا جائے تو یہ ہارمونز

جسم پر تباہ کن اثرات ڈال سکتے ہیں۔ وہ شخص جو مسلسل کسی کے خلاف بد دعا کرتا ہے، درحقیقت اپنے جسم میں زہر پھیلانے کے مترادف ایک کیمیکل ردعمل شروع کر دیتا ہے جو دل کی دھڑکن، بلڈ پریشر، نیند، نظامِ ہضم، اور ذہنی سکون کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔

نفسیاتی طور پر بھی بد دعا انسان کو ایک منفی جذباتی فریم میں قید کر دیتی ہے۔ ایسے لوگ جن کا دھیان اکثر بد دعا دینے، انتقام لینے یا دوسروں کی بربادی کی خواہش کی طرف ہو، وہ نہ صرف اپنے ذہن کو کشمکش اور اضطراب میں رکھتے ہیں بلکہ ان کی قوتِ فیصلہ، ہمدردی، اور دوسروں کے ساتھ تعلقات میں بھی خرابی پیدا ہوتی ہے۔ بد دعا درحقیقت انسان کو "victim mentality" میں قید کر دیتی ہے جہاں وہ خود کو مظلوم تصور کر کے دوسرے کو مکمل قصوروار ٹھہراتا ہے اور کسی مثبت حل یا تبدیلی کی کوشش چھوڑ دیتا ہے۔

سوشیالوجی کے اعتبار سے بد دعا ایک سماجی زہر کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ایک فرد کی زبان یا دل سے نکلنے والی منفی فضا دوسرے افراد، خاندانوں، حتیٰ کہ نسلوں میں نفرت، کدورت، اور دشمنی کا سبب بن سکتی ہے۔ بد دعا، اگرچہ بظاہر صرف ایک شخصی عمل ہے، مگر اس کے اثرات دوسروں کے دلوں اور ذہنوں میں مستقل وسوسے، خوف اور ردعمل کی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں امن، بھروسے اور ہمدردی کی جگہ ایک کشیدہ، عدمِ برداشت پر مبنی ماحول جنم لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بد دعا کا اثر واقعی دوسروں پر بھی ہوتا ہے؟ اس کا جواب سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جذباتی، ذہنی اور روحانی ربط ایک ناقابلِ انکار

حقیقت ہے، جسے نیورو سائنس اور کوانٹم سائیکالوجی میں "emotional resonance" اور "intention energy" جیسے تصورات سے بیان کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص شدید اخلاص یا جذبات کے ساتھ کسی کے حق میں یا خلاف نیت رکھتا ہے، تو وہ محض لفظ نہیں کہہ رہا ہوتا بلکہ ایک توانائی خارج کر رہا ہوتا ہے، جو دوسروں کے شعور و لاشعور پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ دعا یا بد دعا دونوں میں یہ توانائی کی ترسیل ایک گہرا اثر رکھتی ہے، خصوصاً اگر اس کا تعلق کسی قریبی یا جذباتی تعلق سے ہو۔ البتہ یہ اثر اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب دوسرا شخص خود بھی اس توانائی کو قبول کرے یا اس کے اثر میں آئے۔ ورنہ جس طرح منفی سوچوں کے خلاف "نفسیاتی قوتِ مدافعت" ممکن ہے، اسی طرح بد دعا کے اثر سے بھی روحانی طاقت، مثبت نیت اور توکل کے ذریعے بچا جا سکتا ہے۔

بد دعا کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ بد دعا کرنے والے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ کیونکہ جو شخص مسلسل دوسروں کے نقصان کی نیت رکھتا ہے، وہ اپنے اندر ایک سیاہ توانائی کو جگہ دیتا ہے جو اس کی اپنی نفسیاتی، روحانی اور جسمانی کیفیت کو زوال کی طرف لے جاتی ہے۔ یوں بد دعا ایک ایسا تیر بن جاتی ہے جو اکثر واپس آکر خود تیر انداز کو ہی زخمی کر دیتا ہے۔

اس لیے سائنسی اور نفسیاتی زاویے سے دیکھا جائے تو بد دعا ایک ایسا عمل ہے جو وقتی جذباتی تسکین تو دے سکتا ہے، لیکن طویل مدتی طور پر نہ صرف بد دعا کرنے والے کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ معاشرتی توازن، ذہنی سکون اور روحانی ارتقاء کے لیے بھی رکاوٹ ہے۔ بہتر یہ

ہے کہ انسان ظلم یا تکلیف کے مقابلے میں دعا، درگزر اور عدل کی تلاش جیسے مثبت اعمال کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جو فرد کو بھی سکون دیتا ہے اور معاشرے کو بھی امن عطا کرتا ہے۔

انسان کے روحانی ہالے پر دعا اور بددعا دونوں گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ انسانی aura ، جسے اردو میں "نوری ہالہ" یا "روحانی توانائی کی لہریں" کہا جاسکتا ہے، ایک ایسا غیر مرئی دائرہ ہے جو انسانی جسم کے گرد موجود ہوتا ہے اور اس کی ذہنی، روحانی اور جذباتی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔ جدید روحانی سائنس اور توانائی پر مبنی نفسیات کے مطابق انسان کی ہر سوچ، نیت اور احساس اس aura کو یا تو طاقت دیتا ہے یا اسے کمزور کرتا ہے۔

دعا، چونکہ نیت، توکل، امید، محبت اور اخلاص جیسے مثبت جذبات سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے یہ انسانی aura کو صاف، روشن اور متوازن کرتی ہے۔ جب کوئی شخص سچے دل سے دعا کرتا ہے تو اس کی aura میں vibrational frequency بڑھ جاتی ہے، یعنی وہ روحانی و نفسیاتی لحاظ سے ایک بلند تر سطح پر آجاتا ہے۔ یہ بلند توانائی نہ صرف اس کے اندرونی سکون، اعتماد اور صحت پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ وہ مثبت لہریں دوسروں تک بھی پہنچتی ہیں، جس سے اس کے اردگرد کا ماحول بھی خوشگوار اور روحانی طور پر پرامن ہو جاتا ہے۔ aura کی صفائی، دل و دماغ کا ہم آہنگ ہونا اور مثبت توانائی کا بہاؤ، دعا کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف بددعا، چونکہ نفرت، غصے، انتقام اور منفی نیت سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے یہ انسانی aura کو آلودہ اور بھاری بنا دیتی ہے۔ بددعا کرنے والے کی توانائی کی سطح گرنے لگتی

ہے، aura میں سیاہ یا بھورے رنگ کے دھبے نمایاں ہو سکتے ہیں جو روحانی اضطراب اور منفی جذبات کی علامت ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کے ارد گرد ایک منفی دائرہ بن جاتا ہے جو نہ صرف اس کی اپنی روحانی صحت کو متاثر کرتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ایک بوجھ بنتا ہے۔ مستقل بددعا کرنے والے افراد میں روحانی کمزوری، ذہنی دباؤ، نیند کی خرابی، اور حتیٰ کہ جسمانی بیماریوں کی بھی زیادہ شکایات دیکھی گئی ہیں۔

یعنی مختصراً کہا جائے تو دعا aura کو تقویت دیتی ہے، اسے صاف اور روشن بناتی ہے، جبکہ بددعا aura کو آلودہ، تاریک اور بیمار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی و سائنسی طور پر اہلِ دل اور اہلِ دعا کی موجودگی کو بابرکت سمجھا جاتا ہے اور بدخواہ یا بددعاؤں والے ماحول کو ذہنی و روحانی طور پر زہر آلود قرار دیا جاتا ہے۔

تارکِ واجبات اور مرتکبِ محرمات کو صدقہ و خمس دینا

اسلام ایک ایسا جامع دین ہے جو فرد کی روحانیت، فکر، نفس اور معاشرت کے ہر پہلو کو منظم اور متوازن بنانے کے لیے احکامات و اصول فراہم کرتا ہے۔ اس کا ہر حکم صرف عبادتی یا رسمی پہلو نہیں رکھتا بلکہ انسانی شخصیت کی تشکیل اور سماجی توازن میں گہرا کردار ادا کرتا ہے۔ انہی احکام میں سے ایک یہ حدیث بھی ہے: "جو نماز نہیں پڑھتا، اسے صدقہ یا خمس نہ دو۔" بظاہر یہ ایک سخت ہدایت معلوم ہوتی ہے، لیکن جب اس کے باطن میں جھانکا جائے تو اس میں ایک گہری روحانی، نفسیاتی اور سماجی حکمت پوشیدہ نظر آتی ہے۔

نماز، دین اسلام میں بندگی کی سب سے بنیادی اور مستقل علامت ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو نہ صرف انسان کو خالق سے جوڑتا ہے بلکہ اس کے نفس کو نظم و ضبط، توجہ، پاکیزگی اور قربِ الٰہی کا ذوق عطا کرتا ہے۔ جو شخص نماز کا عادی ہوتا ہے، وہ ہر روز پانچ مرتبہ اپنے جسم، عقل، دل اور روح کو ایک مرکز پر مرکوز کرتا ہے۔ یہ مرکزیت انسان کو ایک مقصدی زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ نماز کے ذریعے انسان میں internal locus of control پیدا ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے اعمال اور حالات کی ذمہ داری خود قبول کرتا ہے اور انہیں ایک اعلیٰ معنوی نظام کا حصہ سمجھ کر منظم کرتا ہے یہ ایک اعلیٰ منصب کی ذمہ داری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص نماز ترک کر دیتا ہے، وہ درحقیقت اپنے اندرونی

نظام کو منتشر کر بیٹھتا ہے۔ اس کے افکار، ترجیحات اور جذبات خدا کی مرکزیت سے ہٹ کر مادی، نفس پرستی اور وقت گزاری کی طرف جھکنے لگتے ہیں۔ نفسیاتی تحقیق بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ باقاعدہ عبادت کرنے والے افراد میں خود احتسابی، ضبطِ نفس، صبر، شکر، اور اخلاقی رویوں کا تناسب زیادہ پایا جاتا ہے۔

اب جب ہم صدقہ یا خمس کے تصور کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف مالی امداد نہیں بلکہ ایک دینی، اخلاقی اور سماجی مفہوم رکھتی ہے۔ صدقہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ہم نہ صرف کسی کی ظاہری ضرورت کو پورا کرتے ہیں بلکہ اسے دینی معاشرے کا فعال فرد تسلیم کرتے ہیں۔ ہم اس پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ اس مال کو خیر کی راہ میں استعمال کرے گا، اس کے دل میں شکر پیدا ہو گا، اور وہ اس خیرات کو محض وقتی سہولت نہیں بلکہ اللہ کی رحمت و تربیت کا ذریعہ سمجھے گا۔ لیکن اگر یہ مال ایسے شخص کو دیا جائے جو نماز جیسا بنیادی فریضہ ترک کر چکا ہو، تو یہ تصور ٹوٹنے لگتا ہے۔ اس کی شخصیت اس درجے پر نہیں رہی جہاں وہ دینی اقدار کو اہمیت دیتا ہو، یا روحانی نعمتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہو۔ چنانچہ اسے صدقہ دینا دراصل ایک ایسے شخص کو تقویت دینا ہے جو شعوری یا لاشعوری طور پر دینی نظام سے کنارہ کش ہو چکا ہے۔

اس زاویے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ جب کسی شخص کو اس کی غیر دینی روش کے باوجود مسلسل امداد دی جاتی ہے، تو وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے یا دین سے قریب ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ نفسیات کے ایک اصول reinforcement theory کے مطابق، اگر کسی غیر

ذمہ دار رویے کو مسلسل انعام ملتا رہے، تو وہ رویہ مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح صدقہ یا خمس کا دیا جانا اس کے لیے ایک نفسیاتی تائید بن جاتا ہے کہ وہ دین سے دور ہو کر بھی معاشرتی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف اس کی ذاتی تربیت کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ معاشرے میں ایک عمومی بے حسی اور دین سے لاتعلقی کو فروغ دیتا ہے۔

سماجیات کی روشنی میں جب دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین صرف انفرادی عمل نہیں بلکہ ایک اجتماعی نظام ہے۔ اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے اس کے اصولوں، اقدار اور علامات کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ نماز اس نظام کی پہلی علامت ہے، اور صدقہ و خمس اس کی معاشی گردش کا حصہ۔ اگر اس گردش کو ایسے افراد میں تقسیم کیا جائے جو نظامِ دینی سے عملاً منہ موڑ چکے ہوں، تو یہ دین کی روح کو کمزور کرنے کے مترادف ہو گا۔ رفتہ رفتہ یہ عمل ایک ایسا طبقہ پیدا کرے گا جو دینی ظاہریت سے خالی مگر دینی برکتوں سے مالا مال ہو گا۔ ایسا طبقہ سماج میں نفاق، بے حسی اور مصلحت پسندی کو بڑھاوا دیتا ہے۔

مزید برآں، اسلام کا مالی نظام تربیتی ہے، فقط امدادی نہیں۔ صدقہ لینے والا درحقیقت ایک ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں اسے روحانی طور پر متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلے ہی دین سے کٹا ہوا ہے، تو نہ اس کے اندر شکر پیدا ہو گا، نہ اصلاح کی خواہش، نہ دینی نظام سے وابستگی۔ اس لیے فقہی لحاظ سے بھی علماء نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ زکات، خمس یا صدقات مستحقین میں ایسے افراد کو ترجیح دی جائے جو دینی اقدار سے وابستہ ہوں یا کم از کم ان کی طرف رجحان رکھتے ہوں۔

اس حدیث کا مقصد کسی کو محروم رکھنا نہیں، بلکہ دینی نظام کے روحانی و معاشرتی توازن کو برقرار رکھنا ہے اور مسلمانوں کو خود اپنا اور پھر معاشرتی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل بنانا ہے۔ یہ ہدایت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ مالی عبادات کو بھی اسی شخص میں خرچ کیا جائے جو دینی روح کے ساتھ جڑا ہو، تاکہ یہ مال محض دنیاوی سہولت نہ بنے بلکہ فرد و سماج کے لیے دینی بیداری اور اصلاحِ نفس کا ذریعہ بنے۔

اس پس منظر میں یہ حدیث صرف ایک اخلاقی یا فقہی اصول نہیں بلکہ ایک مکمل سماجی حکمت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ دین ایک مربوط نظام ہے، جہاں نماز، صدقہ، شخصیت سازی اور سماجی تنظیم، سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر کسی ایک کو ترک کیا جائے تو پورے نظام پر اس کے اثرات پڑتے ہیں۔ پس، نماز نہ پڑھنے والے کو صدقہ نہ دینے کی تعلیم دراصل دین کو ایک ہمہ گیر اور با مقصد نظام کے طور پر برقرار رکھنے کی کوشش ہے، جو نہ صرف بندے کو خدا سے جوڑتا ہے بلکہ اسے ایک ذمہ دار، باشعور اور بااخلاق شہری بنانے کا عمل بھی انجام دیتا ہے۔

البتہ ایک اہم نکتہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اسلامی تعلیمات انسان کی فطری کمزوریوں، روحانی کمزوریوں اور نفسیاتی ساخت کو نہایت باریکی سے سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کے احکام میں سختی اور نرمی دونوں کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ایک طرف گناہوں کو واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے، تو دوسری طرف گناہگاروں کے لیے توبہ، رجوع، اور اصلاح کی راہیں بھی ہمہ وقت کھلی رکھی گئی ہیں۔ انہی معانی پر مبنی ایک حدیث کے مفہوم میں بیان کیا

گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شراب جیسا کبیرہ گناہ بھی کرتا ہو، تب بھی اس کو صدقہ یا خمس دیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ تعلیم متضاد محسوس ہوتی ہے، لیکن جب اس کو گہرائی میں جا کر نفسیاتی، سماجی، اخلاقی اور سائنسی زاویوں سے دیکھا جائے تو اس کے پیچھے ایک بے مثال حکمت آشکار ہوتی ہے، جو اصلاحِ انسانیت کا حقیقی پیغام ہے۔

شراب نوشی، جو کہ ایک شدید حرام فعل ہے، اکثر انسان کے ذاتی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سائنسی تحقیقات بتاتی ہیں کہ ایسے افراد اکثر ڈپریشن، احساسِ کمتری، تنہائی، یا جذباتی اضطراب کا شکار ہوتے ہیں۔ شراب یا دیگر نشہ آور چیزیں ان کے لیے وقتی تسکین یا فرار کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اگر ایسے افراد کو مکمل طور پر معاشرتی مدد سے محروم کر دیا جائے اور ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی انہیں کاٹ دیا جائے، تو وہ مزید پستی میں گر جاتے ہیں۔ اسلام اس طرزِ عمل کی سختی سے نفی کرتا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ گناہگار کو سزا دینے سے پہلے اسے سہارا دینا، اصلاح کی دعوت دینا اور محبت سے قریب لانا زیادہ مؤثر حکمت عملی ہے۔

جب ایک شراب نوش یا دیگر کبیرہ گناہوں میں مبتلا مسلمان کو صدقہ یا خمس جیسی مالی مدد دی جاتی ہے تو اس عمل سے محض اس کی مادی حاجت پوری نہیں ہوتی، بلکہ اس کے دل میں ایک اہم پیغام راسخ ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ امت نے اسے رد نہیں کیا، وہ اب بھی قابلِ عزت ہے، اور اس سے امید وابستہ ہے۔ یہ احساس خود بخود اس کے ضمیر کو جگاتا ہے۔

نفسیاتی علوم کے مطابق، انسان میں تبدیلی کی خواہش اس وقت جنم لیتی ہے جب وہ اپنی قدر و قیمت کو محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھے کہ دنیا اسے صرف اس کے گناہ کی بنیاد پر رد کر چکی ہے، تو وہ اپنی اصلاح سے بھی مایوس ہو جاتا ہے، اور یہ مایوسی مزید تباہی کا دروازہ بن سکتی ہے۔

اسلامی تعلیم میں انسانی کرامت کو ایک بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے " :وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ "، یعنی ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی۔ اس آیت کے مطابق ہر انسان—چاہے گناہگار ہو یا پرہیزگار—ایک فطری عزت کا حامل ہے۔ یہی اصول صدقہ و خمس کی حکمت میں کارفرما ہے کہ کسی بھی مسلمان کو، چاہے وہ شراب جیسا شدید گناہ ہی کیوں نہ کر رہا ہو، مکمل طور پر قطع تعلق کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلکہ اسے دین سے قریب لانے کے لیے، اس کے دل کو نرم کرنے، اور اس کی اصلاح کی امید بحال رکھنے کے لیے اس سے تعلق برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اس تعلق کی ایک عملی صورت یہی مالی امداد اور تعاون ہے، جو تالیف القلوب یعنی دلوں کو جوڑنے کی اسلامی حکمت کے تحت کی جاتی ہے۔

سائنس اس اسلامی اصول کی تائید کرتی ہے۔ جدید نفسیات بتاتی ہے کہ جب کسی فرد کو ‘unconditional acceptance’ یعنی غیر مشروط قبولیت ملتی ہے، تو اس کے اندر احساسِ تحفظ، ندامت، اور تبدیلی کی تحریک جنم لیتی ہے۔ سوشیالوجی کے اصولوں کے مطابق، جب کسی شخص کو کسی گروہ یا برادری سے کاٹ دیا جاتا ہے، تو اس کی اصلاح کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب اسے اپنے گناہ کے باوجود ایک موقع دیا جاتا ہے کہ وہ

برادری کا حصہ بنا رہے، تو وہ اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر نیا سفر شروع کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

یہی وہ حکمت ہے جو مذکورہ حدیث کے مفہوم میں بیان ہوئی ہے۔ گناہ سے نفرت کی جائے، مگر گناہگار سے نہیں۔ اسلام ہر انسان کے لیے واپسی کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ اسے ایک موقع دیا جاتا ہے کہ وہ پلٹ آئے، نادم ہو، اور اپنی اصلاح کرے۔ جب ہم ایک شراب نوش، یا کسی بھی کبیرہ گناہ کے مرتکب مسلمان کو صدقہ و خمس دے کر اس کی عزتِ نفس بحال کرتے ہیں، تو ہم دراصل اس کی روح میں چھپی روشنی کو دوبارہ بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ روشنی ہی اسے ظلمت سے نکال کر ہدایت کی طرف لے جاتی ہے۔

لہٰذا اس حدیث کا پیغام نہ صرف فقہی دائرے تک محدود ہے بلکہ یہ ایک نفسیاتی، معاشرتی اور روحانی انقلاب کا دروازہ ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ اصلاح کا آغاز محبت، عزت، اور قبولیت سے ہوتا ہے، نہ کہ نفرت، طعن، اور بائیکاٹ سے۔ اسلام کی اسی اعلیٰ اخلاقی حکمت کو اپناتے ہوئے ہمیں گناہگاروں کے ساتھ برتاؤ میں توازن، حکمت اور دل سوزی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ وہ امید، رجوع، اور توبہ کے دروازے کو کبھی بند نہ سمجھیں۔

فطرت کیا ہے؟

فطرت کا مفہوم انسانی فکر کی مختلف جہتوں میں مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ الحاد (Atheism) اور خدا پرستی (Theism) کے مابین فطرت کے تصور میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ملحد اس کو خالص مادی، حیاتیاتی یا نفسیاتی رجحانات کا مجموعہ سمجھتا ہے، جبکہ خدا پرست فطرت کو خالق کے منصوبے، حکمت اور ہدایت کا داخلی مظہر تصور کرتا ہے۔

ملحدوں کے نزدیک فطرت ایک ایسا حیاتیاتی اور نفسیاتی نظام ہے جو انسان کے جینیاتی کوڈ، ارتقائی مراحل اور ماحول سے پیدا ہونے والے محرکات کے تحت وجود میں آیا ہے۔ ان کے مطابق انسانی رجحانات، احساسات، اخلاقی میلانات یا وجدانی کیفیات سب کچھ محض دماغی کیمیا، نیورولوجیکل ردعمل یا بقا کی جبلت سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا "فطرت" ان کے نزدیک کوئی ماورائی یا معنوی حقیقت نہیں بلکہ ایک سائنسی و طبعی نظام کا حصہ ہے جو اربوں سالہ ارتقائی تسلسل کے نتیجے میں تشکیل پایا۔ وہ فطرت کو کسی ارادے یا غایت (Purpose) سے خالی سمجھتے ہیں۔ انسان جو کچھ فطرتاً محسوس کرتا ہے، جیسے سچائی، محبت، انصاف یا جمال، وہ سب دماغ کے پیچیدہ نظاموں کی ارتقائی بقا پر مبنی پیداوار ہیں، نہ کہ کسی ماورائی حقیقت کی طرف اشارہ۔ چنانچہ فطرت کے اندر خدا کے وجود کا سراغ تلاش کرنا ان کے نزدیک ایک غیر ضروری اور غیر سائنسی طرزِ فکر ہے۔

اس کے برخلاف خدا پرستوں کے نزدیک فطرت ایک داخلی، فطری رہنمائی (inner guidance) ہے جسے خدا نے ہر انسان کے وجود میں ودیعت کیا ہے۔ قرآن اس کو "فطرت اللہ" کہتا ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا۔ یہ فطرت کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں، بلکہ خود ایک دلیل ہے، کیونکہ یہ انسان کی ذات کے اندر ایک ایسی شہادت فراہم کرتی ہے جو سچائی، خیر، جمال اور معنویت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جب کوئی انسان ظلم کو فطری طور پر برا اور عدل کو اچھا محسوس کرتا ہے، یا جب وہ کسی مظلوم کی فریاد پر بے اختیار متاثر ہوتا ہے، تو یہ محض بائیولوجیکل ردعمل نہیں ہوتا بلکہ وہ داخلی شہادت ہوتی ہے جو اسے ایک اعلیٰ و برتر اخلاقی حقیقت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اسی طرح خدا پرست عقل کی روشنی میں دلیل دیتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت سچائی، انصاف اور کمال کی تلاش کرتی ہے، اور ان کے وجود کو بغیر کسی سیکھے پہچانتی ہے، تو لازمی ہے کہ یہ رجحان کسی حقیقت پر مبنی ہو، نہ کہ صرف اتفاقی کیمیائی عمل کا نتیجہ۔

عقل اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ ہر نظام، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اپنے اندر ایک خاص ترتیب، مقصدیت اور مناسبت رکھتا ہے۔ انسان کا نظامِ فطرت اگر کسی حکمت، تناسب، اور خیر کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے، تو عقل تقاضا کرتی ہے کہ یہ فطرت کسی حکیم و علیم خالق کا بنایا ہوا نقشہ ہو، نہ کہ اندھے ارتقا کی غیر شعوری پیداوار۔ خدا پرست فلسفی مثلاً ابن سینا، ملا صدرا، اور جدید مفکرین جیسے سید حسین نصر وغیرہ اس موقف کو نہ صرف عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں بلکہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسانی فطرت ایک "سچائی کی گواہی" ہے، جو انسان کے باطن میں خدا کی پہچان کا دروازہ ہے۔

یوں فطرت کے تصور میں الحادی فکر اسے ایک مادی و حیاتیاتی تعامل تک محدود رکھتی ہے، جبکہ خدا پرست فکر اسے عقل، روح اور وجدان کا ایک نورانی سرچشمہ مانتی ہے، جو انسانی شعور کو خالق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس فرق کی بنیاد پر فطرت کا فہم ایک نکتہ آغاز بن سکتا ہے، جہاں سے الحاد و ایمان کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔

فطرت کے تصور کو الحاد (جو خدا کو نہیں مانتے) اور خدا پرستی (جو خدا پر یقین رکھتے ہیں) کے فرق کے ساتھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ آسانی سے سمجھ آ جائے۔

فطرت کا مطلب ہوتا ہے انسان کے دل کے اندر سے آنے والے وہ احساسات اور خیالات جو سیکھے بغیر خود بخود آتے ہیں۔ جیسے: کسی کو تکلیف میں دیکھ کر دل کا دکھنا، کسی کی مدد کرنے پر خوشی محسوس ہونا، جھوٹ بولنے پر اندر سے شرمندگی ہونا، یا سچ سن کر دل کا مطمئن ہو جانا۔ یہ سب انسان کی فطرت کہلاتے ہیں۔

اب جو لوگ خدا کو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں صرف جسم اور دماغ کی خاص بناوٹ کی وجہ سے ہیں، جیسے کوئی کمپیوٹر پروگرام ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں انسان کے اندر اچھائی یا برائی کا کوئی سچا معیار نہیں ہوتا، بس وقت کے ساتھ جو چیز فائدہ مند لگتی ہے، وہی اچھا لگنے لگتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ہم دوسروں کی مدد کرتے ہیں کیونکہ اس سے ہماری اپنی زندگی آسان ہوتی ہے، نہ کہ اس لیے کہ مدد کرنا واقعی کوئی نیکی ہے۔

لیکن جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر جو سچائی، انصاف، محبت اور نیکی کی پہچان ہے، وہ اللہ نے پیدا کی ہے۔ جیسے ایک کار کے ساتھ اس کا مینول آتا ہے،

ویسے ہی اللہ نے ہر انسان کے دل میں صحیح اور غلط کی پہچان رکھی ہے۔ جب ہم جھوٹ بول کر بے سکون ہوتے ہیں یا سچ بول کر سکون پاتے ہیں، تو یہ ہمارے دل کی فطری گواہی ہے کہ سچ اچھا ہے اور جھوٹ برا ہے۔ اور یہ گواہی ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی بہت بڑا، سچا اور حکیم ہستی (یعنی اللہ) ہے جس نے ہمیں پیدا کیا اور ہمارے دل میں یہ پہچان رکھی۔

اسی لیے خدا کو ماننے والے کہتے ہیں کہ فطرت ہمارے اندر اللہ کی طرف سے ایک چھوٹا سا چراغ ہے، جو ہمیں اندھیرے میں روشنی دکھاتا ہے۔ اور جب ہم اس چراغ کو پہچان لیتے ہیں، تو ہمیں اللہ تک پہنچنے کا راستہ بھی مل جاتا ہے۔

اسلامی حکومت کی مشروعیت و مقبولیت

اسلامی فکر کے مطابق حکومت کا اصل مقصد صرف نظم و نسق یا قوانین کی پابندی کروانا نہیں بلکہ انسانوں کی ہدایت، عدل کا قیام، اور معاشرے میں دینی و اخلاقی اقدار کی حفاظت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حکومت کے لیے دو بنیادی اصول ضروری ہوتے ہیں :مشروعیت اور مقبولیت۔ مشروعیت کا مطلب ہے کہ حاکم یا رہنما کا حقِ حکومت خدا کی طرف سے ہو، یعنی وہ شخص دینی، اخلاقی اور شرعی معیار پر پورا اترتا ہو، اور اس کے نظریات و اعمال اللہ کی رضا اور شریعت کے مطابق ہوں۔ جبکہ مقبولیت اس اجتماعی رضامندی یا حمایت کو کہتے ہیں جو عوام کی طرف سے اس رہنما کو حاصل ہو۔

ائمہ معصومین علیہم السلام مشروعیت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے۔ ان کی حکمرانی کا حق اللہ کی طرف سے تھا، اور ان کے علم، کردار، طہارت اور معصومیت میں کوئی شک نہیں تھا۔ لیکن اکثر مواقع پر عوام کی طرف سے وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو حکومت کے عملی قیام کے لیے درکار ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ لوگ ان کی قیادت کو قبول نہ کر سکے، بلکہ بہت سے لوگ وقت کے ظالم حکمرانوں کے ساتھ تعاون کرتے رہے، جس کے نتیجے میں ائمہ کو یا تو گھروں میں محدود کر دیا گیا یا شہید کر دیا گیا۔ اس طرح مشروعیت ہونے کے باوجود چونکہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، اس لیے ظاہری حکومت قائم نہ ہو پائی۔

اس کے برعکس امام خمینیؒ کی قیادت میں جو اسلامی انقلاب ایران میں برپا ہوا، اس میں نہ صرف مشروعیت موجود تھی بلکہ بھرپور عوامی مقبولیت بھی حاصل تھی۔ امام خمینیؒ ایک ایسے فقیہ، عارف اور مجتہد تھے جن کی دینی بصیرت اور تقویٰ مسلمہ تھا۔ ان کی رہنمائی اسلامی اصولوں، ولایت فقیہ کے نظریے، اور قرآن و سنت کی روشنی میں تھی۔ مگر اس سب کے ساتھ ساتھ انہوں نے عوام کو شعور دیا، تعلیم دی، اور ان کے دلوں میں دینی غیرت کو بیدار کیا۔ اس نتیجے میں عوام نے اپنے دل و جان سے ان کی قیادت کو قبول کیا، قربانیاں دیں، اور انقلاب کو کامیاب بنایا۔ یہ عوامی رضامندی اور شوق، جس کے ذریعے ایک فقیہ کے ہاتھوں میں حکومت آئی، اسلامی مفہوم میں جمہوریت کہلاتی ہے۔ اس کو "اسلامی جمہوریت" یا "ولایت فقیہ کے زیرِ سایہ عوامی حکومت" کہا جاتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ یہ جمہوریت مغربی سیکیولر جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔ مغرب میں جمہوریت کا مطلب ہوتا ہے کہ عوام کی اکثریت جو چاہے، وہی قانون ہو، خواہ وہ خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ وہاں حاکمیت خدا کی نہیں، بلکہ عوام کی ہوتی ہے۔ جبکہ اسلامی جمہوریت میں حاکمیت صرف خدا کی ہے، قانون صرف وہی ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر کیا ہے، اور عوام کا کردار اس نظام کو قبول کرنے اور اس کے نفاذ میں عملی معاونت کا ہوتا ہے۔ اس لیے اسلامی جمہوریت عوام کی شرکت پر ضرور قائم ہے، لیکن اس کی بنیاد شریعت اور خدا کی مرضی پر ہوتی ہے، نہ کہ انسانی خواہشات پر۔

پس، امام خمینیؒ کے انقلاب میں مشروعیت اور مقبولیت دونوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، جو نہ صرف اسلامی اصولوں کے مطابق ہے بلکہ ائمہ معصومینؑ کے ارمانوں کی تکمیل کا ایک

اہم قدم بھی ہے۔ اس ماڈل میں نہ صرف حکومت دینی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے بلکہ عوامی حمایت سے تقویت پاتی ہے، اور یہی حقیقی اسلامی نظام حکومت کا مطلوبہ معیار ہے۔

اسی بات کو زیادہ سادہ اور روزمرہ کی زبان میں اور چھوٹی چھوٹی مثالوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوچیں کہ ایک اسکول میں کوئی استاد ہے جو بہت نیک، ایماندار، اور علم والا ہے۔ اس کے پاس پڑھانے کا پورا حق ہے کیونکہ وہ سب سے اہل اور تربیت یافتہ ہے۔ مگر اگر طلبہ اس کی بات نہ سنیں، اس کا احترام نہ کریں، اور اپنی مرضی سے چلتے رہیں، تو چاہے وہ استاد جتنا بھی قابل ہو، وہ کلاس پر کنٹرول حاصل نہیں کر سکے گا۔ یعنی صرف حق ہونا کافی نہیں، طلبہ کا تعاون اور قبولیت بھی چاہیے۔

یہی بات امام علیؑ اور دوسرے ائمہ معصومینؑ کے ساتھ ہوئی۔ ان کے پاس اللہ کی طرف سے حکومت کا حق تھا، مگر عوام نے ساتھ نہیں دیا، اس لیے وہ عملی حکومت قائم نہ کر سکے۔

اب دوسری طرف، فرض کریں کہ ایک اور استاد ہے جو نہ صرف نیک اور علم والا ہے بلکہ طلبہ جو خود بھی نیک اور علم والے گھروں سے تعلق رکھتے تھے اس کے اچھے اخلاق، رہنمائی اور محبت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ طلبہ خود چاہتے ہیں کہ وہی انہیں پڑھائے، اور اس کی بات ماننے لگتے ہیں۔ تو اب وہ استاد نہ صرف حق رکھتا ہے، بلکہ اس کے پاس طلبہ کی حمایت بھی ہے۔ وہ آسانی سے کلاس چلا سکتا ہے اور ہر کوئی خوشی سے اس کے اصول مانتا ہے۔

یہی کام امام خمینیؒ نے کیا۔ ان کے پاس دینی حق (مشروعیت) بھی تھا اور عوام نے ان پر بھروسہ کر کے اپنی حمایت بھی دی (مقبولیت)، اس لیے وہ اسلامی حکومت قائم کر سکے۔

مگر یہاں ایک اہم بات ہے: مغربی جمہوریت کا مطلب ہوتا ہے کہ طلبہ خود طے کریں کہ کس استاد کو چنیں، چاہے وہ استاد کمزور ہو، نالائق ہو، یا کوئی اصول نہ مانتا ہو۔ صرف ان کی پسند سے فیصلہ ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی جمہوریت میں طلبہ کو آزادی ہے کہ اپنی مرضی سے استاد کا ساتھ دیں، مگر استاد وہی ہونا چاہیے جو علم والا، نیک، اور اصولوں پر قائم ہو، جسے اللہ کے اصولوں کے مطابق حق ملا ہو۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کے لیے حق بھی چاہیے اور عوام کی حمایت بھی، لیکن عوام کی مرضی اللہ کے قانون کے اندر ہونی چاہیے، نہ کہ اس کے خلاف۔ یہی اسلامی جمہوریت ہے، جو آزادی کو اللہ کی بندگی کے دائرے میں رکھتی ہے، نہ کہ انسانوں کی خواہشات کے تابع کر دیتی ہے۔

فقر و غناء اور ایمان

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور حکمت ایسی بے پایاں اور ہمہ گیر ہے کہ انسان کے لیے ظاہری حالات کی بنیاد پر اس کے فیصلوں کو پرکھنا نہ صرف نادانی ہے بلکہ گمراہی کا دروازہ بھی کھول سکتی ہے۔ دنیا میں دولت، مرتبہ، عزت، فقر، محرومی یا مصیبت جیسے تمام حالات انسان کے لیے یا تو آزمائش ہوتے ہیں یا نعمت، مگر ان کی اصل قدر و قیمت کا انحصار اس ایک بنیادی حقیقت پر ہے کہ انسان نے ایمان کے ساتھ ان حالات میں کیسا طرزِ عمل اختیار کیا۔ وہ شخص جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہے، اگرچہ دنیاوی اعتبار سے مفلس ہو، بے گھر ہو، یا سماجی اعتبار سے کمزور سمجھا جائے، اللہ کے نزدیک قابلِ قدر ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جس کے پاس مال و دولت کے انبار ہوں، شہرت ہو، رتبہ ہو، مگر دل ایمان سے خالی ہو، وہی شخص درحقیقت اللہ کی ناراضگی اور عذاب کا شکار ہو سکتا ہے۔

تاریخ اور قرآن ہمیں بار بار یہ سبق دیتے ہیں کہ دنیاوی امارت کبھی بھی اللہ کی رضا کی علامت نہیں رہی۔ فرعون، قارون اور نمرود جیسے لوگ دولت اور طاقت کے بامِ عروج پر تھے، مگر قرآن انہیں اللہ کے سخت عذاب کے مستحق کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان کی دولت ان کے لیے نجات کا ذریعہ نہیں بنی، بلکہ انہی کی ہلاکت کا سبب بنی۔ اس کے برعکس حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور خود نبی مکرم حضرت محمد مصطفی صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی فقر، جلاوطنی، سوسائٹی کی مخالفت، اور طرح طرح کی آزمائشوں سے

گزرنا پڑا، مگر ان کا مقام اللہ کے نزدیک سب سے بلند ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل قدر ایمان، تقویٰ، اخلاص اور سچائی کی ہے نہ کہ دنیاوی حیثیت کی۔ ایمان انسان کی روحانی شناخت ہے۔ یہ وہ چشمہ ہے جو زندگی کے ہر موسم میں انسان کو سیراب کرتا ہے۔ اگر انسان دولت کے ساتھ ایمان کو برقرار رکھے تو وہ دولت اس کے لیے ذریعۂ خدمت بن جاتی ہے۔ وہ محتاجوں کا سہارا بنتا ہے، خیرات کرتا ہے، اور اپنے وسائل کو راہِ خدا میں صرف کرتا ہے، اس طرح اس کی امارت باعثِ فخر اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح اگر انسان غریبی کے باوجود اللہ سے راضی ہو، صبر کرے، قناعت اپنائے، شکر گزار بنے اور دوسروں سے حسد نہ کرے تو یہی فقر اس کے لیے جنت کا زینہ بن سکتا ہے۔

اگرچہ انسان کا دل مظاہرِ دنیا کو دیکھ کر بسا اوقات قیاس کرتا ہے کہ کسی کے حالات اللہ کی رضا یا ناراضگی کی دلیل ہیں، مگر درحقیقت وہ ظاہری حالات نہیں بلکہ انسان کا باطنی تعلق اور طرزِ عمل ہی ہے جو اللہ کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ غریبی اس کی توہین ہے اور اللہ اس سے ناراض ہے، وہ فطرتِ انسانی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایمان کی روشنی کو پہچانتا ہو، تو جانتا ہے کہ دنیاوی فقر یا دولت محض ذریعہ ہیں، منزل نہیں۔

لہٰذا نہ تو فقر قابلِ مذمت ہے اور نہ ہی امارت قابلِ فخر، اصل بات یہ ہے کہ ایمان کہاں کھڑا ہے۔ ایمان ہو تو فقر میں وقار ہوتا ہے اور امارت میں تواضع، ایمان نہ ہو تو فقر میں ذلت ہوتی ہے اور امارت میں غرور۔ پس ہر انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی میں ایمان کو معیار

بنائے اور دنیاوی حالات کو اسی روشنی میں پرکھے، تاکہ وہ اپنے اعمال اور حالات کی اصل حقیقت کو سمجھ سکے اور اللہ کی رضا حاصل کر سکے۔

جدید دور کی مثالوں کی روشنی میں ایمان، فقر اور امارت کے اسلامی اصولوں کو مزید واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ آج کی دنیا میں ہمیں ایسے کئی مناظر ملتے ہیں جہاں بظاہر خوشحال اور کامیاب نظر آنے والے افراد اندر سے بے سکونی، اضطراب، بے معنویت اور تنہائی کے شکار ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ارب پتی، مشہور شخصیات، فلمی ستارے اور کاروباری ٹائیکونز جن کے پاس دنیا کی ہر سہولت موجود ہے، اکثر ذہنی دباؤ، بے خوابی، خودکشی کے رجحان، یا ڈپریشن جیسی بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک "روحانی خلا" ہوتا ہے، جو صرف ایمان سے پر ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر، دنیا کے معروف ارب پتی افراد جیسے کہ ایلون مسک یا جیف بیزوس کو لیجیے۔ ان کی دولت ناقابلِ تصور ہے، مگر ان کے ذاتی بیانات، انٹرویوز یا طرزِ زندگی کو دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو معنی دینے، مستقبل کے خوف سے بچنے، یا اپنے اندر کے خلا کو بھرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ مریخ پر جانے، مصنوعی ذہانت سے انسانی موت کو شکست دینے یا دیگر بلند و بالا منصوبوں سے شاید اُس امن کی تلاش میں ہیں جو صرف ایمان، توکل اور روحانی سکون سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں، آپ کو دنیا کے مختلف کونوں میں ایسے گمنام لوگ بھی ملیں گے جو سادہ زندگی گزارتے ہیں، جن کے پاس دولت نہیں، مگر ان کے چہروں پر اطمینان، زبان پر شکر اور دل میں اللہ کی رضا ہوتی ہے۔ ان میں سے کئی لوگ مسجدوں میں بیٹھے، سڑکوں پر

مزدوری کرتے، یا چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے نظر آتے ہیں، مگر ان کے دل اتنے روشن ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں کے لیے راحت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان کی راتیں اللہ کے حضور دعا میں گزرتی ہیں اور دن خدمتِ خلق میں۔

اسی طرح، فلسطین، یمن، شام، اور دوسرے مظلوم علاقوں کے وہ لوگ جنہوں نے اپنی جان، مال، گھر، اور سب کچھ کھو دیا، مگر اپنے ایمان، غیرت، اور عزم سے پیچھے نہ ہٹے، ان کی مثالیں جدید دور میں ایمان کی معراج ہیں۔ وہ غریب ضرور ہیں، مگر ان کی فکری و روحانی بلندی ایسی ہے کہ پوری دنیا کے ارب پتی ان کے عزم و یقین کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ اسی دور میں امام خمینیؒ کی شخصیت بھی ایک روشن مثال ہے۔ نہ وہ کسی بادشاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، نہ ان کے پاس دولت کے خزانے تھے، مگر چونکہ ان کے پاس ایمان، اخلاص، علم اور تقویٰ تھا، اس لیے ایک عظیم اسلامی انقلاب برپا کر سکے، جو آج بھی دنیا کے طاقتور طاغوتی نظاموں کو چیلنج کر رہا ہے۔ ان کی سادہ زندگی اور اللہ پر کامل بھروسا یہ پیغام دیتا ہے کہ ایمان کے ساتھ قیادت، حکومت اور عزت حاصل کرنا ممکن ہے، چاہے دنیاوی ساز و سامان نہ بھی ہو۔

لہٰذا جدید دنیا کے ان تضادات، خالی پن اور روحانی بیماریوں کو دیکھ کر یہ بات اور بھی روشن ہو جاتی ہے کہ امارت یا فقر کی حقیقت ایمان کے بغیر محض ایک جسمانی حالت ہے، مگر ایمان کے ساتھ یہ دونوں روحانی مقام میں بدل سکتے ہیں۔ اصل سوال یہی ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ایمان کو کہاں رکھتے ہیں، کیونکہ وہی ہماری زندگی کی قدر و قیمت کا اصل پیمانہ ہے۔

صدقہ، زکات اور خمس: عبادت یا ذریعۂ معاش؟

اسلامی تعلیمات میں صدقہ، زکات اور خمس کو محض ایک مالی لین دین یا غربت مٹانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک بامقصد عبادت اور سماجی نظام کے اہم ستون کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ ان عبادات کا مقصد کسی کو ہمیشہ کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا نہیں، بلکہ وقتی ضرورت کے تحت اُس کی کفالت کرنا ہے تاکہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزارے۔ قرآن اور احادیث میں جہاں صدقہ و زکات کے فضائل بیان ہوئے ہیں، وہیں ان کا اصل مصرف اور فلسفہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ عبادات صرف مستحق، محروم، اور نادار افراد کے لیے ہیں، اور ان کا لینے والا مستقل فقیر نہیں بلکہ عارضی طور پر مدد کا طلبگار ہوتا ہے۔

دین اسلام ہر انسان کو اپنی روزی خود تلاش کرنے، محنت کرنے اور باعزت زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔ اگر معاشرے میں ہر شخص صدقہ و خمس کو ہی اپنا رزق سمجھ لے اور اسی پر قناعت کرے تو پھر دینے والے باقی نہ رہیں گے اور یہ نظام اپنی اصل روح سے محروم ہو جائے گا۔ اسی بنا پر اسلام نے اس بات کو واضح کیا کہ یہ مالی عبادات اہلِ استطاعت کے مال کا وہ حصہ ہیں جو ان کے مال کو پاک کرتا ہے اور معاشرے کے مستحقین کو سہارا دیتا ہے، نہ کہ مستقل معاشی سہولت فراہم کرتا

ہے۔ یہ عطا، ایک ذمہ دار فرد کو وقتی سہارا دیتی ہے تاکہ وہ دوبارہ سماجی و معاشی طور پر بحال ہو۔

اس حوالے سے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بے نمازی کو صدقہ و خمس نہ دینے کا کیا جواز ہے، جبکہ کافر بھی دنیاوی اسباب اختیار کر کے کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایک نظامِ اسباب کے تحت چلنے والا جہان بنایا ہے، جہاں ہر انسان کو اس کی کوشش، تدبیر اور وسائل کے مطابق دنیاوی نتائج ملتے ہیں۔ لیکن عبادات کا نظام، اس دنیا کے اندر ایک اعلیٰ اور روحانی حقیقت ہے، جس کی بنیاد اللہ کی رضا، بندگی اور اصلاحِ نفس پر ہے۔ جب ہم صدقہ یا خمس کسی ایسے شخص کو دیتے ہیں جو واجبات کی ادائیگی نہیں کرتا، تو ہم نہ صرف اس عبادت کی روح سے غفلت برتتے ہیں بلکہ اس شخص کو یہ پیغام بھی دیتے ہیں کہ تمہارے گناہ یا ترکِ واجبات کے باوجود ہم تمہیں مکمل سماجی اعانت دینے کو تیار ہیں۔ یہ روش اس فرد کو اصلاح اور اللہ کی طرف رجوع کرنے سے غافل کر سکتی ہے۔

لہٰذا فقہی اصولوں کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بے نمازی یا وہ فرد جو واجبات کو ترک کرتا ہو، اُس کی مدد اگر اصلاح کی نیت سے ہو، اور اس میں تالیفِ قلب کی حکمت شامل ہو، تو مخصوص حالات میں ممکن ہو سکتی ہے، لیکن عمومی طور پر ایسے افراد کو صدقہ و خمس دینے سے اجتناب برتا جاتا ہے تاکہ وہ گناہ پر جری نہ ہو جائیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی گناہگار مگر دین سے جڑا ہوا، احساسِ گناہ رکھنے والا شخص ہو، تو اس کی مدد اس لیے کی جا سکتی ہے کہ وہ گناہ سے نجات کی امید کے ساتھ دین کی طرف لوٹے۔ اس معاملے میں

شریعت کی حکمت انسان کی فطرت کو مد نظر رکھتی ہے، کیونکہ بعض اوقات تالیفِ قلوب اور نرم مزاجی انسان کو نجات کی طرف لے آتی ہے۔

اسلام صدقہ و خیرات کو دلوں کو جوڑنے، نفوس کو پاک کرنے اور معاشرتی ہم آہنگی قائم کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے، نہ کہ افراد کو معاشی طور پر معذور بنا دینے کا۔ یہی وجہ ہے کہ اصل رزق وہی ہے جو انسان اپنی محنت، جدوجہد اور حلال وسائل سے کمائے۔ صدقہ و زکات صرف اُس وقت دیے جاتے ہیں جب کوئی شخص مجبور، نادار، یتیم یا مقروض ہو، اور اس کی عزتِ نفس باقی رہے۔ یہ عمل بھی محدود مدت کے لیے ہوتا ہے تاکہ وہ شخص خود کفیل ہو کر دوسروں کی مدد کرنے والوں میں شامل ہو جائے۔

لہٰذا صدقہ، خمس اور زکات نہ کسی کا مستقل رزق ہیں، نہ ہی سماجی سست روی یا دینی غفلت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ۔ ان کا صحیح فہم اور تطبیق ہی اسلامی سماج کو باوقار، باکردار اور خوددار بنا سکتا ہے۔ ان مالی عبادات کو فلاحی نظام سمجھنے کے بجائے عبادت کے طور پر انجام دینا، اور لینے والوں کو اصلاحِ نفس، تقویٰ، اور خودانحصاری کی طرف لے جانا ہی اسلام کا اصل ہدف ہے۔ یہ صرف دینے والے کا امتحان نہیں، بلکہ لینے والے کے لیے بھی ایک دعوت ہے کہ وہ عزت، شکر اور قربِ خداوندی کی طرف قدم بڑھائے۔

فطری دین اور انسانی فطرت

انسانی فطرت کو جب اس کی اصل سچائی کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک قدرتی کشش، ایک باطنی میل، اور ایک فطری جھکاؤ حق، سچائی اور پاکیزگی کی طرف موجود ہے۔ یہ جھکاؤ نہ کسی مذہب سے مشروط ہے، نہ کسی تہذیب یا جغرافیائی پس منظر سے محدود۔ بلکہ یہ وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے وجود میں تخلیق کے لمحے سے ودیعت کیا ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو "فطرت اللہ" کے نام سے یاد کیا ہے، جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ یہی فطرت وہ داخلی صداقت ہے جو انسان کو باطل سے چڑ دلاتی ہے، ظلم پر بے چینی پیدا کرتی ہے، جھوٹ سے نفرت سکھاتی ہے، اور سچائی کے سامنے سرِ تسلیم خم کراتی ہے۔ اسی لیے جب انسانوں کو سچے دل سے مخاطب کیا جائے، ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے، اور ان کی اندرونی گہرائیوں سے نکلنے والی حق طلب آواز سے ہم آہنگ ہو کر بات کی جائے تو وہ اس حق کو پہچان لیتے ہیں، چاہے بظاہر وہ کسی اور نظریے یا فکر کے پیروکار کیوں نہ ہوں۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انسان حقیقت کے ساتھ دشمنی نہیں رکھ سکتا۔ بعض اوقات انسان اپنے تعصبات، مفادات، یا کسی وقتی الجھن کی بنا پر سچائی سے منہ موڑ لیتا ہے، مگر یہ مخالفت فطرت کی مخالفت نہیں ہوتی، بلکہ وقتی پردہ یا الجھن ہوتی ہے۔ جیسے ہی وہ پردہ ہٹتا ہے یا ضمیر کی کوئی ضرب اندر تک اثر کرتی ہے، انسان جھک جاتا ہے، رو پڑتا ہے، اور سچ

کو اپنا لیتا ہے۔ تاریخ میں ہمیں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ امام حسینؑ کے قاتلوں میں بہت سے وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد میں پچھتاوے کے آنسو بہائے، توبہ کی، اور اپنے کیے پر نادم ہوئے۔ کیوں؟ کیونکہ سچائی اور معصومیت کی طاقت فطرت کو جھنجھوڑ دیتی ہے، اور ضمیر کو سکون نہیں لینے دیتی، یہاں تک کہ انسان سچائی کے آگے سر جھکا دے۔

اسی بنیاد پر اہلِ حق کی دعوت، تربیت، اور اصلاح کا اصل مرکز ہمیشہ انسان کا باطن اور دل رہا ہے۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اگر کوئی بات خلوص سے، صداقت سے، اور فطرت سے ہم آہنگ ہو کر کی جائے تو وہ ضرور دل میں اترتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور معصومینؑ کی تعلیمات میں بھی بار بار دل کی آنکھ، کان اور فطری سمجھ کو مخاطب بنایا گیا ہے۔ نبی اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دعوتِ اسلام دی تو ابتدائی مخالفتوں کے باوجود ہزاروں دل اس پیغام پر جھک گئے، کیونکہ وہ پیغام فطرت کی زبان میں تھا۔ اس میں تکبر، زور زبردستی، یا دنیاوی مفاد کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

لہٰذا اگر آج بھی ہم لوگوں کے دلوں میں موجود اس فطری ایمان، ان کے ضمیر کی روشنی، اور ان کے احساسات کی پاکیزگی کو اہمیت دیں، اور ان سے وہی گفتگو کریں جو ان کے اندر کی سچائی سے ہم آہنگ ہو، تو ہمیں بڑے اثرات دیکھنے کو ملیں گے۔ ہر انسان میں حق کو پہچاننے اور اپنانے کی استعداد موجود ہے، بس اسے بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بیداری نہ بحث و تکرار سے ہوتی ہے، نہ سخت لہجوں سے، بلکہ نرم انداز، سچے دل، اور فطرت سے ہم آہنگ لہجوں سے ممکن ہوتی ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جو دلوں کو جیتتا ہے، معاشروں کو بدلتا ہے، اور حق کو غالب کرتا ہے۔

قرآن، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی تعلیمات ایسی گہرائی سے ابھرتی ہیں جو انسانی نفس کے سب سے لطیف، مخفی اور باطنی پہلوؤں کو مخاطب بناتی ہیں۔ یہ تعلیمات محض الفاظ یا ظاہری احکام نہیں بلکہ روح کی تہوں سے ہم آہنگ ایسی صدائیں ہیں جو ہر باشعور انسان کے دل کی گہرائی میں اترتی ہیں، بشرطیکہ اس دل پر تعصب، ہٹ دھرمی یا انکار کی موٹی تہیں نہ چڑھی ہوں۔ چونکہ یہ تعلیمات فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں، اس لیے جب کسی شخص کو ان تعلیمات سے متعارف کرایا جاتا ہے، تو اگر اس کے دل میں کوئی ضد یا شخصیت پرستی کا پردہ حائل نہ ہو، تو وہ ان باتوں کو کسی خاص شخصیت یا مذہب کی نسبت کے بغیر بھی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی ایسے انسان کے سامنے ان تعلیمات کو پیش کیا جائے جس کے دل میں اہلِ بیتؑ یا اسلام سے تعصب پایا جاتا ہو، تو انہیں اس انداز میں بیان کیا جانا چاہیے کہ وہ انہیں کسی مخصوص شناخت سے منسلک نہ کرے بلکہ اپنے دل کے آئینے میں انہیں پرکھے، اور جب وہ ان حقائق کو محسوس کرے گا، تو اس کے دل میں ایک خاموش تصدیق پیدا ہو گی۔ یہ تصدیق بسا اوقات بظاہر الفاظ میں نہیں آتی، لیکن اندرونی سکون، وجدانی اطمینان اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے جذبے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

یہی طریقہ کار قرآن نے بھی اپنایا ہے؛ وہ اکثر دلائل کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ کوئی بھی عقل و شعور رکھنے والا فرد، خواہ وہ مومن ہو یا نہ ہو، ان سے انکار نہ کر سکے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہارؑ کی روش بھی یہی تھی کہ وہ گفتگو کو فطرت، عقل اور اخلاق کی زبان میں ڈھالتے تاکہ مخاطب شخص اپنی باطنی فطرت سے ہم آہنگ ہو کر حق کو

پہچان لے، اور وہ باتیں جنہیں اگر کسی نام یا نسبت کے ساتھ پیش کیا جاتا تو تعصب کا شکار ہو جاتیں، وہی باتیں بے نام ہو کر دل میں جا بیٹھتیں۔

اس طرح کے اسلوب کی تاثیر دیرپا ہوتی ہے، کیونکہ یہ دلوں پر وار دہوتی ہے، اور دلوں کا راستہ صرف وہی بات پا سکتی ہے جو سچی، مخلص اور فطری ہو۔ یوں تعلیماتِ اہل بیتؑ کو اس انداز سے پیش کیا جاسکتا ہے کہ دشمن بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ باتیں کہاں سے آئی ہیں، اور وہ اپنے دل میں ان کا نور محسوس کرے، چاہے وہ اسے بظاہر تسلیم نہ کرے۔ حق کا یہ لطیف انداز، دراصل وہی ربانی حکمت ہے جو دلوں کو چیر کر اندر داخل ہوتی ہے اور انسان کو اپنے رب، اپنے نفس اور اپنے مقامِ حقیقی سے آشنا کرتی ہے۔

انسانی زندگی میں پیش آنے والے حالات، مسائل اور آزمائشیں وقت، جگہ اور شکل کے اعتبار سے تو مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن ان کا بنیادی جوہر، اثر اور داخلی کیفیات ہر دور اور ہر انسان میں کم و بیش یکساں رہتی ہیں۔ خوشی، غم، خوف، محرومی، امید، جدوجہد، شکست، کامیابی، بے یقینی، اعتماد—یہ سب وہ کیفیات ہیں جن سے ہر انسان گزرتا ہے۔ یہی وہ زمینی اور باطنی حالات ہیں جن میں قرآن، رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت و تعلیمات ظہور پذیر ہوئیں۔ ان ہستیوں نے ان تمام نفسیاتی، سماجی اور روحانی تجربات سے گزر کر نہ صرف صبر، تقویٰ، حکمت اور عدل کا عملی نمونہ پیش کیا بلکہ ان حالات سے نمٹنے کی عقلی و فطری اسٹریٹیجی بھی فراہم کی۔

یہ اسٹریٹیجیز محض عقائد کی یا عبادات کی سطح تک محدود نہیں بلکہ انسانی عقل، ضمیر اور شعور کے عمیق ترین گوشوں سے ہم آہنگ ہیں۔ اس بنا پر ان ہستیوں کی تعلیمات کو اگر خالصتاً

فکری، اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر پیش کیا جائے، بغیر کسی تعارفی لیبل یا مذہبی نسبت کے، تو یہ افکار دل و دماغ میں اس طرح جذب ہوتے ہیں جیسے پیاسے دل کو پانی کی پہچان خود بخود ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت، اگر تعصبات اور نفسیاتی رکاوٹوں سے پاک ہو، تو وہ سچائی کو سونگھ لیتی ہے، محسوس کر لیتی ہے، اور دل کی گہرائی سے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس لیے اگر ان معصوم ہستیوں کی حکیمانہ باتوں کو ابتدائی مرحلے میں کسی مخصوص مذہبی پہچان کے بغیر صرف ایک عام انسانی، نفسیاتی یا فلسفیانہ اصول کے طور پر پیش کیا جائے، تو مخاطب کی باطنی توجہ اور قلبی آمادگی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

جب یہ افکار ذہن میں رچ بس جائیں، اور سامع ان سے روحانی طور پر ہم آہنگ ہو جائے، تب کسی مناسب موقع پر اگر ان افکار کے اصل ماخذ یعنی ان معصوم ہستیوں کا تعارف کروایا جائے، یا وہ خود مخاطب پر منکشف ہو جائے، تو یہ انکشاف اسے حیرت، محبت اور سچائی کے ایک گہرے تجربے سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس لمحے وہ سمجھتا ہے کہ جس حکمت، توازن اور فطری سچائی سے وہ متاثر ہوا تھا، وہ کسی عام انسان کی پیداوار نہیں بلکہ ربانی بصیرت کے حامل افراد کی عطا ہے، اور یہ تجربہ نہایت پائیدار اثر چھوڑتا ہے۔

اس طرح کی تبلیغ کا عمل ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام ایک ماہر نفسیات، تجربہ کار مبلغ، یا ایسا مربی و مینٹور انجام دے سکتا ہے جو انسانی مزاج، حالات، اور نفسیاتی رکاوٹوں کو سمجھتا ہو، اور اس کے اندر وہ حلم، حکمت، وقت شناسی اور تدریج کی صلاحیت موجود ہو جس کے ذریعے وہ دل کے قفل کھول سکے۔ کلامی ابحاث، مناظرے، یا محض نظریاتی ابلاغ کی راہ سے اکثر اوقات دل کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، کیونکہ مخاطب اپنی شناخت یا عقیدے

کے دفاع میں فوراً مزاحمت کی حالت میں آجاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر فکری اور نفسیاتی سطح پر اس کے ساتھ وہ باتیں شیئر کی جائیں جو وہ اپنے باطن میں پہلے ہی محسوس کر چکا ہو لیکن بیان نہیں کر پا رہا ہو، تو وہ نہ صرف اس کا سامع بنتا ہے بلکہ اس بات کا وکیل بھی بن جاتا ہے۔

یہی اندازِ تبلیغ زیادہ جامع، مؤثر اور پائیدار نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہ وہ راہ ہے جو انبیاء، اولیاء اور حکیم مصلحین نے ہمیشہ اختیار کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ فطرتِ انسانی ہی سب سے بڑا میدانِ تبلیغ ہے

اس فطری اور باطنی روش پر کامیابی سے عمل پیرا ہونے کے لیے سب سے بنیادی شرط صبر کی عظمت اور غضب پر قابو پانے کی صلاحیت ہے۔ چونکہ یہ طریقہ فوری نتائج، سطحی ردعمل یا ظاہری کامیابیوں کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ آہستہ آہستہ دلوں میں اثر ڈالنے اور شخصیت کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا عمل ہے، اس لیے اس میں مسلسل برداشت، ضبطِ نفس اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر جب سامع ناسمجھی، تعصب یا انکار کا مظاہرہ کرتا ہے، یا دلائل سے ہٹ کر طنز، تنقید یا تضحیک کی راہ اپناتا ہے، تو مبلغ یا مربی کے لیے سب سے بڑا امتحان یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھے، غضب کو زیر کرے، اور اپنے مقصد سے غافل نہ ہو۔

صبر صرف برداشت کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک شعوری اور مقصدی ضبط ہے جس کے ذریعے انسان وقتی جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے بلند تر نتائج اور دیرپا اثرات کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ جب کسی شخص میں یہ طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ فوری ردعمل، بحث یا دفاع کی خواہش

کو دبا کر مخاطب کی فطرت کے دروازے پر دستک دیتا ہے، تو پھر اس کے اندر ایسی نورانی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو خود اس کے وجود کو تبلیغ کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح غضب، جو اکثر اوقات سچ کو پیش کرنے کے عمل میں رکاوٹ بن جاتا ہے، اگر مہار کر لیا جائے تو انسان نرم لہجے، سکون آمیز لب و لہجے اور فطرت کے مطابق طرزِ گفتگو سے وہ راستہ ہموار کر دیتا ہے جو دل تک پہنچتا ہے۔

یہ صبر اور غضب پر قابو پانے کی مشق مسلسل تربیت اور تزکیۂ نفس سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مربی کو خود بھی اپنے نفس کے ساتھ جہاد میں مصروف رہنا ہو گا، اپنی نیتوں، الفاظ، افعال اور طرزِ عمل کا جائزہ لیتے رہنا ہو گا، تا کہ وہ ایک ایسے آئینے کی طرح بن جائے جس میں مخاطب اپنا اصل چہرہ پہچان سکے۔ جو شخص خود اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے، وہ دوسروں کے نفسوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا یہ طرزِ تبلیغ محض ایک حکمتِ عملی نہیں بلکہ ایک روحانی تربیت کا عمل ہے، جو صبر، ضبطِ نفس، حلم، نرمی، محبت، اور رب پر توکل جیسے اوصاف پر قائم ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جن سے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام مزین تھے۔ وہ طعن و تشنیع، ظلم و جفا، انکار و استہزاء کے باوجود صبر کرتے رہے، اور ان کے دل سے کبھی رحم و حکمت کی روشنی ختم نہ ہوئی۔ اسی سنت پر چلنے والا مربی ہی اس راہ کا حقیقی وارث اور مبلغ بن سکتا ہے۔

انسان کا دل، خاص طور پر "قلبِ سلیم" وہ لطیف اور پاکیزہ مرکز ہے جو فطرتِ الٰہی سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ قلبِ سلیم وہ دل ہے جو تعصب، کینہ، گناہ اور دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے، اور سچائی، انصاف، نورانیت اور رضائے الٰہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایسے دل

میں اگر کوئی حکم، بات یا فیصلہ بے چینی، اضطراب، یا کسی قسم کی روحانی کدورت پیدا کر رہا ہو، تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس حکم میں کوئی خرابی، ناپاکی یا باطنی فساد موجود ہے۔ شریعت اور عقل دونوں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انسان اپنی روحانی و فطری طہارت کو قربان کر دے محض کسی ظاہری یا جبر کے حکم پر عمل کرنے کے لیے۔

ائمہ معصومینؑ اور اولیائے الٰہی کی سیرت ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ ہر وہ بات جو دلِ بیدار اور فطرتِ سلیم کو ٹھیس پہنچائے، اس پر خاموشی سے عمل نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ایسے مواقع پر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کی گہرائی سے اٹھنے والی بے چینی کو سنے، اس پر غور کرے، اور مکمل اطمینان اور تسلّی کے بغیر کسی حکم کو نہ مانے۔ کیونکہ دینِ اسلام میں اصل بنیاد عقل، فطرت اور یقین ہے — اندھی تقلید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن نے بار بار غور و فکر، بصیرت، اور دل کے سکون کو ایمان کی علامات قرار دیا ہے۔

ایسے میں اگر کوئی حکم، خواہ وہ کسی معاشرتی، مذہبی، یا حکومتی نظام سے صادر ہو، دل میں ناپسندیدگی، بے چینی یا اندرونی تضاد پیدا کرے، تو ایک سچے مومن پر لازم ہے کہ وہ اس پر خاموشی سے عمل نہ کرے، بلکہ پہلے اپنے قلب، عقل، اور شریعت کی روشنی میں تحقیق کرے، اور دیکھے کہ آیا وہ حکم واقعی خدا کی مرضی سے ہم آہنگ ہے یا کسی باطل نظام یا نفسِ امارہ کا غلبہ۔

قلبِ سلیم کی رہنمائی کو نظر انداز کرنا گویا اپنی روحانی بصیرت کو کچلنے کے مترادف ہے۔ اور جس شخص نے اپنی فطری روشنی کو کچل دیا، وہ آہستہ آہستہ ظلمت میں ڈوب جاتا ہے۔ لہٰذا

حقیقی نجات اور بندگی اسی میں ہے کہ انسان اپنے قلبِ سلیم کی آواز کو سنے، اور ہر اس حکم سے بچا رہے جو اس نور کو دھندلا کرے یا اس میں اضطراب پیدا کرے۔

سماجی رشتے اور خدا سے رشتہ

دنیا میں انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ اس کے رشتے ہوتے ہیں۔ ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی، شوہر، اولاد، دوست، یہ سب رشتے انسان کی زندگی کو معنویت، سہارا اور خوشی دیتے ہیں۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا ہے، حالات بدلتے ہیں، ذمہ داریاں بڑھتی ہیں، توقعات کا بوجھ اور معاشرتی دباؤ ان رشتوں کی ساخت کو متاثر کرنے لگتا ہے۔ کچھ رشتے جنہیں کبھی زندگی کا سہارا سمجھا جاتا تھا، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بوجھ لگنے لگتے ہیں، دماغی اور جسمانی سکون کو زہر دینے لگتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت کو جتنا جلدی تسلیم کیا جائے، اتنا بہتر ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی انسان اپنی توقعات کی سمت درست کر سکتا ہے۔

بیشتر لوگ ان باتوں کو زبان پر تو نہیں لاتے، مگر دل میں اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں والدین کا سنبھالنا بوجھ بننے لگتا ہے، خاص طور پر جب بیماری طویل ہو جائے۔ زبان پر دعائیں کی جاتی ہیں کہ اللہ انہیں "سنبھال" لے، لیکن دل کے کسی کونے میں سکون کی تلاش ہوتی ہے۔ بیٹی اگر عمر کی مخصوص حد تک شادی نہ کر پائے، یا اگر طلاق یافتہ یا بیوہ ہو جائے، تو وہ معاشرے کے طعنوں اور دلوں کی بے رخی کا نشانہ بننے لگتی ہے۔ بیٹا، جو کبھی آنکھوں کا تارا تھا، اگر ایک خاص عمر تک معاشی طور پر خودمختار نہ ہو پائے تو والدین کے لیے وہ بھی بوجھ بننے لگتا ہے۔ بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں جب اپنے کندھوں پر آتی ہیں، تو وہ بھی رفتہ رفتہ ناگواری میں بدلنے لگتی ہیں۔

یہ سب اس دنیا کی وہ تلخ سچائیاں ہیں جن سے انسان چاہے جتنا بھی آنکھ چرائے، ان سے مفر ممکن نہیں۔ رشتے جب تک سہولت دیتے ہیں، خوبصورت لگتے ہیں، لیکن جیسے ہی ان سے وابستہ ذمہ داریاں زیادہ ہو جائیں، یا وہ ہماری مرضی کے خلاف چلنے لگیں، ان کا حسن دھندلانے لگتا ہے۔ اور یہی لمحہ دراصل انسان کے احساس، محبت اور شفقت کی موت کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر پل کوئی نہ کوئی احساس مر رہا ہوتا ہے، کوئی ناگوار جملہ، کوئی ناقدری، کوئی بدظنی، آہستہ آہستہ رشتوں کو کھوکھلا کرتی ہے۔

ایسے میں اگر کوئی رشتہ واقعی دائمی، حقیقی اور بے لوث ہے تو وہ صرف اور صرف بندے کا اللہ کے ساتھ رشتہ ہے۔ نہ وہ رشتہ حالات کا محتاج ہے، نہ وقت کا، نہ صحت کا، نہ عمر کا۔ وہ رشتہ صرف خلوص اور سچائی کا تقاضا کرتا ہے۔ انسان جب اس رشتے کو مرکز بناتا ہے، اپنی تمام امیدیں، توقعات، محبتیں اور تنہائیاں خدا کی طرف موڑ دیتا ہے، تو وہ باقی رہتا ہے۔ تب دنیا کے فانی رشتے اگر بوجھ بھی بنیں تو اس پر صبر آتا ہے، برداشت کی قوت پیدا ہوتی ہے، اور دل ٹوٹنے کے باوجود نورانی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے جڑ جاتے ہیں، وہ مخلوق سے حسن سلوک ضرور کرتے ہیں، محبت بھی کرتے ہیں، قربانیاں بھی دیتے ہیں، لیکن بدلے میں توقعات نہیں رکھتے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں مؤمن کا سفر باقیوں سے جدا ہو جاتا ہے۔ ایک مؤمن ان رشتوں کو نبھاتا ہے، محبت دیتا ہے، ایثار کرتا ہے، لیکن وہ ان سے کوئی صلہ یا بدلہ نہیں مانگتا۔ کیونکہ اس کا دل جانتا ہے کہ جو بدلہ اللہ کی طرف سے ملتا ہے، وہی اصل بدلہ ہے۔ قرآن کہتا ہے " : ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ

شکریہ "(سورۃ الدہر: 9). یہی مؤمن کی فطرت ہونی چاہیے کہ وہ ہر رشتہ اللہ کی رضا کی نیت سے نبھائے، بغیر اس کے کہ وہ دوسرے کی طرف سے کسی خاص ردعمل کا منتظر ہو۔ کیونکہ محبت اگر خالص ہو، تو وہ بندے کے دل کو وسیع، نرم، اور صابر بنا دیتی ہے۔

انسان جب اپنے دل کو اللہ کی محبت سے بھر لیتا ہے، تو وہ ٹوٹتا نہیں، چاہے دنیا کے سب رشتے اس سے منہ موڑ لیں۔ وہ رشتے نبھاتا ہے، حتیٰ کہ اس سے ناقدری یا تلخی ہی کیوں نہ ملے، کیونکہ اس کا دل خدا سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر عمل اس کے رب کی نظر میں ہے، اور رب کی نظر سے بڑی کوئی نگاہ نہیں۔ ایسے انسان کا صبر عبادت بن جاتا ہے، اور اس کی مسکراہٹ صدقہ۔ اس کی خدمت گزاری قربتِ خدا کا ذریعہ، اور اس کا ایثار عبادت بن جاتا ہے۔

اس دنیا میں ہمیں رشتوں کو ان کی وقتی خوبصورتی اور انسانوں کے رویوں سے نہیں، بلکہ خدا کی رضا کی نیت سے نبھانا چاہیے۔ اگر ماں باپ کمزور ہو گئے ہیں، تو انہیں بوجھ نہیں بلکہ جنت کا دروازہ سمجھا جائے۔ اگر بیٹی یا بہن کسی آزمائش میں ہے، تو اسے بے وزنی یا شرمندگی کا سبب نہ سمجھا جائے بلکہ عزت اور محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما جائے۔ اگر بیٹا زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے، تو اسے طعنوں سے نہیں، دعاؤں اور رہنمائی سے سہارا دیا جائے۔ کیونکہ جس دن ہم نے اپنے ہر رشتے کو اللہ کی رضا سے جوڑ دیا، اُس دن ہمیں نہ مایوسی ہوگی، نہ تھکن، نہ شکوہ۔

جو دل اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے، وہ رشتوں کو نبھاتا ہے مگر اسیر نہیں ہوتا، محبت کرتا ہے مگر بے بس نہیں ہوتا، توقع نہیں رکھتا مگر مایوس بھی نہیں ہوتا۔ وہ دل روشنی بن جاتا ہے، صبر

اور شفقت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ اور یہی وہ دل ہے جو دنیا کی بے ثباتی میں بھی ثبات پاتا ہے، جو فنا کے بیچ بھی بقا کو تھامے رکھتا ہے۔

یہی انسان کی اصل نجات ہے۔ دنیا کے رشتے عارضی ہیں، ان کی قدر ضرور ہونی چاہیے، لیکن ان سے دل باندھ لینا تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ جو لوگ فانی موجودات سے وابستہ ہو جاتے ہیں، وہ خود بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو بقا سے محبت کرتے ہیں، وہ باقی رہتے ہیں۔ اس لیے بہترین حکمت یہ ہے کہ انسان بیچ کا وقت، یعنی زندگی کا ہر لمحہ، صرف اللہ کی رضا اور محبت میں گزارے۔ رشتوں کو محبت، ایثار، اور حسنِ سلوک سے نبھائے، مگر اپنی توقعات کا مرکز صرف خالق کو بنائے۔ وہی ہے جو کبھی مایوس نہیں کرتا، جو کسی لمحے انسان کو تنہا نہیں چھوڑتا، اور جو ہر حال میں انسان کا خیر خواہ اور راز دان ہے۔

مشکلات و آسانی میں خدا سے رابطہ

انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ جب وہ تکلیف، بیماری، پریشانی یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا دل عاجز ہو جاتا ہے، وہ اپنی کمزوری کا احساس کرتا ہے اور اسی احساسِ بے بسی میں اسے کسی بڑی قوت، کسی سہارا دینے والی ہستی کی تلاش ہوتی ہے۔ یہی کیفیت اسے دعا، توسل اور عبادت کی طرف لے جاتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کے بس کی بات نہیں، اب اگر کوئی اسے بچا سکتا ہے تو وہ صرف خدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر انسان، خواہ کسی بھی مذہب، عقیدے یا نظریے سے تعلق رکھتے ہوں، مصیبت کے وقت خدا کو پکارتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی یہی فرمایا گیا کہ جب انسان کشتی میں سوار ہوتا ہے اور طوفان آتا ہے تو وہ خالص ہو کر اللہ کو پکارتا ہے، لیکن جب وہ خشکی پر پہنچتا ہے تو پھر بھول جاتا ہے۔

نعمتوں کی فراوانی میں انسان کی آنکھیں چونکہ ظاہر پر ہوتی ہیں، وہ خود کو کامیاب، طاقتور، قابل اور لائق سمجھنے لگتا ہے۔ اس پر ایک طرح کی غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اسے ملا ہے، وہ اس کی محنت، قابلیت یا قسمت کا نتیجہ ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ جو سانس وہ لے رہا ہے، جو صحت اسے ملی ہے، جو عقل، رزق، وقت، رشتے، حفاظت اور سکون ملا ہے، یہ سب عطا ہے، امتحان ہے، اور امانت ہے۔ جب نعمتیں میسر ہوں تو

انسان کا دل اکثر مطمئن ہونے کے بجائے مغرور ہو جاتا ہے، اور یہی غرور اسے عبادات سے غافل کر دیتا ہے۔

لیکن قرآن کا پیغام ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ جس طرح مصیبتیں آزمائش ہیں، اسی طرح نعمتیں بھی ایک بہت بڑی آزمائش ہیں۔ مشکلات میں انسان کو صبر اور استقامت کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے، تو نعمتوں میں شکر، عاجزی اور تقویٰ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص مصیبت کے وقت خدا کو یاد کرے لیکن نعمت کے وقت بھول جائے تو اس کی عبادت صرف وقتی جذبات یا مجبوری کا اظہار بن کر رہ جاتی ہے۔ اصل بندہ وہ ہے جو نعمت میں بھی خدا کو اسی طرح یاد رکھے جیسے مصیبت میں رکھتا ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کی دعاؤں اور زندگی سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ ہر حال میں خدا کو یاد کرتے تھے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں میں مصیبت، بیماری، خوف اور تنگی کی دعا بھی ہے، لیکن نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی دعائیں ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک سچا مومن ہر حال میں خدا کو مرکز سمجھتا ہے، وہ نعمتوں کے پیچھے نعمت دینے والے کو دیکھتا ہے، اور مصیبتوں کے پیچھے حکمت رکھنے والے کو پہچانتا ہے۔

پس، انسان کا رویہ دونوں صورتوں میں توازن پر مبنی ہونا چاہیے۔ اگر مصیبت آئے تو وہ صبر، دعا، رجوع اور امید کو تھامے، اور اگر نعمت آئے تو شکر، انکساری، قناعت اور خدمت کو اپنا شعار بنائے۔ یوں وہ دونوں حالوں میں کامیاب ہوتا ہے، کیونکہ اس نے دونوں امتحانوں میں خدا کو نہ بھلایا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں انسان کی اس فطرت کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ مصیبت میں تو اللہ کو پکارتا ہے لیکن جیسے ہی وہ مصیبت دور ہوتی ہے تو غافل ہو جاتا ہے۔ سورہ یونس، آیت 12 میں فرمایا": وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ"...

" اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، لیٹے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے۔ لیکن جب ہم اس سے اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسے چل دیتا ہے جیسے اس نے ہمیں کسی تکلیف میں پکارا ہی نہ تھا۔"

اسی طرح سورہ زمر، آیت 49 میں فرمایا": فَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ"...

"جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، اور جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ مجھے یہ تو میرے علم کی وجہ سے ملا ہے۔"

یہی وہ غفلت ہے جو انسان کو شکر سے دور کرتی ہے۔ جبکہ اہل ایمان کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کو یاد رکھیں، اور شکر گزار بندے بنیں۔ سورہ ابراہیم، آیت 7 میں اللہ فرماتا ہے:

"لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ"...

" اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔"

اہل بیت علیہم السلام کی دعاؤں میں خاص طور پر امام زین العابدین علیہ السلام کی "صحیفہ سجادیہ" ایک عظیم خزانہ ہے جو سکھاتی ہے کہ کیسے ہر حال میں خدا کی طرف رجوع کیا جائے۔ مثلاً "دعائے شکر" میں امامؑ فرماتے ہیں:

"اللَّهُمَّ اجْعَلْنِی أَخْشَاكَ كَأَنِّی أَرَاكَ، وَأَسْعِدْنِی بِتَقْوَاكَ، وَلاَ تُشْقِنِی بِمَعْصِيَتِكَ"...
"اے اللہ! مجھے ایسا بنا دے کہ میں تجھ سے ایسے ڈروں گویا تجھے دیکھ رہا ہوں، اور مجھے اپنی پرہیزگاری سے سرفراز کر، اور اپنی نافرمانی سے مجھے بدبخت نہ کر۔"

ایک اور مقام پر وہ فرماتے ہیں:

"وَكَمْ مِنْ نِعْمَةٍ أَنْعَمْتَ بِهَا عَلَيَّ قَلَّ لَكَ عِنْدَهَا شُكْرِی، وَنَكَدَ لَهَا ذِكْرِی، وَأَبْطَأَ عَنْهَا ثَنَائِی".

"اور کتنی ہی نعمتیں ہیں جو تو نے مجھ پر نازل کیں، لیکن میں نے ان پر تیرا کم شکر ادا کیا، ان کا ذکر بوجھ لگا، اور تعریف کرنے میں دیر کر دی۔"

ان جملوں میں انسان کی کمزوری اور اللہ کی عطا کا تقابل واضح ہے۔ یہ دعائیں انسان کو جگاتی ہیں کہ وہ صرف مشکل میں ہی نہیں بلکہ نعمت میں بھی محتاج ہے، اور ہر لمحہ شکر، توکل اور رجوع کا ہے۔

اہل بیتؑ کی زندگی کا عملی نمونہ بھی یہی ہے۔ امام علیؑ جب کسی کامیابی یا فتح کے بعد گھر لوٹتے تو سجدۂ شکر بجالاتے۔ امام حسنؑ و امام حسینؑ ہر حال میں خدا کو یاد کرتے۔ امام سجادؑ توراتوں کو

عبادت اور دن میں خدمت میں مشغول رہتے، یہاں تک کہ آپؑ کے پشت پر فقیروں کیلئے کھانا لے جانے کی وجہ سے نشان پڑ گئے تھے۔

پس، انسان اگر نعمتوں کو امانت اور آزمائش سمجھے، اور مشکلات کو صبر کا موقع جانے، تو وہ اللہ کے نزدیک مقرب بندہ بن سکتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی سکون پائے گا اور آخرت میں بھی نجات۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ہر حال میں اللہ کی طرف متوجہ رکھیں، نہ صرف مصیبت میں بلکہ نعمت میں بھی، کیونکہ حقیقی عبادت وہی ہے جو خوشی و غم دونوں میں قائم رہے۔

متنوع حالات کے طلبہ کے ساتھ والدین اور اساتذہ کا کردار

تمام طالب علم ایک جیسے تجربات، سہارا دینے والے نظام یا نقطۂ آغاز کے ساتھ اسکول نہیں آتے۔ اگرچہ کلاس روم بظاہر ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ہر طالب علم کی حقیقت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ کچھ طالب علم ذاتی یا خاندانی مسائل کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں، کچھ کو سیکھنے میں ایسی مشکلات ہوتی ہیں جنہیں ابھی تک پہچانا نہیں گیا، اور کئی طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے چھپے ہوئے بوجھ کے ساتھ اسکول کا سفر طے کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم ان تمام طالب علموں کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جیسے وہ ایک ہی جیسے حالات سے گزر رہے ہیں، تو یہ ان کے اصل حالات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہو گا۔ ان کے درمیان فرق کو تسلیم کرنا کسی قسم کا عذر پیش کرنا نہیں، بلکہ ان سیکھنے والوں کی حقیقت کو سمجھنا ہے جو ہمارے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔

ایسی صورتحال میں اساتذہ کا کردار محض معلومات فراہم کرنے والے کا نہیں بلکہ ایک رہنما، سرپرست، اور ہمدرد کا ہوتا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہو کہ ہر طالب علم ایک جیسا نہیں ہے اور وہ مختلف ذہنی، جذباتی، سماجی اور تعلیمی پس منظر سے آتا ہے، تو ہمیں اپنی تدریسی حکمت عملی میں لچک، فہم، اور شفقت کو شامل کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اساتذہ کو درج ذیل اقدامات پر غور کرنا چاہیے:

اساتذہ کو سب سے پہلے اپنی کلاس کے ہر طالب علم کو فرداً فرداً جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ صرف تعلیمی کارکردگی کو دیکھ کر کسی طالب علم کے بارے میں رائے قائم نہ کریں، بلکہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس کے پیچھے کیا محرکات یا رکاوٹیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کوئی طالب علم اگر ہوم ورک نہ کرے یا کلاس میں چپ رہے تو اس کے پیچھے سستی نہیں بلکہ کسی ذہنی دباؤ، گھریلو مسئلے یا کم اعتمادی کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔

اساتذہ کو ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے جہاں ہر طالب علم خود کو محفوظ، محترم اور قابلِ قبول محسوس کرے۔ تنقید سے زیادہ حوصلہ افزائی، اور سزا سے زیادہ رہنمائی کا رویہ اپنایا جائے۔ اگر کوئی بچہ کلاس میں پیچھے رہ جائے تو اسے شرمندہ کرنے کے بجائے نرمی سے سمجھایا جائے اور اس کی مدد کی جائے کہ وہ دوبارہ سیکھنے کے عمل میں شامل ہو سکے۔

اساتذہ کو چاہیے کہ وہ تدریسی مواد اور اسلوب میں تنوع رکھیں تاکہ مختلف ذہنی سطحوں اور سیکھنے کے انداز رکھنے والے بچوں کو فائدہ پہنچے۔ کوئی بچہ بصری انداز سے بہتر سیکھتا ہے، کوئی سمعی، اور کوئی عملی تجربات کے ذریعے۔ اگر ہم صرف ایک ہی طرزِ تدریس پر انحصار کریں گے تو کئی بچے پیچھے رہ جائیں گے۔

اساتذہ کو اپنی مشاہداتی صلاحیت کو بڑھانا چاہیے تاکہ وہ ان اشاروں کو سمجھ سکیں جو طالب علم کے رویے، باڈی لینگویج یا خاموشی میں چھپے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات بچے اپنے مسائل کا براہِ راست اظہار نہیں کرتے لیکن ان کے اندر ایک پکار ہوتی ہے جسے ایک باشعور استاد ہی محسوس کر سکتا ہے۔

اساتذہ کو چاہیے کہ وہ اسکول کے دیگر ماہرین، جیسے کہ کونسلر، سماجی کارکن یا والدین سے رابطہ رکھیں۔ بعض معاملات میں صرف استاد کا کردار کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک مکمل سپورٹ سسٹم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ طالب علم کو اس کی اصل مشکلات سے نکالا جاسکے۔

اساتذہ کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ صرف مضمون کے استاد نہیں بلکہ کردار، رویے اور حوصلے کے معمار بھی ہیں۔ وہ اپنے رویے سے بچوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ شفقت، فہم، صبر اور حمایت کیا ہوتی ہے۔ اگر استاد ایک بچے کو اس کی انفرادی کیفیت کے مطابق سمجھے گا، تو وہ بچہ نہ صرف تعلیمی لحاظ سے آگے بڑھے گا بلکہ اپنی شخصیت کی تعمیر میں بھی کامیاب ہوگا۔

ایسی صورتِ حال میں والدین کا کردار بھی نہایت اہم اور حساس ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے بچے کو ایک ایسے ماحول میں بھیج رہے ہوتے ہیں جہاں ہر بچے کی ذہنی، معاشرتی، اور جذباتی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ اگر والدین صرف اپنے بچے کی فکر کریں اور باقی بچوں کو نظر انداز کر دیں تو وہ اپنے بچے میں خود غرضی، عدم رواداری اور طبقاتی احساسات پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے والدین کو درج ذیل نکات کو اپنے طرزِ تربیت میں شامل کرنا چاہیے:

سب سے پہلے والدین کو اپنے بچے کو یہ شعور دینا چاہیے کہ ہر انسان کی زندگی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کسی کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے، کسی کے پاس بہت کم۔ کسی کو گھر سے مکمل سہارا ملتا ہے تو کوئی بچہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا ہوتا ہے۔ یہ شعور بچے میں ہمدردی، رواداری اور انسان دوستی پیدا کرتا ہے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچے کو یہ سکھائیں کہ کسی کو اس کی ظاہری حالت، لباس، بول چال یا تعلیمی کارکردگی سے نہیں پرکھنا چاہیے۔ انسان کی اصل پہچان اس کے اخلاق، رویے اور جذبۂ تعاون سے ہوتی ہے۔

اپنے بچے کو یہ ذہن نشین کروائیں کہ اگر کسی ساتھی طالب علم کو کسی معاملے میں دشواری ہو، چاہے وہ پڑھائی ہو، بول چال ہو یا جذباتی کیفیت، تو اس کی مدد کرنا ایک نیکی ہے، اور دینِ اسلام بھی دوسروں کی مدد کو بہت بڑا اجر قرار دیتا ہے۔

والدین کو خود بھی اسکول کے ماحول سے واقف رہنا چاہیے، اساتذہ سے رابطے میں رہنا چاہیے تاکہ وہ جان سکیں کہ ان کا بچہ کس طرح کے بچوں کے ساتھ وقت گزار رہا ہے اور اس کے رویے میں کوئی مثبت یا منفی تبدیلی آ رہی ہے یا نہیں۔

گھر میں ایسا ماحول فراہم کریں جہاں بچہ اپنے دن بھر کے تجربات کھل کر بیان کر سکے۔ بچے کی بات کو توجہ سے سنیں اور اگر وہ کسی ساتھی کی مشکلات یا عجیب رویے کا ذکر کرے تو اسے نرمی سے سمجھائیں کہ ہر شخص کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔

والدین اگر خود سماجی شعور اور تنوع (diversity) کی قدر کریں گے تو ان کا بچہ بھی یہی رویہ اپنائے گا۔ اگر والدین دوسرے بچوں یا ان کے خاندانوں کے بارے میں منفی تبصرے کریں گے تو بچہ بھی تعصب اور برتری کا شکار ہو گا۔

آخر میں، والدین کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ زندگی صرف کتابوں میں کامیاب ہونے کا نام نہیں، بلکہ ایک باشعور، بااخلاق، اور دوسروں کا احساس کرنے والا انسان بننے کا نام ہے۔ اگر آپ کا بچہ ایسا بن گیا تو وہ نہ صرف اپنی بلکہ معاشرے کی بھی اصلاح کا سبب بنے گا۔

کربلا پر آنسو اور جنت کا وجوب

اسلام میں گریہ کو صرف ایک جذباتی اظہار یا مذہبی علامت کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اسے ایک روحانی، نفسیاتی اور وجودی عمل کے طور پر پہچانا گیا ہے جو انسان کی روحانی کیفیت، باطنی صفائی اور شعور کی گہرائیوں سے جڑا ہوا ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے خاندان و اصحاب پر ڈھائے گئے مظالم کے ذکر پر آنکھ سے اگر مچھر کے پَر برابر بھی آنسو نکل آئے، تو حدیث کے مطابق جنت واجب ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کو صرف ظاہری معنوں میں نہیں، بلکہ گہرے سائنٹفک اور نفسیاتی تناظر میں سمجھنا انسان کی فطرت اور اس کے روحانی سفر کو جاننے میں مدد دیتا ہے۔

سائنس، خصوصاً نیوروسائنس اور نفسیات، اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ رونا یا گریہ کرنا انسانی شعور، ہمدردی، اور معنوی حساسیت کا اظہار ہے۔ گریہ صرف ایک فزیکل عمل نہیں بلکہ یہ مخصوص اعصابی کیمیکل تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ جب انسان کسی مظلوم پر ہونے والے ظلم کو سن کر یا یاد کر کے روتا ہے، تو اس کے دماغ میں آکسیٹوسن اور اینڈورفنز جیسے کیمیکل خارج ہوتے ہیں، جو نہ صرف ذہنی سکون دیتے ہیں بلکہ فرد کے اندر ہمدردی، تعلق اور روحانی کشش کو بڑھاتے ہیں۔ امام حسینؑ کے واقعہ پر رونا دراصل انسان کے ضمیر کے زندہ ہونے، دل کے بیدار ہونے، اور حق و باطل کی تمیز پر یقین رکھنے کا ثبوت ہے۔

امام حسینؑ کا کربلا میں موقف محض ایک شخصی مظلومیت نہیں، بلکہ وہ پوری انسانیت کے لیے عدل، صداقت، اور خدا پرستی کی علامت بنے۔ جب کوئی شخص ان مظالم کو سن کر بے چین ہوتا ہے اور اس کی آنکھ سے آنسو بہتا ہے، تو یہ اس کے دل کی معنوی حیات کا ثبوت ہوتا ہے۔ ایسے آنسو اس بات کا اشارہ ہوتے ہیں کہ اس کا دل ظلم کے خلاف، مظلوم کے حق میں، اور خدا کی راہ پر قربانی دینے والوں کے ساتھ ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں "قلبِ سلیم" کی بڑی اہمیت ہے، اور امام حسینؑ پر گریہ کرنا اسی قلبِ سلیم کی علامت بن جاتا ہے۔

نفسیاتی طور پر یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ گریہ انسان کو گناہوں کے بوجھ سے ہلکا کرتا ہے، جذباتی طور پر کثافتوں کو نکالتا ہے، اور اسے توبہ، رجوع اور اصلاح کی طرف مائل کرتا ہے۔ جب ایک شخص امام حسینؑ کے غم میں روتا ہے، تو وہ درحقیقت ایک پاکیزہ احساس سے گزرتا ہے، جو اسے گناہوں سے نفرت اور نیکی کی طرف رغبت دیتا ہے۔ یہی اندرونی تبدیلی جنت کے راستے کی نشاندہی کرتی ہے، کیونکہ جنت صرف عبادت سے نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی اور اخلاص سے بھی حاصل ہوتی ہے۔

مزید برآں، سوشیالوجی کے اصول بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اجتماعی گریہ یعنی مجالسِ عزاداری میں رونا، نہ صرف فرد کی روحانی نشوونما کرتا ہے بلکہ سماجی سطح پر بھی حق و عدل کے اصولوں کی ترویج کرتا ہے۔ اس میں انسان صرف ذاتی طور پر متاثر نہیں ہوتا بلکہ ایک اجتماعی شعور کا حصہ بنتا ہے، جو مظلوموں کی حمایت، ظالموں کی مذمت، اور قربانی کی

قدر کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرح امام حسینؑ پر آنسو بہانے والا فرد صرف جذباتی طور پر نہیں بلکہ عملی، اخلاقی اور سماجی سطح پر بھی ایک صالح اور بیدار انسان بننے کے راستے پر آجاتا ہے۔

لہٰذا اگر حدیث کہتی ہے کہ امام حسینؑ پر اگر مچھر کے پَر برابر بھی آنسو بہا، تو جنت واجب ہے، تو یہ کوئی ظاہری انعام نہیں بلکہ اس آنسو کے پیچھے چھپی ہوئی روحانی بیداری، اخلاقی بلندی، اور خدا کی راہ پر قربانی دینے والوں سے محبت کا صلہ ہے۔ یہ آنسو انسان کے لیے ایک روحانی دروازہ کھولتے ہیں، جہاں سے وہ اللہ کی معرفت، رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت، اور اہل بیتؑ کی ولایت کے نور میں داخل ہو سکتا ہے۔ یہ عمل صرف نجات کا سبب نہیں بلکہ انسان کو اس دنیا میں بھی اخلاق، رحم، صداقت اور عدل کا علمبردار بناتا ہے، اور یہی وہ صفات ہیں جو انسان کو جنت کے قابل بناتی ہیں۔

اسی طرح لعنت، جس کا لغوی مطلب کسی فرد یا گروہ کو رحمتِ خدا سے دوری کی بددعا دینا ہے، صرف ایک مذہبی یا اخلاقی عمل ہی نہیں بلکہ انسانی شعور، اجتماعی حافظے، اور نفسیاتی نظام پر بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔ خاص طور پر جب یہ لعنت ایسے ظالموں اور جابروں پر کی جاتی ہے جنہوں نے معصوم اور مقدس ہستیوں جیسے انبیاءؑ، ائمہؑ یا امام حسینؑ جیسے مظلوم شہید پر ظلم ڈھایا ہو، تو اس عمل کی سائنٹفک بنیادیں بھی نظر آتی ہیں۔

نفسیات کی زبان میں جب کوئی انسان کسی ظلم کے خلاف شدید ردعمل کے ساتھ نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتا ہے، تو وہ ایک طرح کا "نفسیاتی تطہیر (psychological catharsis)" انجام دے رہا ہوتا ہے۔ یہ تطہیر انسان کو غم، غصے، بے بسی اور انتقام کے

جذبات سے آزاد کرتی ہے، اور اسے ایک اخلاقی موقف اختیار کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ لعنت دراصل ایک علامتی اظہار ہے، جو مظلوم کے ساتھ وابستگی اور ظالم سے دائمی جدائی کا اعلان ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص قاتلانِ انبیاء یا امام حسینؑ پر لعنت کرتا ہے تو وہ درحقیقت حق اور باطل کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ رہا ہوتا ہے، جو اس کی شعوری اور لاشعوری اقدار کو واضح کرتا ہے۔ یہ اعلان مظلوم کی حمایت اور ظالم کی تردید کا نفسیاتی استحکام پیدا کرتا ہے، جو فرد کی اخلاقی ترقی اور روحانی بیداری کا ذریعہ بنتا ہے۔

سوشیالوجی کی رو سے لعنت کا عمل اجتماعی ضمیر کی تطہیر کرتا ہے۔ جب کسی قوم یا امت میں کسی تاریخی ظلم یا فاجعے پر مسلسل لعنت کی جاتی ہے، تو وہ ظلم کے خلاف ایک اجتماعی شعور پیدا کرتی ہے۔ یہ شعور نسل در نسل منتقل ہوتا ہے اور نئی نسل کو ظالم سے بیزاری اور مظلوم سے وفاداری سکھاتا ہے۔ یہ عمل معاشرتی تعلیم و تربیت کا حصہ بنتا ہے، جو قوموں کو ظلم سے نفرت اور عدل سے محبت کے اصول پر تربیت دیتا ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے اہل بیتؑ پر ظلم کی یاد اور اس کے ذمہ داروں پر لعنت، اہل تشیع کے ہاں ایک شعوری نظام کا حصہ ہے جو ان کے اقدار، عزتِ نفس اور غیرت کو زندہ رکھتا ہے۔

سائنس اس بات کو بھی تسلیم کرتی ہے کہ انسان کے جذبات، نیتیں اور دعائیں ایک خاص قسم کی توانائی پیدا کرتی ہیں۔ جیسے دعا مثبت ارتعاش (positive vibrations) پیدا کرتی ہے، ویسے ہی لعنت ایک قسم کی منفی توانائی کو رد کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن یہاں "منفی" کا مطلب ضرر نہیں بلکہ ظلم، شر اور فریب کی توانائی کو مسترد کرنے کا روحانی نظام

ہے۔ جب کوئی شخص خلوصِ نیت سے ظالم پر لعنت کرتا ہے تو وہ دراصل ایک توانائیاتی عمل انجام دیتا ہے جو نہ صرف اس کے اپنے باطن کو ظلم کے اثر سے محفوظ کرتا ہے بلکہ عالمِ مثال میں بھی باطل کی طاقت کو کمزور کرتا ہے۔

یہ لعنت محض جذباتی ردعمل نہیں بلکہ ایک روحانی اور اخلاقی دفاعی نظام ہے، جو انسانی ضمیر کو زندہ رکھتا ہے۔ یہ عمل فرد کو اپنے موقف پر ثابت قدم رکھتا ہے، باطل کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت یا بے حسی کو روکتا ہے، اور مظلوموں کے ساتھ ایک دائمی روحانی رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیارتِ عاشورا اور دیگر متون میں "تجدیدِ لعنت" کا تصور موجود ہے، تاکہ ہر زمانے کے انسان حق اور باطل کو پہچان کر اپنا مقام طے کرے۔

اس طرح دیکھا جائے تو قاتلانِ انبیاءؑ، امام حسینؑ اور مظلومانِ تاریخ پر لعنت کا عمل انسان کے شعور، روح، سماج اور حتیٰ کہ توانائیاتی نظام پر اثر انداز ہونے والا ایک گہرا، بامعنی اور دیرپا عمل ہے، جو ظلم کو مسترد اور حق کو اپنانے کا اعلانیہ ذریعہ بن جاتا ہے۔

رہبری، مخالفتیں اور نظر بندیاں

ہر ریاست اپنے قومی مقاصد، نظریاتی بنیادوں اور تاریخی پس منظر کے مطابق ایک جامع نیشنل وژن ترتیب دیتی ہے۔ یہ وژن ریاست کی بنیاد رکھنے والے بانیان کی فکری رہنمائی، ان کے سیاسی و اخلاقی اصولوں اور قومی ضروریات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ریاست کے قوانین، پالیسیز، اور انتظامی فیصلے اسی وژن کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔ جب کسی ریاست میں قیادت، رہبری یا انتظامی اختیار کسی فرد یا ادارے کو دیا جاتا ہے تو وہ عقل و منطق، تجربہ، قومی اعتماد اور قانونی دائرہ کار کے تحت سونپا جاتا ہے۔ اس قیادت کا فریضہ محض قانون سازی یا نظم و نسق چلانا نہیں ہوتا بلکہ وہ ریاستی سالمیت، قومی وحدت، اور مستقبل کی پالیسی سازی میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

خاص طور پر دفاعی معاملات میں قیادت اور ریاستی انتظامیہ کا کردار نہایت حساس اور ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ یہ ایسے معاملات ہوتے ہیں جن کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو محض ظاہری مشاہدے یا علمی مباحثے سے پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ انٹیلیجنس رپورٹس، بین الاقوامی تعلقات، سکیورٹی خدشات، داخلی انتشار کے خطرات اور دشمن کی حکمت عملی جیسے کئی عناصر ایسے ہوتے ہیں جو عام شہریوں یا ماہرین تعلیم کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لہٰذا، دفاعی فیصلوں میں رہبر اور اعلیٰ انتظامیہ کو مکمل اختیار اور اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ وہ قوم کی

بہتری اور ریاست کے مفاد میں کون سا قدم کب اور کیسے اٹھائیں۔ ان کے پاس وہ معلومات اور تجزیے ہوتے ہیں جو فیصلہ سازی کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔

یقیناً ایک یونیورسٹی پروفیسر یا ماہر تعلیم اپنے میدان میں نہایت قابل اور مخلص ہو سکتا ہے اور وہ ملک و قوم کی فلاح کی نیت سے کسی حکومتی فیصلے یا بیانیے پر تنقید کرے۔ اس کا انداز بھی تعمیری اور خلوص پر مبنی ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ دفاعی یا حکومتی پس پردہ معلومات سے باخبر نہیں ہوتا، اس لیے اس کی رائے بعض اوقات زمینی حقائق اور قومی مفادات سے متصادم ہو سکتی ہے۔ ریاست کو اس مرحلے پر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا اس اعتراض کو محض علمی اختلاف سمجھ کر برداشت کیا جائے یا اس پر قدغن لگائی جائے، کیونکہ ہر اعتراض محض علمی یا خالص نیت پر مبنی نہیں ہوتا، اور ہر تنقید کے پیچھے مصلحت کا فقدان بھی ہو سکتا ہے۔

اس لیے اگر کسی مخصوص موقع پر، خاص حالات میں، ریاستی پالیسی یا قانون پر اعتراض ایسا ہو جس سے قومی ایجنڈا یا ریاستی سلامتی متاثر ہو سکتی ہو، تو قیادت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اعتراض کرنے والے فرد پر پابندی عائد کرے یا حتیٰ کہ اسے نظر بند کر دے۔ اس اقدام کا مقصد صرف مخالفت کو دبانا نہیں بلکہ ریاستی مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ البتہ، اگر معترض شخص دیانتداری سے اور کسی ذاتی مفاد کے بغیر اعتراض کر رہا ہو تو اسے غدار قرار دینا بھی مناسب نہیں۔ ایک مہذب ریاست اور بااصول قیادت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے افراد کی نیت کو پرکھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرے، نہ کہ محض اظہارِ رائے کی بنیاد پر انہیں سزا دے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ پرخلوص اور دور اندیش قیادت کبھی وقتی مفادات، ذاتی لالچ یا سیاسی دباؤ کے تحت ایسے سخت فیصلے نہیں لیتی، بلکہ وہ طویل المدتی منصوبہ بندی اور ریاستی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر قدم اٹھاتی ہے۔ اس لیے ایسے معاملات میں ریاست کے خلاف کھلے عام تنقید کرنا یا اس کے اقدامات کو یک طرفہ طور پر ظلم یا جبر قرار دینا ایک سطحی رویہ ہو گا۔ عوام، دانشور، اور ماہرین تعلیم کو چاہیے کہ وہ ان فیصلوں کے پس منظر کو سمجھیں، ریاستی مصلحتوں کا ادراک کریں، اور اگر اختلاف ہو بھی تو اس کے اظہار کا وقت، جگہ اور انداز ایسا ہو جو قومی وحدت، امن عامہ اور ریاستی استحکام کو نقصان نہ پہنچائے۔

بالآخر ایک مہذب معاشرے میں آزادیِ اظہار اور ریاستی نظم و انضباط کے درمیان توازن برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ توازن اسی وقت ممکن ہے جب قیادت شفاف، دیانت دار اور دور اندیش ہو، اور عوام باشعور، ذمہ دار اور قومی مفاد سے جڑے ہوئے ہوں۔ یہی وہ رشتہ ہے جس پر ایک مضبوط، پائیدار اور بیدار ریاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

ڈپلومیسی اور منافقت: حق و باطل کے آئینے میں

انسانی معاشرت اور سیاسی روابط میں کچھ اصطلاحات بظاہر ایک جیسی محسوس ہوتی ہیں، لیکن ان کے مفہوم، بنیاد اور اثرات میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ان میں سے دو اہم اور اکثر خلط ملط کی جانے والی اصطلاحات ہیں: "ڈپلومیسی" اور "منافقت"۔ بظاہر دونوں میں نرمی، حسنِ گفتار اور بسا اوقات حقیقت کو جزوی یا مکمل طور پر چھپانے کا عمل شامل ہوتا ہے، لیکن جب ہم ان دونوں کو "حق و باطل" کے میزان میں پرکھتے ہیں تو ان کے درمیان دقیق مگر بنیادی فرق سامنے آتے ہیں۔

ڈپلومیسی، جسے اردو میں "سفارت کاری" یا "چالاکی سے بات چیت" کہا جاتا ہے، اصل میں عقل، فہم، اور حکمت سے بات کرنے کا نام ہے۔ یہ وہ مہارت ہے جس کے ذریعے انسان کسی سخت یا ناپسندیدہ حقیقت کو اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ سامنے والا اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے یا کم از کم بیزاری محسوس نہ کرے۔ ڈپلومیسی کا مقصد کسی مسئلے کو پرامن انداز میں حل کرنا، فتنہ وفساد سے بچنا، یا کسی بڑے نقصان سے بچاؤ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کی نیت میں اخلاص ہو، اور اس کی ڈپلومیسی کا مقصد اصلاح، خیر یا حق کا فروغ ہو، تو اسلام اسے نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات مستحسن قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید میں "قول حسن" یعنی بھلی بات کہنے کا بارہا حکم دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ فرعون جیسے سرکش شخص کو بھی اللہ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو حکم دیا کہ وہ اس سے "قولاً

لیناً" یعنی نرم گفتگو کریں، شاید وہ نصیحت قبول کر لے۔ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں بھی ہمیں ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں انھوں نے شدت کے مواقع پر بھی نرمی اور حکمت کو ترجیح دی۔ امام حسن علیہ السلام کی صلح، اس کی واضح مثال ہے۔ ان کی یہ سیاسی حکمت عملی وقتی طور پر اپنے ظاہری اہداف سے پیچھے ہٹنا تھی، لیکن مقصد امت مسلمہ کو خانہ جنگی سے بچانا اور دین کی اساس کو تحفظ دینا تھا۔ یہاں ڈپلومیسی نے حق کی خدمت کی، نہ کہ اس کی نفی۔

اس کے بر خلاف، منافقت ایک اخلاقی بیماری ہے، جسے قرآن کریم نے سختی سے مذمت کی ہے۔ منافق وہ ہوتا ہے جو ظاہر میں ایمان، خیر یا اصول پسندی کا دعویٰ کرے، لیکن باطن میں اس سے خالی ہو۔ اس کی شخصیت کی پروجیکشن جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے، اس کا چہرہ عوام کے لیے مصنوعی ہوتا ہے اور اس کا دل باطل اور فریب سے لبریز ہوتا ہے۔ منافقت کا مقصد ذاتی فائدہ، فتنہ انگیزی، یا حق کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ وہ بظاہر دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتا ہے، لیکن اس کا ہر عمل دل کی ناپاکی کا مظہر ہوتا ہے۔

قرآن میں سورۂ منافقون اسی طبقہ کی تفصیل پیش کرتی ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ رسول خدا صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آکر کہتے ہیں: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں"، حالانکہ ان کے دل اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ان کا یہ عمل ایک دھوکہ ہے، جس سے وہ نہ صرف خود گمراہ ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

ڈپلومیسی اور منافقت کے درمیان جو بنیادی فرق ہے، وہ نیت، اخلاص، اور مقصد کا ہے۔ ڈپلومیسی میں ممکن ہے انسان اپنے اصل جذبات یا مؤقف کو وقتی طور پر ظاہر نہ کرے، لیکن وہ دل میں حق کا پابند ہوتا ہے، اور اس کا ظاہری طرزِ عمل بھی ایک حکیمانہ خیر خواہی کے جذبے سے معمور ہوتا ہے۔ جبکہ منافق کا دل اور زبان ایک نہیں ہوتے، وہ اپنے ظاہر سے باطن کو چھپاتا ہے تاکہ لوگوں کو دھوکہ دے سکے۔ اس کے عمل کا محرک نہ حکمت ہوتی ہے، نہ خیر، بلکہ محض خودغرضی، دنیا پرستی، اور فتنہ انگیزی۔ یعنی مومن کے دل میں حق ہوتا ہے اور ظاہر میں باطل اور منافق کے دل میں باطل ہوتا ہے اور ظاہر میں حق۔

اسلامی فکر میں تقیہ کا تصور بھی بعض لوگوں کو منافقت سے مشابہ لگتا ہے، لیکن درحقیقت یہ مفہوم اور مقصد کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ تقیہ ایک ایمان پر مبنی حفاظتی حکمت عملی ہے، جو ظلم یا جبر کے ماحول میں اپنا ایمان محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے، جب کہ منافقت سراسر دھوکہ، جھوٹ اور کفر کا اظہار ہے۔

نتیجہ کے طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی شخصیت کی پروجیکشن کسی اعلیٰ مقصد، اصلاح، اور خیر خواہی کے تحت ہو، اور اس کے اندر اور باہر میں تضاد نہ ہو، تو وہ ڈپلومیسی کہلاتی ہے، جو بعض اوقات عین حکمت اور دین کی خدمت بن جاتی ہے۔ لیکن اگر شخصیت کی پروجیکشن فریب، دوغلے پن، اور جھوٹ پر مبنی ہو، تو وہ منافقت ہے، جو نہ صرف انسان کو ہلاکت میں ڈالتی ہے بلکہ معاشرے کو بھی بداعتمادی اور فساد کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔

اسلام ہمیں نہ صرف منافقت سے بچنے کا درس دیتا ہے بلکہ سچائی، اخلاص، اور حکمت کو زندگی کا شعار بنانے کی دعوت دیتا ہے، تاکہ ہم اپنے کردار سے حق کو بلند اور باطل کو شکست دے سکیں۔

دلوں کا اشتراک

اسلام ایک عالمگیر دین ہے جو تمام انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا ہے، نہ کہ کسی مخصوص قوم، نسل یا قبیلے کے لیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ انسانیت کو بارہا ”یا اَیُّھا النّاس“ کہہ کر مخاطب کرتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کا پیغام عالمی ہے۔ اس بنیاد پر ایک عام مسلمان مومن کو بھی اپنی نیت اور طرزِ عمل میں تمام انسانوں کے لیے خیر خواہی، محبت، احترام اور ہمدردی رکھنی چاہیے، چاہے وہ کسی بھی مذہب، قوم، نسل یا عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں۔

اسلام ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم لوگوں کو دین کی طرف بلائیں لیکن یہ دعوت حکمت، نرمی، حسنِ اخلاق اور حسنِ کلام کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت سے بلاؤ اور ان سے ایسے انداز میں گفتگو کرو جو بہترین ہو۔ اس آیتِ مبارکہ میں تین اصول واضح کیے گئے ہیں: حکمت، حسنِ موعظہ اور احسن طریقِ گفتگو۔ ان اصولوں پر عمل کرنے والا شخص دلوں کو جیتتا ہے، نہ کہ بحث و تکرار سے انہیں دور کرتا ہے۔ اس کا اسلوب ایسے ہوتا ہے جو خود اپنے اندر دلوں کو مائل کرنے کی تاثیر رکھتا ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک مسلمان کی نیت میں خلوص ہونا چاہیے۔ وہ دوسروں کو نیچا دکھانے یا فتح کرنے کے بجائے یہ ارادہ رکھے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو ان کے خالق کے ساتھ جوڑنا چاہتا ہے، انہیں سچائی، سلامتی، انصاف اور روحانی سکون کی طرف دعوت دینا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ جیسے مجھے حق کی روشنی نصیب ہوئی، اسی طرح دوسرے انسان بھی اللہ کے قرب سے بہرہ مند ہوں۔

دعوت کا انداز ایسا ہو کہ سامنے والا خود محسوس کرے کہ یہ شخص میری خیر چاہتا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی غیر مسلم سے بات کریں تو یہ نہ کہیں کہ تم غلط ہو یا تم جہالت میں ہو، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اسلام میں جو امن، مقصدِ زندگی اور دل کا سکون پایا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی ان قیمتی نعمتوں سے آشنا ہوں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی رب کی مخلوق ہیں، اور اس نے ہمیں خیر، محبت، عدل اور علم کیلئے پیدا کیا ہے۔ میں آپ کیلئے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو وہ ہدایت نصیب ہو جو آپ کے دل کو سکون دے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم صرف سچائی، انسانیت اور عدل پر بات کریں، کیونکہ یہ وہ اقدار ہیں جو ہر دین اور ہر ضمیر تسلیم کرتا ہے۔

یہ نرمی، محبت اور عزت پر مبنی جملے غیر مسلموں کے دلوں میں دلچسپی، تجسس اور رغبت پیدا کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے پیچھے اگر عمل کی صداقت ہو، یعنی ایک مسلمان خود دیانت دار، سچ بولنے والا، خوش اخلاق، دوسروں کا خیر خواہ اور ظلم سے نفرت کرنے والا ہو، تو اس کی دعوت بہت مؤثر ہو جاتی ہے۔ اس کا کردار، اس کے الفاظ سے زیادہ پر اثر ہوتا ہے۔ رسولِ

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اس کا عملی نمونہ ہے۔ آپ نے کفار، غلاموں، ہمسایوں اور دشمنوں تک سے جس حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا، اس سے لوگوں نے اسلام کو دل سے قبول کیا۔

یہ بات اہم ہے کہ اگر ہم دنیا کے مختلف مذاہب، مکاتب اور فلسفوں کو دیکھیں تو سب ایک مثالی مستقبل کے انتظار میں ہیں، ایک ایسی دنیا کی امید رکھتے ہیں جہاں ظلم کا خاتمہ ہو، عدل کا بول بالا ہو، انسانیت کی قدر ہو اور روحانی بیداری عام ہو۔ یہی وہ صفات ہیں جو ظہورِ امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کے مقصد کی بنیاد ہیں۔ اگرچہ دنیا امام کو اس نام سے نہ جانتی ہو، لیکن اگر ہم انسانیت کو عدل، امن، علم، قربانی، اخوت اور ہمدردی کی طرف بلاتے رہیں تو وہ خود بخود ظہور کے میدان میں قدم رکھ دیں گے، چاہے انہیں اس کی خبر نہ ہو۔

لہٰذا ایک عام مومن کا رویہ سب کیلئے خیر خواہی، سچائی، عدل اور نرمی پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کی گفتگو دعا کے انداز میں، عمل صداقت کے ساتھ، اور نیت اخلاص سے بھری ہو۔ ایسا مومن صرف زبان سے نہیں بلکہ اپنے کردار سے اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے اسلام کا نور دلوں میں سرایت کرتا ہے، اور لوگ نرمی، محبت اور سچائی کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بات مزید وضاحت طلب ہے کہ اسلام کی دعوت میں سب سے اہم عنصر صبر اور وقت کی اہمیت کا شعور ہے۔ ایک سچا مومن جانتا ہے کہ دلوں کا ہدایت کی طرف مائل ہونا کوئی وقتی یا زبانی تبدیلی نہیں بلکہ ایک تدریجی اور فطری عمل

ہے۔ جیسے زمین کو نرم کیا جاتا ہے، اس میں بیج ڈالا جاتا ہے، اسے پانی دیا جاتا ہے، دھوپ اور ہوا فراہم کی جاتی ہے اور وقت کے ساتھ اس بیج سے ایک پودا نکلتا ہے، ویسے ہی دلوں کی زمین پر بھی ہدایت کے بیج محبت، حسنِ سلوک اور مسلسل خیر خواہی سے بوئے جاتے ہیں۔ اگر ایک مومن چاہے کہ اس کی بات فوراً اثر کرے یا وہ جذباتی انداز میں مخاطب کو بدل دے، تو وہ دعوت کے اس صبر آزما سفر کی حقیقت سے ناواقف ہو گا۔

اس کے علاوہ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر شخص کی فطرت میں نیکی، سچائی اور خیر کی طلب موجود ہے، چاہے وہ کسی بھی دین یا نظریے سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر ایک مسلمان ان فطری قدروں کو پہچان لے اور ان کی بنیاد پر گفتگو کرے تو دلوں کی دیواریں خود بخود گرنے لگتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص سے بات کرتے ہوئے اس کے ضمیر کی آواز کو سنا جائے، اس کے دکھ، محرومیوں یا روحانی تلاش کو سمجھا جائے اور پھر اس کے سوالات کے جواب محبت، منطق اور علم کے ساتھ دیے جائیں تو وہ مسلمان سے نہ صرف متاثر ہو گا بلکہ اس کی بات میں کشش بھی محسوس کرے گا۔ بعض اوقات صرف ایک جملہ، ایک دعا، ایک ہمدردانہ لمس یا خاموشی سے کیا گیا کوئی نیکی کا عمل کسی انسان کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔

اسلام کے پیغام کو عام کرتے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان خود اپنے دل و زبان کے تضاد سے بچے۔ اگر وہ دوسروں کو صداقت، عدل، محبت، تواضع اور حلم کی بات کرے لیکن اس کا اپنا رویہ تنگ نظری، ضد، حسد اور غصے پر مبنی ہو تو اس کی دعوت بے اثر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا چراغ ہو جاتا ہے جو نہ خود روشنی دیتا ہے اور نہ دوسروں کو روشنی پہنچاتا

ہے۔ اسی لیے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "ہمارے شیعہ وہی ہیں جن کے اعمال ہمارے لیے زینت بنیں۔"

مزید یہ کہ ایک مومن کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کی دعوت کا ہدف صرف کسی کو مسلمان بنانا نہیں بلکہ انسان کو انسانیت، مقصدِ زندگی، روحانی بلندی اور قربِ خداوندی کی طرف لے جانا ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام قبول نہ کرے لیکن وہ عدل، صداقت، محبت، روحانیت اور خدمتِ خلق کی طرف مائل ہو جائے، تو بھی وہ اس سفر کا حصہ بن گیا ہے جسے امام کے ظہور کے لیے زمین ہموار کرنے والا کہا جا سکتا ہے۔ گویا ایک مسلمان اپنی دعوت سے ایک ایسا فکری اور اخلاقی ماحول تشکیل دے سکتا ہے جس میں ہر مذہب و ملت کا فرد امام وقت کے عالمی مشن کے لیے خود بخود ایک جزو بن جائے، چاہے وہ امام کے نام سے واقف نہ بھی ہو۔

یہی وہ حکمت ہے جس کے ذریعے ہم کسی پر نظریہ مسلط کیے بغیر، اس کی آزادی اور عقیدے کا احترام کرتے ہوئے، اسے اس راہ پر چلا سکتے ہیں جس کی انتہا خدا کی معرفت، عدل کا قیام اور روحانی زندگی کی تکمیل ہے۔ اسلام، جسے خاتم الادیان کہا گیا، اپنی تعلیمات میں اس قدر جامع اور فطری ہے کہ اگر ہم اسے اخلاص، علم اور کردار کے ذریعے پیش کریں تو نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود گمراہ مسلمان بھی دوبارہ اس روشنی کی طرف پلٹ سکتے ہیں۔

آخرکار، ایک مومن کو ہمیشہ اس بات کا شعور رہنا چاہیے کہ وہ صرف بولنے والا نہیں بلکہ ایک زندہ گواہ ہے، ایک آئینہ ہے، جو اپنے اخلاق سے لوگوں کو اسلام کا چہرہ دکھاتا ہے۔ وہ خاموش بھی ہو تو اس کا سکون، عاجزی، وقت کی پابندی، وعدے کی پاسداری، ہمدردی، رحم، دیانت، شکرگزاری اور معافی کا جذبہ اتنا بامعنی ہوتا ہے کہ لوگ اس کے ذریعے اسلام کو محسوس کرتے ہیں۔ یہی وہ حکمتِ دعوت ہے جو امام کے ظہور کے لیے قلوب کو نرمی، فہم اور خیر کی طرف لاتی ہے۔

حد سے زیادہ سختیاں اور سکون: نفاق کے مددگار

جب انسان کی زندگی میں سختی آتی ہے تو اس کے اندر کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ بعض لوگ صبر، تحمل اور خدا پر توکل کے ذریعے اس سختی کا سامنا کرتے ہیں اور ان کے ایمان میں پختگی آتی ہے، لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر کا نفاق آشکار ہو جاتا ہے۔ وہ خدا سے شکوہ کرتے ہیں، ایمان کو چھوڑ دیتے ہیں یا دنیاوی آسائشوں کے بدلے حق کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح جب انسان نعمت، راحت اور آسانیوں میں ڈوبا ہوتا ہے، تب بھی اس کا ایمان آزمائش میں ہوتا ہے۔ کیونکہ مسلسل سکون، عیش و عشرت، آرام دہ ماحول، اور بغیر رکاوٹ کی زندگی انسان کو غفلت، غرور، خود پسندی، اور غیبی احتیاج کے انکار تک لے جاتی ہے۔

قرآن مجید میں ان دونوں کی مثالیں موجود ہیں۔ جب اہل ایمان پر مصیبت آئی تو ان کا ایمان بڑھا، اور جب نعمتیں مسلسل ملتی رہیں تو اکثر لوگوں نے اسے اپنے کمال، استحقاق یا عقل و علم کی بنا پر قرار دیا، جیسے فرعون نے کہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے علم و حکمت سے حاصل ہوا ہے۔ اسی طرح قارون نے کہا کہ میں نے یہ مال اپنے علم سے حاصل کیا ہے۔ ان کے دلوں میں خدا کی یاد مٹ گئی اور اس کے مقابلے میں خود کو مرکز بنانے لگے۔

نفاق صرف یہ نہیں کہ زبان سے کچھ کہا جائے اور دل میں کچھ اور ہو، بلکہ نفاق یہ بھی ہے کہ انسان اپنے آرام، مفادات اور دنیاوی خوشیوں کے سامنے حق کو نظر انداز کر دے۔ جب

انسان بہت زیادہ آرام دہ زندگی میں ڈوبا ہوتا ہے تو وہ حق کیلئے کھڑا ہونے کا جذبہ کھو دیتا ہے، قربانی دینے کی طاقت نہیں رکھتا، اور راہ خدا میں خرچ کرنے، وقت دینے، یا عمل کرنے میں سستی محسوس کرتا ہے۔ وہ صرف "اپنا سکون" بچانے کی فکر میں مبتلا ہوتا ہے، چاہے باطل کو تقویت کیوں نہ ملے۔ یہی غفلت کا وہ دائرہ ہے جو اسے آہستہ آہستہ منافقین کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فقر اور غنا دونوں آزمائش ہیں، اور بعض اوقات راحت کی آزمائش فقر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے، کیونکہ راحت انسان کو بے نیاز اور مغرور بنا دیتی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "میرے بعد میری امت کو فقر سے نہیں، بلکہ دنیا کی فراوانی سے خوف ہے۔"

عیش و آرام انسان کی روح کو کمزور کر دیتا ہے اگر وہ اس میں خدا کو نہ دیکھے، اور خود کو بندۂ خدا کی بجائے اپنے آرام کا بندہ سمجھنے لگے۔ وہ خدا کی عبادت کو چھوڑ کر اپنی نیند، اپنا کھانا، اپنی تفریح کو مقدم رکھتا ہے۔ یہ سب آہستہ آہستہ اس کے اندر ایک باطنی نفاق پیدا کرتا ہے جو کفر کی طرف لے جا سکتا ہے۔

اہل بیتؑ کی سیرت ہمیں سکھاتی ہے کہ زندگی کی سختی میں بھی توکل اور استقامت ہو، اور نعمتوں میں بھی شکر، عاجزی، اور لوگوں کی خدمت ہو۔ امام سجاد علیہ السلام کی دعاؤں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا سے نعمتوں کے شکر کی بھی دعا کرتے ہیں اور مصیبتوں پر صبر کی بھی۔ وہ اپنے دل کو ہر حال میں خدا کی طرف مائل رکھتے ہیں، تاکہ نہ نعمت انہیں مغرور بنائے اور نہ مصیبت مایوس۔

اسی لیے ایک مؤمن کو چاہیے کہ وہ ہر نعمت کو امتحان سمجھے، ہر آرام کو بھی ایک ذمہ داری سمجھے، اور ہر سختی میں بھی خدا کی مدد تلاش کرے۔ اگر نعمت کے وقت وہ اپنے ارد گرد کے ضرورت مندوں کو بھول جائے، یا سچ بولنے سے ڈر جائے، یا ظلم کے خلاف کھڑے ہونے سے گریز کرے، تو یہ نفاق کی نشانی ہے، چاہے وہ نماز پڑھتا ہو یا روزہ رکھتا ہو۔

پس، سچی بندگی یہ ہے کہ انسان نعمت میں شاکر، راحت میں متواضع، اور سختی میں ثابت قدم رہے۔ یہی راستہ ہے خلوص اور نجات کا، اور یہی طریقہ ہے کہ انسان خود کو منافقانہ رویے سے بچا سکے اور واقعی بندۂ خدا بن سکے۔

قرآن مجید میں نفاق کی کئی شکلیں بیان ہوئی ہیں اور ان میں مختلف طبقات کی نمائندگی بھی کی گئی ہے، جن میں دیہاتی (اعراب) اور اشرافیہ (سردار، مالدار، اثر ورسوخ والے) شامل ہیں۔ یہ دونوں طبقات اپنی مخصوص نفسیاتی کیفیت اور سماجی پس منظر کی بنا پر مختلف انداز سے نفاق کا شکار ہوتے ہیں، اور قرآن ان کے رویّوں کو واضح کرتا ہے تاکہ انسان ہر طبقے کی آزمائش کو پہچان سکے اور اپنے دل کو اس باطنی بیماری سے محفوظ رکھے۔

دیہاتیوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ '': الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ (''التوبہ: 97)۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بعض دیہاتی (اعراب) کفر اور نفاق میں سخت ہوتے ہیں اور ان کے اندر دینی احکام کی معرفت اور فہم کی کمی ہوتی ہے۔ ان کے دل میں ایمان کی گہرائی کم ہوتی ہے کیونکہ ان کا رجحان دنیاوی فائدے، مادی مفادات اور سطحی تعلقات کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دین کے روحانی پہلو کو نہیں سمجھتے بلکہ ظاہری معاملات اور وقتی فائدے ان کے ایمان کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ وہ دین کے کسی نفع بخش پہلو کی امید میں اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور جیسے ہی وہ فائدہ کم ہوتا نظر آتا ہے یا تھوڑا سا نقصان محسوس ہوتا ہے، تو ان کا دل بدل جاتا ہے۔

جبکہ دوسری طرف، اشرافیہ اور سرداروں کے نفاق کی شکل کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ بسا اوقات علم رکھتے ہیں، دینی زبان بولتے ہیں، عبادات میں شرکت کرتے ہیں، مگر ان کا دل دنیاوی طاقت، عزت، قیادت اور مفادات کا اسیر ہوتا ہے۔ ان کے اندر نفاق کا ظہور اکثر اس وقت ہوتا ہے جب دین ان کے مفادات کے خلاف بات کرتا ہے، یا جب دین کسی کمزور کو اٹھا کر ان کے برابر کھڑا کرتا ہے۔ فرعون، قارون، ابوجہل، ابولہب جیسے کردار اسی نفاق کی علامت ہیں کہ وہ حق کو پہچاننے کے باوجود، اپنے تکبر، برتری اور دنیاوی اقتدار کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں۔

ان دونوں طبقات میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ ان کا دین سے تعلق وقتی، خودغرضانہ یا سطحی ہوتا ہے۔ دیہاتی نفاق کی جڑ جہالت، دینی فہم کی کمی اور دنیا پرستی ہوتی ہے، جبکہ اشرافیہ نفاق کی بنیاد تکبر، اقتدار پرستی، اور برتری کا جنون ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں ایمان دل میں گہرائی تک نہیں اترتا، بلکہ صرف زبان، رسم، یا وقتی مفادات تک محدود ہوتا ہے۔

نفاق کی ایک مثال سورہ منافقون میں دی گئی ہے، جہاں اشرافیہ کی زبانی کہا گیا“ :لَئِن رَّجَعۡنَا اِلَی الۡمَدِیۡنَۃِ لَیُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡہَا الۡاَذَلَّ ”۔ یعنی اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت والا ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔ یہاں وہ اپنے آپ کو "اعزّ" سمجھتے ہیں اور پیغمبر کو "اذلّ"۔

یہ سوچ واضح کرتی ہے کہ ان کا پیمانہ عزت وذلت کا دنیاوی مقام اور سوسائٹی میں اثرورسوخ تھا، نہ کہ تقویٰ اور سچائی۔

چنانچہ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ نفاق کوئی مخصوص لباس، شکل یا دعوے سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ دل کی ایک بیماری ہے جو مختلف طبقات میں مختلف انداز سے پروان چڑھتی ہے۔ کبھی جاہل دیہاتی کی صورت میں، اور کبھی پڑھے لکھے سردار کی صورت میں۔ اور اگر انسان ان نشانیوں کو نہ پہچانے، تو وہ خود بھی اسی راستے پر چل پڑتا ہے، چاہے وہ بظاہر کتنا ہی نمازی، روزہ دار یا دینی خدمت گزار کیوں نہ ہو۔

اسی لیے نفاق سے بچنے کیلئے ہر فرد کو اپنے نفس کا محاسبہ کرنا ضروری ہے۔ قرآن کی روشنی میں ان کرداروں کو دیکھ کر ہمیں یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ ہم خود کس رویے کے قریب جا رہے ہیں، اور کیسے اپنی نیت، اعمال اور فکر کو خالص اللہ کے لئے بنا کر اس آزمائش سے بچ سکتے ہیں۔

سیکھنے میں ذہن کا موثر پہلو

انسانی ذہن روزمرہ زندگی میں محض ایک رخ پر نہیں چلتا بلکہ مسلسل مختلف ابعاد میں سفر کرتا رہتا ہے۔ یہ ابعاد دراصل وہ مختلف ذہنی، جسمانی، جذباتی، سماجی اور روحانی میدان ہیں جہاں انسان کا شعور اور تحت الشعور متحرک رہتا ہے، اور ان کے درمیان مسلسل ربط و ردعمل ہوتا ہے۔ ان ابعاد کو اگر بہتر طور پر سمجھا جائے تو وہ ہمارے سیکھنے، سمجھنے، ردعمل دینے اور فیصلے کرنے کے طریقوں کو زیادہ گہرائی سے واضح کرسکتے ہیں۔

سب سے پہلے شعوری بُعد کا تذکرہ ضروری ہے، جو ہمارے دن بھر کے ہوش مند فیصلوں، گفتگو، اور ردعمل کا مرکز ہوتا ہے۔ انسان جب سوچتا ہے، کسی بات کو پرکھتا ہے، یا کسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسی بُعد میں سرگرم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تحت الشعوری بُعد ایک خاموش مگر طاقتور دائرہ ہے، جس میں ہماری پرانی عادات، یادداشتیں، تجربات اور غیر ارادی رجحانات محفوظ ہوتے ہیں۔ اکثر ہماری روزمرہ کی حرکات وسکنات اسی لاشعوری نظام کے زیر اثر انجام پاتی ہیں۔

جذباتی بُعد بھی انسانی ذہن کا ایک اہم گوشہ ہے، جہاں خوشی، غم، خوف، حسد، محبت اور دیگر احساسات پروان چڑھتے ہیں۔ یہ جذبات بعض اوقات عقل پر حاوی ہو کر انسان کے فیصلوں کو بدل دیتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی بُعد وہ ہے جس میں انسان کی نیند، خوراک،

تھکن، جسمانی صحت اور توانائی شامل ہوتی ہے۔ اگر جسمانی حالت خراب ہو تو اس کا اثر ذہنی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔

سماجی بُعد میں انسان دوسروں کے ساتھ تعلقات، معاشرتی توقعات، عزتِ نفس، اور قبولیت کی خواہش کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ بُعد اکثر ہماری سوچ، طرزِ عمل، اور یہاں تک کہ ہمارے تعلیمی و پیشہ ورانہ فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اہم اور گہرائی رکھنے والا بُعد روحانی بُعد ہے، جہاں انسان اپنے وجود کے مقصد، اللہ سے تعلق، خیر و شر کے شعور، عبادات، اور سکونِ قلب کو تلاش کرتا ہے۔ روحانی بُعد ہی انسان کو اپنے علم، تجربے اور زندگی کے فیصلوں کو اعلیٰ اقدار کے ساتھ جوڑنے کا شعور عطا کرتا ہے۔ ان سب کے ساتھ ایک اور اہم بُعد تخیّلی و تخلیقی بُعد بھی ہے جو انسان کو خواب دیکھنے، تخلیق کرنے، اور نئے امکانات سوچنے کی صلاحیت دیتا ہے۔

جب سوال یہ اٹھتا ہے کہ تعلیم یا سیکھنے کے عمل میں کون سا بُعد سب سے زیادہ دیرپا اثر ڈال سکتا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ تمام ابعاد کا اپنا کردار ہے، لیکن اگر کوئی بُعد سب سے زیادہ گہرائی، تسلسل اور اثر پذیری پیدا کر سکتا ہے تو وہ روحانی- عقلی بُعد ہے۔ یہ وہ بُعد ہے جو علم کو محض یادداشت یا ڈگری کی حد تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے زندگی کا مقصد، اصلاحِ نفس اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

روحانی- عقلی بُعد اس وقت فعال ہوتا ہے جب انسان علم کو اللہ کی معرفت، حق کی تلاش، اور اپنے کردار کی تعمیر کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اگر سیکھنے کی بنیاد نیت کی صفائی پر ہو، جیسا کہ

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے"، تو وہ علم محض معلومات نہیں بلکہ ہدایت بن کر دل میں اترتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی بار بار انسان کو عقل سے کام لینے، غور و فکر کرنے اور نصیحت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ دیرپا سیکھنے کی بنیاد شعور، تدبّر اور تذکّر ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "علم وہ ہے جو عمل کے ساتھ ہو، ورنہ وہ صرف بوجھ ہے"۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ علم جب عمل کے ساتھ جُڑتا ہے تو وہ شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے اور زندگی میں تبدیلی لاتا ہے۔ سیکھنے کا عمل اگر صرف امتحان پاس کرنے یا سوسائٹی میں مقام حاصل کرنے کے لیے ہو تو اس کی جڑیں کمزور ہوتی ہیں۔ لیکن جب یہی سیکھنا ایک بلند مقصد، یعنی خدمتِ خلق، اصلاحِ معاشرہ، یا اللہ کی رضا کے لیے ہو تو اس کی بنیادیں دل، عقل اور روح میں اتر جاتی ہیں، اور پھر وہ دیرپا علم بن جاتا ہے جو انسان کی سوچ، کردار اور مستقبل پر گہرے اثرات ڈالتا ہے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ذہن مسلسل مختلف ابعاد میں حرکت کرتا رہتا ہے، لیکن اگر ان تمام ابعاد کو ہم آہنگ کر کے روحانی و عقلی مقصد سے جوڑ دیا جائے تو سیکھنے کا عمل نہ صرف موثر بلکہ دیرپا اور نتیجہ خیز بن جاتا ہے۔ تعلیم جب مقصدِ حیات سے جُڑ جائے تو وہ انسان کو بدل دیتی ہے، اور یہی وہ علم ہے جو قرآن اسے "علمِ نافع" کہتا ہے—وہ علم جو نفع بخش ہو، عمل میں آئے، اور انسان کو اپنے رب کے قریب کرے۔

کرنسی اور ولی خدا کی حاکمیت

"خدا کی دولت (God's Money) " اور "نقلی دولت (Fake Money) " دو متضاد مالیاتی تصورات ہیں جو معیشت، اخلاقیات اور روحانیت کے گہرے پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ خدا کی دولت (God's Money) وہ دولت ہے جو فطرت، خلوص اور الٰہی اصولوں کے مطابق ہے۔ یہ وہ دولت ہے جسے اللہ نے زمین پر انسانوں کے لیے رزق، نعمت اور امانت کے طور پر پیدا کیا ہے، جیسے سونا، چاندی، زراعتی اجناس، جانور، اور زمین کے قدرتی وسائل۔ ان اشیاء کی اپنی داخلی قدر ہوتی ہے (Intrinsic Value) جو انسان کی مرضی یا طاقت سے وابستہ نہیں بلکہ قدرتی حقیقت پر مبنی ہے۔ سونا اور چاندی صدیوں سے کرنسی (Currency) کے طور پر استعمال ہوتے آئے ہیں، کیونکہ ان کی قدر وقت کے ساتھ کم نہیں ہوتی۔ اسلامی شریعت نے بھی ان کو معیارِ زکات، دیت، اور مہر یہ جیسی عبادات اور معاملات میں بنیاد بنایا ہے، کیونکہ ان کی قدر شفاف، مستقل اور فطری ہے۔

دوسری طرف نقلی دولت (Fake Money) وہ دولت ہے جو انسانوں نے اپنی خواہشات، مالیاتی مفادات، اور بینکنگ نظام (Banking System) کے تحت تخلیق کی ہے۔ یہ دولت عموما کاغذی (Fiat Money) یا ڈیجیٹل (Digital Money) شکل میں ہوتی ہے، جس کی کوئی داخلی مادی قدر (Intrinsic Material Value) نہیں ہوتی۔ اس کی قیمت صرف لوگوں کے اعتماد (Trust) اور حکومت کی طاقت

(Government Authority) پر قائم ہوتی ہے۔ مرکزی بینک (Central Banks) جب چاہیں اسے پرنٹ یا تخلیق کر سکتے ہیں، بغیر کسی حقیقی اثاثے (Real Asset) کے پیچھے ہونے کے۔ اس نظام میں افراطِ زر (Inflation)، سودی معاہدے (Interest-Based Agreements)، اور مالیاتی استحصال (Financial Exploitation) عام ہو جاتے ہیں، جس سے معاشرے میں طبقاتی تفریق، معاشی عدم توازن، اور غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔

نقلی دولت (Fake Money) کا نظام سود (Riba or Interest) سے جڑا ہوا ہے، جو قرآن و سنت کی روشنی میں سختی سے حرام ہے۔ سودی نظام، زر کی غیر حقیقی تخلیق (Artificial Money Creation)، اور بازار کے استحصال پر مبنی مالیاتی ڈھانچہ نہ صرف دولت کو چند ہاتھوں میں محدود کرتا ہے بلکہ روحانی زوال، اخلاقی پستی اور اجتماعی بے چینی کو جنم دیتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کی دولت (God’s Money)، جیسے کہ سونے اور چاندی پر مبنی کرنسی، اپنی قدرتی کمیابی (Scarcity) اور حقیقت پر مبنی قدر (Value-Based Worth) کی وجہ سے افراطِ زر کو روکتی ہے، سود کے نظام کو کمزور کرتی ہے، اور عدل، مساوات اور حقیقی معاشی توازن کو فروغ دیتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق دولت صرف مادی ملکیت نہیں بلکہ ایک امانت (Trust) ہے جس کا حساب قیامت کے دن لیا جائے گا۔ چونکہ نقلی دولت (Fake Money) فریب، خواہشات اور غیر حقیقی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ کی جانے والی لین دین (Transactions) بھی اکثر غیر اخلاقی اور ظلم پر مبنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورة

التوبہ میں سود خوروں سے جنگ کا اعلان کیا، کیونکہ سودی معیشت اور نقلی دولت کا پھیلاؤ انسان کی روح، سچائی، اور سماجی انصاف کو تباہ کر دیتا ہے۔

اس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی دولت (God’s Money) فطرت، شریعت اور اخلاقی معیشت (Moral Economy) کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے، جبکہ نقلی دولت (Fake Money) غیر یقینی، خود غرضی اور استحصال پر مبنی ہے۔ ایک نظام انسان کو خدا کے قرب کی طرف لے جاتا ہے، جبکہ دوسرا اسے دنیا پرستی، اضطراب اور ظلم کی طرف دھکیلتا ہے۔ جس قوم یا فرد کا مالی نظام خدا کی دولت پر مبنی ہو، وہ خیر، عدل اور اطمینان کے قریب ہوتا ہے، اور جو نقلی دولت پر تکیہ کرتا ہے وہ بالآخر بحران، بگاڑ اور بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔

کرنسی کی ساخت پر بحث سے زیادہ اہم اصل نکتہ یہی ہے کہ مالیاتی نظام (نظامِ زر) درحقیقت ایک آلہ (Tool) ہے، جو اپنی اصل میں نہ نیک ہے نہ بد، بلکہ اس کی نوعیت اور نتائج کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ کس کے کنٹرول میں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ سونا، چاندی یا کرنسی اچھی یا بری ہے، تو ہمیں اس سے ایک قدم آگے جا کر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ یہ سب کس سیاسی نظم (Political System) کے تحت چل رہے ہیں۔ جب تک سیاسی رہبری (Political Leadership) صالح، دیانت دار، اور خدا ترس ہو، اور وہ عوام کی بھلائی کو مقدم رکھتی ہو، تب تک وہ چاہے کاغذی کرنسی ہو یا ڈیجیٹل دولت، وہ ایک منصفانہ نظام کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ایسی قیادت مالیاتی پالیسیوں کو عدل، شفافیت، اور

معاشرتی بہبود کے اصولوں پر استوار کرتی ہے، اور تمام مالیاتی ادارے، جیسے مرکزی بینک (Central Banks) یا ٹیکس کے نظام، عوامی مفاد میں استعمال ہوتے ہیں۔

لیکن جب یہی قیادت خود غرض، استعمار زدہ، سرمایہ داروں کے زیر اثر یا لوٹ مار پر مبنی ہو، تو پھر نہ صرف کاغذی کرنسی بلکہ پورا معاشی ڈھانچہ استحصالی، ظالمانہ اور کرپٹ ہو جاتا ہے۔ ایسے نظام میں کرنسی کی چھپائی کا عمل، سودی پالیسیوں کی تشکیل، سرمایہ کی تقسیم، اور بجٹ سازی سب کچھ مخصوص طبقوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے کیا جاتا ہے، اور عوامی اکثریت مہنگائی، غربت، قرض، اور بے چینی کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر میں قیادت کی اصلاح کو بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے، کیونکہ تمام معاشی، سماجی، تعلیمی، ثقافتی اور اخلاقی نظام دراصل سیاسی رہنمائی کے زیرِ اثر ہی پروان چڑھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن، نہج البلاغہ، اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں بار بار عادل حکمران، صالح امام، اور فاسق و فاجر قیادت کے خطرات پر زور دیا گیا ہے۔ جب قیادت صالح ہو، تو وہ نہ صرف مالیاتی شفافیت قائم کرتی ہے بلکہ عوام کو بھی اخلاقی و روحانی طور پر ترقی دیتی ہے۔ لیکن جب یہی منصب لالچی، مفاد پرست اور استعمار کے غلام عناصر کے ہاتھ میں آجائے، تو پھر معاشرہ ظاہری طور پر ترقی یافتہ ہو کر بھی روحانی طور پر مفلس ہو جاتا ہے۔

لہٰذا پیغام یہ ہے کہ کرنسی کی شکل پر بحث کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس کرنسی کا نظام کس کے اختیار میں ہے۔ ہر سماجی نظام درحقیقت سیاسی نظام کا نتیجہ (Outcome) ہوتا ہے۔ جب سیاست صالح ہو تو معیشت بھی عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہے، اور جب سیاست فاسد ہو تو معیشت بھی ظالمانہ اور نابرابری سے بھر جاتی ہے۔ اسلام کا

انقلابی پیغام بھی یہی ہے کہ قیادت، معیشت، اور سماجی ڈھانچے کو اللہ کی ہدایت کے تابع کر کے ایک پاکیزہ، منصف، اور پائیدار نظام قائم کیا جائے۔

کچھ دانشور سوال کرتے ہیں کہ آخر جب سونا/چاندی Commodity Money تھی تو Hyperinflation کیوں نہیں ہوتی تھی اور جب سے Fiat Money آئی ہے تو Inflation, uncontrolled کیوں ہو جاتی ہے؟

اس کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جب سونا/چاندی کو بطور اجناس پر مبنی کرنسی (Commodity Money) استعمال کیا جاتا تھا، تو افراطِ زر (Inflation)، خصوصاً شدید افراطِ زر (Hyperinflation) کا امکان بہت محدود ہوتا تھا، کیونکہ سونے اور چاندی کی مقدار قدرتی اور محدود (Naturally Scarce) ہوتی ہے، اور انہیں مصنوعی طریقے سے اچانک بڑی مقدار میں پیدا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

سونا اور چاندی زمین سے نکالنے میں وقت، محنت اور وسائل درکار ہوتے ہیں۔ ان کی فراہمی کا ایک فطری دائرہ ہوتا ہے، جو دولت کی سپلائی کو مقداراً محدود رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے جب معیشت ان دھاتوں پر منحصر تھی، تو مارکیٹ میں گردش کرنے والی کرنسی کی مقدار حقیقی اشیاء کی مقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی تھی، جس کی وجہ سے قیمتیں مستحکم (Stable Prices) رہتی تھیں۔

اس کے برعکس جب سے فیئٹ کرنسی (Fiat Money) کا نظام آیا ہے، جو کہ کاغذی یا ڈیجیٹل کرنسی پر مبنی ہے جس کی کوئی داخلی قدر (Intrinsic Value) نہیں، تو دولت کی

تخلیق انسانی ارادے کے تابع ہو گئی ہے، خاص طور پر حکومتوں اور مرکزی بینکوں کے۔ اب چونکہ فیئٹ کرنسی چھاپنے کے لیے نہ سونا چاہیے، نہ چاندی، نہ زمین سے کچھ نکالنے کی ضرورت، اس لیے حکومتیں اپنی مرضی سے کاغذی یا ڈیجیٹل دولت پیدا کرتی رہتی ہیں۔

جب دولت کی مقدار بڑھتی ہے لیکن اشیاء و خدمات کی مقدار اتنی نہیں بڑھتی، تو قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے، یعنی افراط زر۔ اور جب یہ دولت غیر ذمہ دارانہ طریقے سے، سیاسی مفادات یا قرضوں کے دباؤ کے تحت بہت زیادہ مقدار میں چھاپی جاتی ہے، تو شدید افراط زر یا Hyperinflation پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ وینزویلا، زمبابوے یا جرمنی (1920s) جیسے ممالک میں ہوا۔

فیئٹ منی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ یہ اخلاقی اور فطری نظم سے آزاد ہوتی ہے۔ نہ اس کے پیچھے کوئی ٹھوس اثاثہ ہوتا ہے، نہ اس کے اجراء پر الٰہی یا شرعی ضابطے۔ اس کا پورا نظام اعتماد (Trust) پر کھڑا ہوتا ہے، جو جب بھی ٹوٹے تو پورا مالیاتی نظام لرز جاتا ہے۔

اسلامی معیشت اس تصور کو نہیں مانتی کہ دولت مصنوعی ہو یا بغیر کسی محنت و قدر کے پیدا کی جا سکے۔ اسی لیے اسلام میں سونا و چاندی کو "ثمن حقیقی (Real Money) " کہا گیا ہے، کیونکہ ان میں محنت، فطری کمیابی، اور قدرتی قدر موجود ہے، جو انہیں استحکام، عدل اور شفافیت کا ذریعہ بناتی ہے۔

لہٰذا، سونا/چاندی کے دور میں Hyperinflation نہ ہونے کی بنیادی وجہ ان کی فطری کمیابی اور محنت طلب پیداوار ہے، جبکہ فیئٹ منی میں مصنوعی تخلیق کی آزادی اور بے لگامی

کی وجہ سے یہ مسئلہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ فرق نہ صرف معیشت بلکہ معاشرت، اخلاق اور سیاسی خود مختاری پر بھی گہرے اثرات ڈالتا ہے۔

جب ہم افراطِ زر (Inflation) اور شدید افراطِ زر (Hyperinflation) کے مسئلے کو عادل، دیانت دار، صالح، متقی، پرہیز گار اور زاہد قیادت (Righteous and God-fearing Leadership) کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مالیاتی نظام کی کامیابی یا بربادی صرف کرنسی کی نوعیت پر نہیں بلکہ اس قیادت کے کردار پر منحصر ہوتی ہے جو اس نظام کو چلاتی ہے۔

جب قیادت متقی و صالح ہوتی ہے، یعنی وہ خدا سے ڈرنے والی، آخرت پر یقین رکھنے والی، عوام کی خیر خواہ، اور دنیا کے فریب سے زاہدانہ دامن بچانے والی ہو، تو وہ کبھی بھی دولت کو مصنوعی طریقے سے پیدا نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ فیئٹ کرنسی (کاغذی یا ڈیجیٹل پیسہ) اگرچہ وقتی سہولت کا ذریعہ بن سکتی ہے، مگر اگر اس کا اجراء بے قابو ہو تو وہ معاشرے کو فقر، محرومی، اور طبقاتی خلیج میں دھکیل سکتی ہے، جس کا مؤاخذہ صرف دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی ہو گا۔ چنانچہ ایسی قیادت مالیاتی پالیسیوں میں احتیاط، توازن اور عدل کو اپنا اصول بناتی ہے۔

اس کے برعکس جب قیادت لالچی، مفاد پرست، اور دنیا پرستی میں غرق ہو، تو وہ کرنسی کو ایک کھیل سمجھ کر استعمال کرتی ہے۔ وہ مالیاتی اداروں کو صرف اپنے سیاسی مفادات یا مخصوص طبقوں کو نوازنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ایسے میں فیئٹ منی (Fiat Money) کی بے لگام چھپائی شروع ہو جاتی ہے، جس سے قیمتیں بڑھتی ہیں، عوام کی قوتِ

خرید گھٹتی ہے، اور غریب مزید غریب ہوتا جاتا ہے۔ پھر قرض، سود، اور افراطِ زر کا گھن چکر معاشرے کو نگل لیتا ہے۔

زاہد اور پرہیزگار قیادت اس بات سے بخوبی واقف ہوتی ہے کہ دولت کی حیثیت صرف ایک وسیلہ ہے، نہ کہ ہدف۔ وہ معیشت کو ایک امانت سمجھ کر چلاتی ہے، اس پر کاروباری طبقوں یا مغربی مالیاتی اداروں کا تسلط قبول نہیں کرتی، اور کوشش کرتی ہے کہ نظام زر کو حقیقی اشیاء پر مبنی رکھے — جیسا کہ سونا و چاندی — تاکہ دولت کی پشت پر کوئی ٹھوس قدر ہو۔ کیونکہ حقیقی مال و دولت وہی ہوتی ہے جو کسی انسانی محنت، قدرتی کمیابی، اور شرعی اصول پر مبنی ہو۔

اس لیے سونے چاندی کے دور میں، جب قیادت بھی متقی اور دیانت دار ہوتی تھی، تو دولت کی تخلیق محدود، قدرتی، اور متوازن ہوتی تھی، جس کی وجہ سے افراطِ زر نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ لیکن جب دنیا نے خدا سے بے نیاز ہو کر فیئیٹ کرنسی کو اختیار کیا، اور قیادت غیر ذمہ دار، دنیا پرست، اور فاسق لوگوں کے ہاتھ آئی، تو وہ کرنسی کو اخلاقی، شرعی یا انسانی حدبندیوں سے آزاد سمجھ کر استعمال کرنے لگے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے معیشت کا انحطاط شروع ہوتا ہے۔

پس اگر آج بھی قیادت متقی، عادل اور دیانت دار ہو جائے، تو چاہے نظام زر میں سونا ہو یا کاغذ، ڈیجیٹل دولت ہو یا اجناس، وہ اللہ کے خوف کے ساتھ اسے ایسا منظم کرے گی کہ نہ فقط افراطِ زر سے بچا جا سکے گا، بلکہ ایک منصف، بابرکت اور پائیدار معیشت قائم ہو گی، جس

میں ہر انسان کو اس کا حق وقت پر، عدل کے ساتھ اور عزت کے ساتھ ملے گا۔ یہی اسلامی معیشت کا اصل ہدف ہے۔

دانشور حضرات ایک صلاح اور بھی دیتے ہیں کہ دراصل اصل کرنسی، نہ ہی کسی ریاست (لیڈر) اور نہ ہی کسی بینک کی speculations پہ پیدا ہونے والی نہیں ہونی چاہیے۔ اصل کرنسی، کسی معیشت میں پیدا کردہ پراڈکٹس یا سروسز کی قیمت کے برابر ہونی چاہیے؛ نہ کہ AC رومز میں بیٹھ کر Expansionary monetary policy اور Contractionary monetary policy کے فارمولوں سے طے ہونی چاہیے۔

یہ بات ایک نہایت حکیمانہ اور گہرے شعور پر مبنی ہے۔ اس میں دراصل ایک بنیادی سوال پوشیدہ ہے: کیا موجودہ انسان، بغیر صالح و الٰہی رہبری کے، ایک عادل، شفاف اور حقیقی معیشت قائم کر سکتا ہے؟ یا یہ اس وقت ہی ممکن ہو گا جب زمین پر ولیِ خدا کی حکومت قائم ہو چکی ہو اور انسانیت اُس روحانی تربیت سے گزر چکی ہو جو اسے لالچ، خود پرستی، اور مادہ پرستی سے پاک کر دے؟

اس کا جواب دو سطحوں پر سمجھنا ضروری ہے:

پہلا پہلو عقلی اور نظریاتی ہے: کرنسی کا وہ تصور جو اوپر پیش کیا—یعنی کہ اس کی تخلیق کا حقیقی اشیاء و خدمات سے وابستہ ہونا—ایک عقلی، عادل، اور معاشی طور پر پائیدار نظریہ ہے۔ دنیا کی موجودہ معاشی تباہی، افراطِ زر، طبقاتی خلیج، اور مالی غلامی اسی فاسد نظام کا نتیجہ ہے جو کرنسی کو محض قیاس، مفروضے، اور مستقبل کی امید پر پیدا کرتا ہے۔ یہ طرزِ عمل

صرف چند لوگوں کو فائدہ دیتا ہے اور باقی انسانیت کو مسلسل استحصال میں رکھتا ہے۔ عقلی اور اخلاقی بنیاد پر یہی اصول درست ہے کہ کرنسی صرف اسی مقدار میں ہونی چاہیے جتنی مقدار میں پیداوار یا خدمت موجود ہو۔

لیکن دوسرا پہلو عملی اور اجتماعی نفسیات کا ہے: کیا موجودہ عالمی معاشرہ، جس کی اکثریت ابھی تک مادی لالچ، مغربی ثقافتی غلبے، اخلاقی بے حسی، اور خودغرضی کی بیماریوں میں گرفتار ہے، اس اصول کو نافذ اور برقرار رکھ سکتا ہے؟ بدقسمتی سے نہیں۔ کیونکہ موجودہ سیاسی و مالیاتی قیادت، نہ صرف ناعادل ہے بلکہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے وہ ہر قسم کی مالیاتی ہیراپھیری، کرپشن، اور فریب کو جائز سمجھتی ہے۔ عوام کی ایک بڑی اکثریت بھی، مسلسل غیر الہامی نظاموں میں تربیت پا کر، اخلاقی اعتبار سے اتنی پختہ نہیں کہ وہ ایسے نظم کو برقرار رکھ سکے جو سچائی، توازن، اور قربانی پر مبنی ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انتظارِ امام (عج) کی حقیقت اور اس کی ضرورت آشکار ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: لیقوم الناس بالقسط — "تاکہ لوگ خود عدل پر قائم ہو سکیں"۔ امامِ معصوم (ع) کا ظہور، دراصل ایک ایسا مرحلہ ہو گا جہاں انسان کی اجتماعی عقل، تربیت، اور تزکیہ اس درجہ پر پہنچ چکے ہوں گے کہ وہ عدل کو صرف ایک نظریہ نہیں، بلکہ عملی ضابطہ حیات بنا سکیں گے۔ اُس وقت کرنسی کی تخلیق بھی امانت ہو گی، تجارت عبادت ہو گی، اور معیشت کا مقصد دولت کا ارتکاز نہیں بلکہ نعمت کا عدل سے بٹوارا ہو گا۔

گویا جس نظام کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں، وہ ممکن تو ہے، بلکہ مطلوب ہے، مگر اُس کے لیے انسانیت کا تربیت یافتہ ہونا شرط ہے۔ اور ایسی تربیت صرف صالح قیادت، تقویٰ پر مبنی

معاشرت، اور الٰہی قانون کے نفاذ سے ہی ممکن ہے۔ جب تک دنیا لالچ، خود غرضی، اور مفاد پرستی میں غرق ہے، اُس وقت تک "حقیقی کرنسی" کا نظام صرف کتابوں، مخلص ذہنوں، یا عدل پرست دلوں میں زندہ رہ سکتا ہے — لیکن زمین پر اُس کا ظہور امامِ زمانہ عجل اللہ فرجہ کی عالمی حکومت میں ہی مکمل صورت اختیار کرے گا۔

لہٰذا، یہ فکر نہ صرف درست ہے بلکہ ایک عالمی الٰہی نظام کا پیش خیمہ بھی ہے۔ یہ ایسی گفتگو ہے جو "انتظارِ فرج" کو صرف ایک عقیدہ نہیں بلکہ ایک عملی جدوجہد میں بدلتی ہے، جس میں ہر انسان اپنی اصلاح سے لے کر نظامِ معیشت تک، سب کچھ عدل کے لیے قربان کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

دین کو کامیابی کی تدبیر سمجھنا غلطی ہے

اسلامی احکام و افکار محض وقتی کامیابی یا دنیاوی نتائج کے حصول کی چالاکیاں یا حکمتِ عملی (ٹیکٹیکس Tactics) نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک جامع نظامِ حیات کا حصہ ہیں جو انسان کی تخلیق، اس کے مقصدِ وجود، اس کی روحانی ارتقاء، اور اس کے اخروی انجام سے مربوط ہیں۔ جب ہم دین اسلام کے احکامات کو محض کامیابی کے حصول کی تراکیب سمجھتے ہیں تو ہم ان کی روحانی و ایمانی گہرائی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرزِ فکر سے دین کا جوہر ختم ہو جاتا ہے اور وہ صرف ایک مادی کامیابی کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات، جیسے نماز، روزہ، صدقہ، عفت، عدل، تواضع، صبر، ذکر، توکل، اور اطاعتِ الٰہی، اپنی ذات میں عبادت ہیں، اور ان کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ ان افکار و اعمال کا اثر یقیناً دنیاوی زندگی میں بھی ظاہر ہوتا ہے، مگر ان کی اصل بنیاد اخلاص، معرفت، اور عبودیت پر ہے۔ جب کوئی شخص صدقِ دل سے اللہ کے احکام پر عمل کرتا ہے تو وہ اپنے اندر نورانیت، تقویٰ، اور قربِ الٰہی کی کیفیت پیدا کرتا ہے، جو اس کے اعمال کو برکت بخشتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ دین کے مطابق زندگی گزارنے سے دنیا میں بھی سکون، اعتماد، اور بعض اوقات مادی کامیابی حاصل ہوتی ہے، مگر ان تعلیمات کو صرف اس مقصد کے لیے اپنانا، گویا کہ ان کے ساتھ سودا کرنا، ایک گمراہ کن زاویہ نظر ہے۔

مزید یہ کہ اگر اسلامی احکام کو محض کامیابی کے ذرائع سمجھا جائے تو جیسے ہی انسان کو وقتی طور پر ناکامی کا سامنا ہوتا ہے، وہ ان احکامات سے بدظن ہو سکتا ہے۔ مثلاً، اگر کوئی شخص صرف اس لیے سچ بولے کہ لوگ اس پر اعتماد کریں، اور اگر وہ وقتی طور پر لوگوں کے شک و بداعتمادی کا شکار ہو جائے تو وہ سچائی کو ترک کر دے گا۔ لیکن اگر وہ سچ اس لیے بولے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور آخرت میں اس کی جزا ہے، تو وہ ہر حال میں سچ بولے گا، خواہ دنیا اس کے خلاف ہو جائے۔

دین کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اللہ کے احکام کو دل و جان سے تسلیم کریں، چاہے ان کے نتائج فوری طور پر نظر نہ آئیں۔ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت ہمارے لیے اس کا بہترین نمونہ ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے قربانی دی، لیکن بظاہر دنیاوی کامیابی حاصل نہ کی، مگر حقیقت میں وہ دین کی بقا اور انسانیت کی نجات کا راستہ کھول گئے۔ اگر امام علیہ السلام دنیاوی کامیابی کو معیار بناتے تو شاید جنگ ہی نہ کرتے، بیعت کر لیتے، مگر اُن کا ہر عمل اللہ کے حکم، رضا، اور حق کے قیام کے لیے تھا۔

پس اسلامی افکار و احکام کو ٹیکٹیکس کے بجائے اصولِ حیات، دستورِ روح، اور تعلقِ عبد و معبود کی علامت کے طور پر اپنانا چاہیے۔ جو لوگ ان تعلیمات کو صرف مادی مفاد کے لیے اپناتے ہیں، وہ دین کی حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں، اور جب مفاد نہ ملے تو وہ دینی احکام کو بوجھ اور ناکام حکمت عملی سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایمان، نیت کی خالصی، اور اخروی شعور دین کی صحیح تفہیم کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلامی احکام کا سچا اثر تبھی ظاہر ہوتا ہے جب وہ انسان کی داخلی تبدیلی کا سبب بنیں، اور وہ دنیا کو عبوری مقام سمجھ کر اللہ کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھے۔ اس زاویۂ نظر سے اسلامی افکار صرف کامیابی کی تدبیر نہیں، بلکہ نجات کا ذریعہ اور رضائے الٰہی کا راستہ ہیں۔

پسپائی کے وقت دشمن کی چال

صفین کے میدان میں پیش آنے والا واقعۂ تحکیم دراصل اس نفسیاتی حربے کی عملی مثال ہے جس کا استعمال دشمن اس وقت کرتا ہے جب وہ عسکری میدان میں شکست کے قریب ہو۔ جب امیر المؤمنین حضرت علیؑ کی قیادت میں اہلِ حق کی افواج کامیابی کے دہانے پر پہنچ چکی تھیں اور شامی لشکر کی شکست یقینی نظر آ رہی تھی، تب ہی دشمن نے ایک نہایت چالاک اور فریب دہ حکمتِ عملی اختیار کی۔ اسے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ میدانِ جنگ میں اب اس کے لیے کوئی راہِ فرار نہیں رہی، چنانچہ اس نے براہِ راست تصادم کے بجائے نفسیاتی اور فکری میدان میں ایک نیا کھیل شروع کیا۔

معاویہ اور اس کے مشیروں نے قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے ایک ظاہری دینی اور اخلاقی اپیل کے ذریعے اہلِ عراق کی صفوں میں اضطراب پیدا کیا۔ اس نے بظاہر وہی زبان اختیار کی جو اہلِ حق کی تھی: ”آؤ ہم قرآن کے مطابق فیصلہ کریں، ہم خدا کی کتاب کی طرف بلاتے ہیں۔“ یہ آواز درحقیقت کسی دینی خلوص کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی چال تھی جس کا مقصد صرف وقتی شکست سے بچنا، اندرونی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا، اور دشمن کے دل و دماغ میں شک اور تذبذب پیدا کرنا تھا۔

اس مرحلے پر دشمن نے ایسے الفاظ اور ایسی علامات استعمال کیں جن سے اہلِ حق کے دل نرم ہو سکتے تھے۔ قرآن، جس کے لیے وہ ہمیشہ سے لڑتے آئے تھے، جب اُنہی کے مخالفین

کی زبان پر آیا، تو بہت سے لوگ دھوکہ کھا گئے۔ یہاں دشمن نے وہی زبان اپنائی، وہی اصطلاحات استعمال کیں، اور وہی اصول دہرانے لگا جن کے تحفظ کی خاطر اہلِ ایمان قربانیاں دے چکے تھے۔ یہ سب اس لیے تھا تاکہ وہ اپنے سابقہ کردار پر پردہ ڈال سکے اور خود کو ایک مخلص، قابلِ بھروسا اور قابلِ گفتگو فریق کے طور پر پیش کر سکے۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دشمن کا مقصد صرف یہ تھا کہ اہلِ ایمان اپنی کامیابی کے لمحے میں احتیاط چھوڑ دیں، اپنی وحدت اور مزاحمت کی قوت سے دستبردار ہو جائیں، اور اس کی نرمی کو تبدیلی سمجھ کر کمزور پڑ جائیں۔ اس کے لیے اس نے امیر المؤمنینؑ جیسے معصوم اور بابصیرت رہنما کو بھی مشورہ دینے والوں کے دباؤ میں لا کر اس تحکیم کو قبول کروایا، حالانکہ امامؑ جانتے تھے کہ یہ چال ہے، اور اس کے پیچھے فریب کار ذہن کام کر رہا ہے۔

تحکیم کے واقعے نے اہلِ حق کو اندر سے کمزور کر دیا، کیونکہ جب دشمن کی باتوں کو سنجیدگی سے لیا گیا، تو داخلی صفوں میں اختلافات جنم لینے لگے۔ خوارج جیسی شدت پسند تحریک نے اسی فضا میں جنم لیا، اور دشمن کو نہ صرف اپنی پوزیشن سنبھالنے کا وقت ملا بلکہ ایک نئے مرحلے کے لیے خود کو منظم کرنے کا موقع بھی۔ وہ جو میدان میں شکست کھا چکا تھا، اب فکری اور سیاسی میدان میں نئے مکر و فریب کے ساتھ وارد ہو چکا تھا۔

یہی دشمن کی چالاکی ہوتی ہے کہ وہ نرمی کا لبادہ اوڑھ کر سخت ترین وار کرتا ہے۔ اس کی باتوں سے خوش فہمی جنم لیتی ہے، اور انسان اپنے دفاعی حصار کو خود ہی ڈھیلا کر دیتا ہے۔ اگر ہم اس ظاہری تائید کو سچ مان بیٹھیں، اور دشمن کی سابقہ فریب کاریوں کو فراموش کر دیں، تو ہم اپنی فکری و عملی بیداری کھو بیٹھتے ہیں، اور دشمن بغیر لڑے ہمیں شکست دے دیتا ہے۔

جب دشمن میدانِ جنگ یا سیاسی محاذ پر پسپا ہونے کے قریب ہوتا ہے، اور اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ براہِ راست مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، تو وہ ایک نہایت چالاک نفسیاتی اسٹریٹیجی اختیار کرتا ہے: وہ بظاہر ہمارے موقف کی تائید کرنے لگتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک گہری فریب دہی ہوتی ہے جس کا مقصد صرف وقتی فائدہ حاصل کرنا، اپنی پوزیشن کو بچانا، اور مخالف کے اندرونی نظم کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔

دشمن اس مرحلے پر اس انداز سے ہمارے نظریات، مطالبات، یا اصولوں کی بات کرنے لگتا ہے جیسے وہ اُن سے اتفاق رکھتا ہو۔ وہ ان الفاظ میں بات کرتا ہے جو ہمارے لیے مانوس اور دل کو بھانے والے ہوں، تاکہ ہم اسے مخلص سمجھنے لگیں اور اس کی سابقہ روش کو بھول جائیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی احتیاط ترک کر دیں، اپنے دفاعی اقدامات کو نرم کر دیں، اور اس کے ساتھ نرمی اختیار کریں۔ اس اسٹریٹیجی کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ہمارے حلقوں میں خوش فہمی پیدا ہو، لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اب دشمن بدل چکا ہے، یا کم از کم اس میں اصلاح کی گنجائش ہے، اور اس طرح مزاحمت یا سخت موقف کو غیر ضروری سمجھا جانے لگے۔

دشمن کی یہ ظاہری تائید اکثر نہ صرف زبانی بیان تک محدود رہتی ہے بلکہ بعض اوقات وہ علامتی اقدامات بھی کرتا ہے جیسے ہماری اصطلاحات استعمال کرنا، ہمارے پسندیدہ رہنماؤں کا ذکر خیر کرنا، یا ان نظریات کو سراہنا جن کے لیے ہم نے قربانیاں دی ہوتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ایک مخصوص نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ دشمن دیکھتا ہے کہ کھلم کھلا مخالفت اب اس کے لیے مہنگی پڑ رہی ہے، اس لیے وہ چالاکی سے راستہ بدلتا ہے اور

حریف کی زبان اختیار کرتا ہے تاکہ اس کا وار مؤخر ہو جائے، اور اندر سے وقت حاصل کر کے خود کو دوبارہ منظم کر سکے۔

یہ چال اس لیے بھی مؤثر ہوتی ہے کیونکہ انسان جب اپنے موقف کی تائید کسی سابقہ مخالف کی زبان سے سنتا ہے تو وہ بے ساختہ نرم پڑ جاتا ہے۔ اس کے جذبات میں ایک قسم کی تسکین پیدا ہوتی ہے اور وہ دشمن کے حقیقی ارادوں کو نظر انداز کرنے لگتا ہے۔ یہاں دشمن کی کامیابی اسی بات پر ہوتی ہے کہ ہم اس کی وقتی نرمی کو اس کی مستقل تبدیلی سمجھ بیٹھیں، اور اس کی چالوں کے پیچھے چھپے اصل مقاصد سے غافل ہو جائیں۔

اس اسٹریٹیجی میں دشمن اپنے پچھلے کردار پر پردہ ڈالنے کے لیے ہمیں ہمارے ہی نظریات کی زبان میں دھوکہ دیتا ہے۔ وہ ہماری روشنی مستعار لے کر اپنے اندھیرے چھپاتا ہے۔ یہ ظاہری ہم نوائی حقیقت میں باطنی دشمنی کی نئی شکل ہوتی ہے۔ اس کا مقصد ہمیں الجھا دینا، ہماری صفوں میں شک پیدا کرنا، اور مزاحمت کی روح کو مضمحل کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس دھوکہ دہی کو نہ سمجھ سکیں تو دشمن بغیر لڑے ہمیں شکست دے دیتا ہے، کیونکہ ہم اپنی فکری اور عملی بیداری کھو بیٹھتے ہیں۔

جب دشمن ہماری زبان میں بات کرنے لگے، ہماری اصطلاحات استعمال کرے، یا ہمارے اصولوں کی بات کرے، تو ہمیں خوش ہونے کے بجائے محتاط ہو جانا چاہیے۔ ہمیں ہر بات کے پیچھے اس کی نیت کو پرکھنا ہوگا۔ کیونکہ جب دشمن ہمارے قلعے کے دروازے پر ہماری زبان بول کر دستک دے رہا ہو، تو ممکن ہے وہ حملہ کرنے نہیں، اندر گھسنے آیا ہو۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب سب سے زیادہ بصیرت، استقامت، اور اصولی مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے

تا کہ ہم فریب کو پہچان سکیں، اور اس وقت تک اپنے موقف پر قائم رہیں جب تک کہ دشمن کی نیت، رویے اور پالیسی میں واقعی تبدیلی ثابت نہ ہو جائے۔ جب بھی دشمن ہماری باتوں کو دہرانے لگے، ہمیں خود پر فخر کے بجائے ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں ہر لفظ کے پیچھے نیت کو دیکھنا ہوتا ہے، کیونکہ دشمن کبھی بھی بغیر فائدے کے ہماری تائید نہیں کرتا۔ وہ جب ہماری زبان بولتا ہے، تو درحقیقت ہمارے قلعے کے دروازے سے اندر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب سب سے زیادہ بصیرت، احتیاط اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ ہم فریب کو پہچان سکیں اور اپنی اصولی مزاحمت کو جاری رکھ سکیں، حتیٰ کہ دشمن کی نیت، رویے، اور مقام میں واقعی تبدیلی ثابت ہو جائے۔

روٹین کی زندگی اور تخلیقی ذہن

روٹین والی زندگی ایک منظم اور متوازن طرزِ زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس میں ہر کام کے لیے ایک مخصوص وقت مقرر ہوتا ہے جس کی پیروی انسان کو ذہنی سکون، جسمانی نظم و ضبط اور وقت کے بہتر استعمال کا موقع دیتی ہے۔ روٹین کے تحت زندگی گزارنے والے افراد عام طور پر اپنی ذمہ داریوں کو وقت پر مکمل کرنے کے قابل ہوتے ہیں، ان کی نیند، خوراک، کام اور آرام کے اوقات متوازن ہوتے ہیں، جس سے وہ صحت مند اور کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسی زندگی میں انسان کو اپنے اہداف حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے، اور وہ اضطراب و بے چینی سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر اس کے نقصانات بھی ہیں؛ مسلسل ایک ہی طرزِ زندگی بعض اوقات بوریت اور تخلیقی صلاحیتوں میں کمی کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر روٹین بہت سخت ہو جائے تو انسان فطری لچک کھو بیٹھتا ہے، اور غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔

دوسری طرف بغیر روٹین کی زندگی میں آزادی اور لچک پائی جاتی ہے۔ ایسے افراد وقت کی پابندی سے آزاد ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنی مرضی سے اپنے دن کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کے لیے یہ اندازِ زندگی تخلیقی سوچ، نئی راہوں کی تلاش، اور تنوع کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ روایتی دائرے سے ہٹ کر زندگی کو محسوس کرتے ہیں اور نئے تجربات کو اپنانے میں جلدی کرتے ہیں۔ تاہم اس طرزِ زندگی کے نقصانات بھی کم نہیں۔ وقت کی

بے قدری، ذمہ داریوں میں کوتاہی، ذہنی دباؤ اور بے ترتیبی جیسے مسائل اکثر جنم لیتے ہیں۔ بغیر نظم کے جینے والے افراد وقت گزرنے کے ساتھ اپنے مقاصد کھو بیٹھتے ہیں، یا انہیں حاصل کرنے میں تاخیر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی زندگی میں تسلسل کا فقدان ہوتا ہے جو کہ کسی بھی کامیابی کے لیے بنیادی شرط ہے۔

لہٰذا زندگی کے ان دونوں اندازوں میں توازن پیدا کرنا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ نظم و ضبط کے ساتھ کچھ لچک رکھنا انسان کو نہ صرف منظم بلکہ تخلیقی، آزاد اور مطمئن بھی بنا سکتا ہے۔

البتہ ایک پہلو اور ہے وہ یہ کہ انسانوں کے پیشے، مشاغل اور فطری میلانات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی شخص تحریر و تقریر میں دلچسپی رکھتا ہے، کوئی مصوری، موسیقی یا سائنس میں مشغول ہوتا ہے، تو کوئی دوسروں کی خدمت یا تعمیر و ترقی کے میدان میں کام کر رہا ہوتا ہے۔ ان سب میں تخلیقی عمل ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، جو وقت کی مخصوص قید سے آزاد ہو کر ہی بہتر طور پر ابھرتا ہے۔ ایسے افراد کے لیے روایتی "صبح نو بجے دفتر جانا اور شام پانچ بجے واپسی" والی روٹین ہمیشہ موزوں نہیں ہوتی، بلکہ ان کے لیے کام کا وقت اور انداز ان کے ذہنی بہاؤ، جذبے اور تخلیقی تحریک سے جُڑا ہوتا ہے۔

اگر ہم روٹین کی تعریف کو صرف وقت کی ترتیب اور میکانکی معمولات تک محدود رکھیں، تو پھر تخلیقی انسانوں کی زندگی بظاہر "روٹین مخالف" معلوم ہو گی۔ لیکن اگر ہم روٹین کا معیار وقت کے بجائے مقصد، تسلسل اور تخلیق کے عمل کو بنائیں، تو پھر یہی بے قاعدہ دکھنے والی زندگی دراصل ایک خاص نوعیت کی روٹین قرار پائے گی۔ کیونکہ وہ شخص بھی ایک داخلی ترتیب کے تحت کام کر رہا ہوتا ہے، اس کے ذہن میں ایک واضح نقشہ ہوتا ہے کہ اسے کیا

پیدا کرنا ہے، کیسے آگے بڑھنا ہے، کہاں کہاں رک کر سوچنا ہے اور کب خود کو پھر سے تازہ دم کرنا ہے۔ یہ روٹین اگرچہ گھڑی کے وقت سے نہیں بندھی ہوتی، مگر اس میں ایک خاص تسلسل، عزم، اور تخلیقی نظم پایا جاتا ہے۔

ایسے تخلیقی افراد کے دن رات میں اگرچہ ظاہری طور پر ترتیب کا فقدان محسوس ہو، لیکن ان کے اندرون میں جو شعوری نظم ہے، وہ انھیں بھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی توانائی کو درست رخ پر صرف کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کے لیے کام کا بہترین وقت کب ہے، وہ کب زیادہ حساس ہوتے ہیں، کب ان کے خیالات کا دریا بہتا ہے، اور کب انھیں توقف کرنا ہے۔ پس اگر روٹین کو اس وسیع تر مفہوم میں سمجھا جائے جو صرف ظاہری ترتیب پر نہیں بلکہ داخلی نظم اور تخلیقی تسلسل پر مبنی ہو، تو ایسی زندگی یقیناً روٹین کی ایک اعلیٰ شکل سمجھی جائے گی۔

لہٰذا، روٹین صرف وہ نہیں جو وقت کے خانوں میں قید ہو بلکہ وہ بھی ہو سکتی ہے جو کسی کے دل و دماغ کے تخلیقی نظم میں ہو۔ ہر انسان کو اپنی فطرت، جذبے، اور پیشے کے مطابق روٹین کا ایک فطری انداز ملتا ہے۔ اصل کامیابی اس روٹین کو پہچاننا اور اس پر مسلسل قائم رہنا ہے، چاہے وہ وقت کے ساتھ بندھی ہو یا تخلیق کے محرکات سے جُڑی ہو۔

خواہش کو آزاد کر دیں

زندگی میں اکثر ہم کسی مقصد کے پیچھے اس قدر شدت سے لگ جاتے ہیں کہ وہی شدت ہمارے اور اس مقصد کے درمیان دیوار بن جاتی ہے۔ ہم دن رات اسی سوچ میں گرفتار رہتے ہیں کہ کیسے ہمارا ارادہ پورا ہو، ہمارا خواب حقیقت بنے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات یہی لگاؤ، یہی "پکڑ" ہی اصل رکاوٹ بن جاتی ہے۔ انسان جب کسی چیز کو زور سے تھامے رکھتا ہے، تو اس کی ساری توانائی اسی تھامنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اگر ہم روزمرہ کی ایک سادہ سی مثال لیں، تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔

فرض کریں آپ نے ایک بوتل بہت زور سے ہاتھ میں پکڑ رکھی ہے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کا ہاتھ تھکنے لگا ہے، انگلیاں اکڑنے لگی ہیں، بازو میں کھچاؤ سا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے ہی آپ اس بوتل کو چھوڑ دیتے ہیں، آپ کو ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا ہے، ایک ہلکا پن، جیسے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ یہی کیفیت ہماری ذہنی اور روحانی حالت میں بھی ہوتی ہے جب ہم کسی چیز سے ضد باندھ لیتے ہیں۔ جب ہم کسی مقصد، خواہش، یا خواہ مخواہ کی فکر کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، تو ہم اپنی توانائی اس کی ضد میں خرچ کر رہے ہوتے ہیں، اور وہ چیز ہم سے دور سے دور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہی اصول نیت اور ارادے کے ظہور پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ جب ہم کسی کام، کسی مقصد، کسی خواب کے لیے نیت کرتے ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم پوری توجہ، ایمان اور احساسات کے

ساتھ اس کا تصور کریں، اس کے لیے دعا کریں، اقدامات کریں، لیکن اس کے بعد اسے اللہ کے سپرد کر کے دل کو آزاد کر دیں۔ جیسے کسان زمین میں بیج ڈال کر اسے پانی دیتا ہے، مناسب دھوپ اور سایہ مہیا کرتا ہے، لیکن ہر لمحہ زمین کھود کھود کر یہ نہیں دیکھتا کہ بیج نے کونپل نکالی یا نہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گا، تو بیج کا بڑھنا ہی رک جائے گا۔ بالکل اسی طرح اگر ہم اپنے ارادوں اور دعاؤں کو بار بار شک کی نگاہ سے دیکھیں گے، بار بار ان کے ظہور کی فکر میں خود کو جکڑ لیں گے، تو ہم اس عمل کو رکاوٹوں میں تبدیل کر دیں گے۔

ایک اور روزمرہ کی مثال کو لیجیے۔ کسی بچے کو اگر کسی کھلونے کی بہت خواہش ہو اور وہ مسلسل اس کی ضد کرتا رہے، روئے، چیخے، بے چین ہو، تو بعض اوقات ماں باپ اُس کی ضد کی شدت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اس چیز کو دینے سے پہلے سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہی بچہ اپنی خواہش کو نرمی سے ظاہر کر کے خاموشی سے بیٹھ جائے، تو ماں باپ اس کی بات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، کیونکہ اس کی خاموشی اور بھروسہ، ان کے دل پر زیادہ اثر کرتا ہے۔ یہی اصول کائنات کی کارگزاری پر بھی صادق آتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کے لیے نیت کرتے ہیں اور اس پر بھروسہ رکھتے ہوئے خود کو اس سے جدا کر لیتے ہیں، تو ہم اس کے لیے راستہ کھول دیتے ہیں۔

خود سازی، مقاصد کے حصول، روحانی ترقی یا دنیاوی کامیابی—ہر میدان میں اگر ہم چاہیں کہ ہمارے اندر وہ حقیقی طاقت پیدا ہو جو کام کر دکھائے، تو ہمیں اس طاقت کے حصول کے راستے میں اپنی مزاحمت کو ختم کرنا ہو گا۔ طاقت صرف جسمانی نہیں، بلکہ روحانی اور ذہنی

بھی ہوتی ہے۔ جب توانائی آزاد ہو، تو وہ طاقت میں تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ توانائی فکر، ڈر، شک اور ضد کی زنجیروں میں جکڑی ہو، تو وہ طاقت پیدا ہی نہیں کر سکتی۔

اسی لیے اکثر ماہرینِ نفسیات اور روحانی اساتذہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ جب آپ تصور سازی کریں، دعائیں کریں، ارادے باندھیں، تو اس کے بعد اُسے چھوڑ دیں۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اُسے بھول جائیں یا کوشش ترک کر دیں، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ اُس پر بے جا گرفت نہ رکھیں، خود کو اُس سے باندھ نہ لیں، بلکہ عمل کو چلنے دیں، اپنے آپ کو اعتماد، سکون اور بھروسے کی حالت میں رکھیں۔

آزادی طاقت کی کنجی ہے، اور طاقت وہ قوت ہے جو تبدیلی لا سکتی ہے، کامیابی دے سکتی ہے، اور مقصد تک پہنچا سکتی ہے۔ جس طرح کھلی مٹھی کسی بھی سمت میں حرکت کر سکتی ہے اور نئی چیز کو تھام سکتی ہے، اسی طرح کھلا ذہن، آزاد دل اور غیر مقید ارادہ کامیابیوں کی طرف سفر کر سکتا ہے۔ زندگی میں جن چیزوں کو ہم آسانی سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لیے خود کو بھی ہلکا اور آسان رکھنا ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ چھوڑ دینا، دراصل کھو دینا نہیں ہوتا، بلکہ یہ اصل میں پانے کے راستے کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔

جدید کارپوریٹ کلچر اور فطری زندگی

جدید استعماری کارپوریٹ کلچر درحقیقت اس فکری و تہذیبی تسلسل کا حصہ ہے جو نوآبادیاتی دور سے اب تک مختلف شکلوں میں جاری ہے۔ پہلے اقوام و علاقوں کو جسمانی غلامی کے ذریعے قابو کیا گیا، اب ذہنی اور معاشی غلامی کے ذریعہ انسان کو ایک مشینی پرزہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ کلچر انسان کی فطری، روحانی، خاندانی اور تمدنی اقدار کو مٹا کر اسے صرف ایک پیداوار دینے والی مشین، ایک "پرفارمنس یونٹ" میں بدل دیتا ہے، جس کا مقصد صرف کمپنی کے اہداف کو پورا کرنا، منافع بڑھانا، اور وقت پر رپورٹ دینا رہ گیا ہے۔ اس ماحول میں انسان کی روح، اس کی انفرادیت، اس کی معنویت اور اس کے اندر چھپی خلاقیت دم توڑ دیتی ہے۔ دن رات کی دوڑ، ڈیڈلائنز، کامیابی کے مصنوعی معیار، مادی مقابلے، اور "پروفیشنلزم" کے نام پر جذبات و احساسات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔

فطری ثقافت اس کے بالکل برعکس، انسان کو فطرت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس میں زندگی کے فیصلے موسمی گردش، جسمانی و روحانی کیفیت، خاندانی تعلقات، اور باہمی محبت جیسے اصولوں پر استوار ہوتے ہیں۔ فطری کلچر میں انسان کا مقصد صرف کمانا یا آگے نکلنا نہیں ہوتا، بلکہ جینے، محسوس کرنے، شکر گزار ہونے، سیکھنے، بانٹنے، اور روحانی ارتقاء کی طرف بڑھنے کا عمل ہوتا ہے۔ انسان اپنے کام کو عبادت سمجھتا ہے، وہ اپنی ذات اور ارد گرد کی کائنات کے ساتھ ایک باطن کا تعلق محسوس کرتا ہے، جو اسے سکون اور طمانیت عطا کرتا

ہے۔ فطری ثقافت میں ماں باپ، بزرگ، ہمسایہ، بچے، درخت، جانور، موسم، سب کے ساتھ ایک رشتہ ہوتا ہے، جسے کارپوریٹ کلچر مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا ہے۔

جب انسان کو مسلسل صرف "کارکردگی" کی بنیاد پر ناپا جاتا ہے، اور اس کی قدر صرف اس کی پیداوار یا صلاحیت سے جُڑی ہوتی ہے تو وہ رفتہ رفتہ خود کو ایک "قابلِ تبدیل پرزہ" سمجھنے لگتا ہے، جسے جب چاہو نکال دو، جب چاہو لگا دو۔ یہ احساسِ بےوقعتی انسان کی شخصیت کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ کارپوریٹ کلچر میں کام کرنے والا فرد اکثر زندگی کی اصل سعادتوں، جیسے دعا، تفکر، باہمی گفتگو، پر سکون نیند، محبت بھرے لمحات، اور مقصدیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ روحانی خلا، ذہنی دباؤ، خاندانی دوری، معاشرتی ٹوٹ پھوٹ، اور مادی بے حسی اس کلچر کے لازمی نتائج ہیں۔

اس بحران کا علاج صرف نظام کو تبدیل کرنے میں نہیں بلکہ سب سے پہلے انسان کے زاویۂ نظر میں تبدیلی لانے میں ہے۔ انسان کو دوبارہ اپنی فطرت سے جوڑنا ہوگا۔ اسے یہ سیکھنا ہوگا کہ کامیابی صرف پیشہ ورانہ عہدے، تنخواہ، یا شہرت کا نام نہیں بلکہ ایک پر معنویت زندگی گزارنے کا نام ہے۔ یہ تعلیم گھر، مدرسے، اسکول، مسجد، اور سوسائٹی کے ہر ادارے میں دی جانی چاہیے کہ انسان صرف جسم نہیں بلکہ روح بھی ہے، وہ صرف تنخواہ لینے والا نہیں بلکہ خالقِ کائنات کا خلیفہ بھی ہے۔ کام کو عبادت، خاندانی تعلق کو نعمت، اور فطرت کے ساتھ ربط کو روح کی غذا سمجھنا ہوگا۔

اسلامی تعلیمات، خاص طور پر اہل بیتؑ کی سیرت، ہمیں وہ روحانی و اجتماعی نمونہ عطا کرتی ہے جس میں دنیا اور آخرت، فرد اور معاشرہ، کام اور سکون، سب کا ایک توازن موجود ہے۔

حضرت علیؑ کا قول "انسان خود ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر پوری کائنات اس کے اندر چھپی ہے" — ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ انسان مشین نہیں بلکہ ایک مکمل وجود ہے جو جسم، عقل، دل اور روح پر مشتمل ہے۔ لہٰذا ایک ایسا تمدن پیدا کرنا ہوگا جہاں کارکردگی کے ساتھ روحانیت، اور ترقی کے ساتھ انسانیت، اور پیداوار کے ساتھ محبت بھی ہو۔ یہی فطری کلچر ہے، اور یہی استعماری کارپوریٹ ثقافت کا حقیقی علاج ہے۔

انسان کو صرف ایک جسمانی وجود یا مادی وسائل پیدا کرنے والی مشین سمجھنا درحقیقت اس کی حقیقت سے انکار کے مترادف ہے۔ انسان محض ہڈیوں، گوشت اور خون کا ڈھانچہ نہیں، بلکہ وہ عقل، شعور، دل، احساس، جذبات، فطری وجدان اور روح کا حامل ایک جامع وجود ہے۔ اس کی شخصیت ایک ایسی کائنات ہے جس کے اندر ہزاروں جہان آباد ہیں۔ انسان کی فطرت میں فکر ہے، سوال ہے، جستجو ہے، محبت ہے، خوف ہے، امید ہے، خواب ہیں، اور ان سب سے بڑھ کر معنویت کی طلب ہے۔ جب اسے صرف ایک کارکردگی کا آلہ بنا کر دیکھا جاتا ہے، تو اس کی شخصیت کے باقی تمام پہلو پژمردہ ہو جاتے ہیں۔

ایک ایسا تمدن جو صرف ترقی، پیداوار، منافع، رفتار اور مقابلہ پر کھڑا ہو، وہ انسانی فطرت سے بغاوت کرتا ہے۔ وہ انسان کو مشین سے بدتر حالت میں لے آتا ہے، جہاں نہ دل کو سکون حاصل ہوتا ہے، نہ روح کو غذا، نہ عقل کو وسعت، اور نہ ہی تعلقات میں گہرائی۔ یہ تمدن جسم کو سہولت دیتا ہے، لیکن روح کو قید کر دیتا ہے۔ ایسے تمدن کے نتیجے میں پیدا ہونے والا انسان اندر سے کھوکھلا، تنہا، بے مقصد اور اضطراب کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے، اور دوسروں سے ربط کے لیے صرف مفادات کا سہارا لیتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک ایسا تمدن قائم کرنے کی ضرورت ہے جس میں کارکردگی ہو، مگر اس کے پیچھے روحانی بصیرت بھی ہو۔ جہاں ترقی ہو، مگر وہ انسانیت کے دائرے میں ہو، دوسروں کو روند کر نہیں بلکہ ساتھ لے کر آگے بڑھنے کی صورت میں ہو۔ جہاں پیداوار ہو، مگر اس میں محبت، اخلاص، اور نیتِ خیر شامل ہو۔ یہ تمدن صرف سڑکوں، عمارتوں، ٹیکنالوجی اور مارکیٹوں سے نہیں بنتا، بلکہ دلوں میں روشن ہونے ولی روشنی، گھروں میں پھیلنے والی شفقت، کام کی جگہوں میں موجود باہمی احترام، اور زندگی کے ہر شعبے میں معنویت کی تلاش سے بنتا ہے۔

یہی وہ فطری کلچر ہے جو نہ صرف انسان کی مکمل شخصیت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے نکھارنے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کلچر میں عبادت اور کام میں جدائی نہیں، بلکہ ہر نیت خالص ہو تو کام بھی عبادت بن جاتا ہے۔ یہاں عقل کو مادے کی پرستش میں ضائع نہیں کیا جاتا، بلکہ اسے حق، انصاف، عدل اور حسن کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دل کو خواہشات کی غلامی میں نہیں ڈالا جاتا بلکہ اسے محبتِ الٰہی، محبتِ اہل بیتؑ، اور محبتِ خلق کے ذریعے جلا دی جاتی ہے۔ روح کو دنیاوی تھکن سے نجات دلانے کے لیے ذکر، دعا، سکوت، فطرت سے ربط، اور انسانوں سے تعلق کے ذریعہ غذا دی جاتی ہے۔

ایک ایسا تمدن جس میں انسان کو اس کی اصل حیثیت کے ساتھ دیکھا جائے، نہ صرف فکری انقلاب کا ضامن بن سکتا ہے بلکہ وہ اجتماعی عدل، باہمی شفقت، اور روحانی بیداری کی بنیاد پر ایک حقیقی ترقی یافتہ معاشرہ قائم کر سکتا ہے۔ یہی وہ فطری تمدن ہے جس کی طرف انبیاءؑ نے بلایا، جس کا خاکہ قرآن نے کھینچا، اور جسے ائمہ اہل بیتؑ نے اپنی سیرت سے مجسم کر کے

دکھایا۔ اس تمدن میں انسان مشین نہیں بلکہ خلیفۃُ اللہ ہے، اور یہی انسان کی اصل سعادت اور منزل ہے۔

مالداری، آسائش یا آزمائش

قرآن مجید میں بارہا ذکر آیا ہے کہ دین کے رہبران، انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو عموماً مالدار طبقے اور سماجی اشرافیہ کی شدید مخالفت کا سامنا رہا ہے۔ ان کی دعوت کو جھٹلایا گیا، ان کا مذاق اڑایا گیا، اور ان کی سماجی حیثیت کو بنیاد بنا کر ان کی باتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ اس رویے کے پیچھے ایک گہر انفسیاتی اور سماجی رجحان کارفرما ہوتا ہے۔

مثلاً قرآن کہتا ہے:

"وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ "(الزخرف:23)

یعنی: "اسی طرح ہم نے تم سے پہلے جس بستی میں بھی کوئی خبردار کرنے والا بھیجا، اس کے خوشحال لوگوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔"

یہ آیت بتاتی ہے کہ دین کے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اشرافیہ اپنے موروثی نظام، رائج سماجی حیثیت، اور اپنی روایتی عظمت کو بچانے کی فکر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے لیے دینِ الٰہی کی دعوت ایک خطرہ بن جاتی ہے کیونکہ یہ دعوت عدل، مساوات، انکساری، اور

بندگی کی طرف بلاتی ہے۔ جبکہ یہ اشرافیہ اپنی طاقت، دولت اور سماجی رتبے کو اپنا اصل سرمایہ سمجھتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ دوسروں پر برتری قائم رکھتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت میں کہا گیا:

"وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ"...(المؤمنون:33)

یعنی: "اس کی قوم کے سردار، جنہوں نے کفر کیا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، اور جنہیں ہم نے دنیاوی زندگی میں خوشحال بنا رکھا تھا، انہوں نے کہا: یہ شخص تو تمہاری طرح کا ایک بشر ہے۔"

یہاں 'أَتْرَفْنَاهُمْ' یعنی "ہم نے انہیں دنیاوی زندگی میں خوشحال بنایا" ایک اہم نکتہ ہے۔ یہ خوشحالی اکثر غرور، استکبار، اور خود پسندی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ طبقہ عام طور پر دین کی اس تعلیم سے خوفزدہ ہوتا ہے جو برابری، قربانی، اور حساب و کتاب کی بات کرتی ہے۔ ان کے لیے دین ایک ایسا خطرہ ہے جو ان کی مصنوعی بڑائی کو چیلنج کرتا ہے۔

مزید برآں، قرآن ان کے طنزیہ انداز کو یوں بیان کرتا ہے:

"أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّن بَيْنِنَا" (الأنعام:53)

یعنی: "کیا یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے فضل کیا ہے؟"

یہ وہ بات ہے جو مالدار کفار غریب مؤمنین کے بارے میں کہتے تھے، گویا وہ اپنے معیارِ فضیلت کو مال و دولت اور سماجی حیثیت سمجھتے تھے، جبکہ دین کا معیار تقویٰ، صداقت اور تواضع ہے۔

ان آیات کے تناظر میں یہ واضح ہوتا ہے کہ مالدار طبقہ، جو اپنی دنیاوی برتری کو اپنی حقیقت سمجھ بیٹھا ہوتا ہے، اس کے لیے دین کی وہ دعوت جو انسان کو جھکنے، نفس کی خواہشات کو ترک کرنے، اور مظلوم کے ساتھ کھڑا ہونے کی دعوت دیتی ہے، ناقابلِ قبول بن جاتی ہے۔ وہ دین کو اس لیے مسترد کرتے ہیں کہ اس سے ان کی طاقت، استحقاق اور رتبہ خطرے میں آجاتا ہے۔ یہ نفسیاتی دفاعی رویہ انہیں دین دار غریبوں کا مذاق اڑانے پر مجبور کرتا ہے، تاکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا سکیں اور عوام کی نگاہوں میں دین کو غیر معتبر ثابت کر سکیں۔

تاہم قرآن ایسے مؤمنین کو صبر کی تلقین دیتا ہے اور ان کے لیے بڑا اجر اور عزت کا وعدہ کرتا ہے۔

جیسا کہ فرمایا" :فَصَبَرُوا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ" "جَزَآؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۖ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِىَ رَبَّهُ "(البینہ:7-8)

یعنی: "اور وہ صبر کرتے رہے، بیشک وہی بہترین مخلوق ہیں۔ ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہے: ہمیشگی کے باغ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہ ان کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اشرافیہ کے طنز اور ظلم کا مقابلہ صبر، یقین اور تقویٰ سے کیا جائے، اور آخرت میں اللہ ان لوگوں کو ایسی ابدی عزت سے نوازے گا جو دنیاوی دولت داروں کے تمام رعب و دبدبے سے کہیں بلند اور پائیدار ہوگی۔

مالدار طبقے کی مخالفت کی جڑیں ان کے نفسیاتی تحفظات، خود برتری کے احساس، اور دین کی اخلاقی پابندیوں سے فرار میں پیوست ہیں۔ جبکہ غریب مؤمنین کے لیے یہ آزمائش ہوتی ہے کہ وہ دین پر قائم رہیں اور دنیاوی طنز و تضحیک کے باوجود اپنی ایمانی شناخت سے دستبردار نہ ہوں، کیونکہ خدا کا وعدہ ہے کہ وہی دراصل "خیر البریۃ" ہیں۔

جدید دور کے سرمایہ دار، بینکار اور استعماری ذہنیت رکھنے والے افراد کی مخالفت دین و دینداری سے اصولی اختلاف پر مبنی نہیں بلکہ گہری نفسیاتی محرکات کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں گذشتہ اقوام کے مترفین، یعنی وہ خوشحال اور طاقتور طبقہ جو پیغمبروں کا انکار کرتا رہا، ان کی مزاحمت کرتا رہا اور دین داروں کا مذاق اڑاتا رہا، ان کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ آج کے سرمایہ دارانہ اور استعماری ذہن رکھنے والے طبقے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ الفاظ، اسلوب اور اصطلاحات بدل چکی ہیں، مگر اندرونی ذہنی ساخت ویسی ہی باقی ہے۔

یہ طبقہ اپنے آپ کو سماج کا رہنما، ترقی کا علمبردار اور عقل و سائنس کا وارث تصور کرتا ہے۔ ان کے شعور میں یہ بات گہری پیوست ہوتی ہے کہ وہی لوگ انسانیت کی رہنمائی کے حقدار ہیں جن کے پاس دولت، وسائل، ٹیکنالوجی اور سیاسی قوت ہے۔ وہ خود کو ان تمام روحانی، اخلاقی اور الٰہی قدروں سے بلند سمجھتے ہیں جو انسان کو تواضع، عبودیت اور قربِ الٰہی کی

طرف بلاتی ہیں۔ دین کا تصور ان کے لیے محض پسماندگی کی علامت بن جاتا ہے، کیونکہ دین انسان کو خدا کا بندہ بناتا ہے جبکہ یہ طبقہ انسان کو اپنی ساختہ دنیا کا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس ذہنیت کے پیچھے برتری کا ایک گہرا احساس ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس طاقت، علم، اور فیصلہ سازی کی صلاحیت ہے، لہٰذا کسی اور نظام، خاص طور پر ایسا نظام جو وحی اور الہام پر مبنی ہو، کو تسلیم کرنا ان کے لیے اپنی برتری کے انکار کے مترادف ہے۔ یہ نفسیاتی برتری ایک باطنی تکبر کو جنم دیتی ہے، جیسا کہ قرآن فرعون کے حوالے سے نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا: "أَلَسْتُ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ" — کیا میں تمہارا سب سے بڑا رب نہیں ہوں؟ (النازعات:24)۔ یہی نفسیاتی کیفیت آج کے عالمی مالیاتی اور سیاسی نظام کی بنیاد میں موجود ہے، جہاں انسانوں کو سود، قسطوں، صارفیت، اشتہارات، اور مصنوعی خواہشات کے ذریعے غلام بنایا جاتا ہے۔ بینکاری نظام جو سود پر مبنی ہے، وہ دراصل انسانی ارادے، عمل اور مستقبل پر قبضے کا ایک خاموش اور دیرپا ذریعہ ہے۔

یہ طبقہ اندر سے خدا سے خالی ہوتا ہے، مگر ظاہری قوت اور اختیار کے نشے میں مبتلا رہتا ہے۔ ان کی یہ باطنی بے سکونی انہیں دین سے خوفزدہ رکھتی ہے۔ دین ان کے لیے نہ صرف ایک فکری خطرہ ہے بلکہ ایک سماجی و سیاسی خطرہ بھی، کیونکہ دین معاشی و معاشرتی انصاف کی دعوت دیتا ہے، انسان کو خدا کے سامنے جوابدہ بناتا ہے اور ظلم، استحصال اور تکبر کو جڑ سے کاٹنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ بات ان کے نظام کے لیے ناقابلِ قبول ہے، لہٰذا وہ دین کا مذاق اڑاتے ہیں، دین داروں کو دقیانوسی، رجعت پسند، دہشت گرد یا ناکام فرد کے طور پر پیش کرتے ہیں تاکہ ان کی دعوت کو سماج میں کمزور کیا جا سکے۔

اس نفسیاتی دفاعی عمل کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے: "إِنْ هَـٰذَآ إِلَّآ أَسَـٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ" (الأنفال: 31)— "یہ تو بس پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں"۔ اس طرح وہ اپنے ضمیر کی چبھن کو دبانے کے لیے دین کو قصہ، فسانہ یا جھوٹ قرار دے کر خود کو فکری طور پر مطمئن کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصل خوف اپنے اختیار کے خاتمے کا ہوتا ہے۔ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر عوام بیدار ہو گئے، دین کے مطابق جینا شروع کر دیا، تو وہ اپنی غلامی سے نکل جائیں گے۔ دین کا پیغام انسان کو آزاد کرتا ہے، جیسا کہ امام خمینیؒ نے فرمایا کہ "اسلام نے ہمیں آزاد انسان بنایا ہے"۔ یہی آزادی ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے دین دار لوگوں کے لیے جو اس ظلم، طنز، اور مخالفت کا سامنا کرتے ہیں، واضح وعدے فرمائے ہیں۔ فرمایا: "وَلَا تَهِنُوا۟ وَلَا تَحْزَنُوا۟ وَأَنتُمُ ٱلْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ" (آل عمران: 139)— "کمزور نہ پڑو اور غم نہ کرو، اگر تم مؤمن ہو تو تم ہی غالب رہو گے"۔ اور فرمایا: "ٱلَّذِينَ إِن مَّكَّنَّـٰهُمْ فِى ٱلْأَرْضِ أَقَامُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا۟ ٱلزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا۟ بِٱلْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا۟ عَنِ ٱلْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَـٰقِبَةُ ٱلْأُمُورِ" (الحج: 41)— "وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، اور برائی سے روکتے ہیں، اور انجام کار اللہ ہی کے لیے ہے"۔

یہ آیات نہ صرف امید دیتی ہیں بلکہ یہ بتاتی ہیں کہ دین داروں کی جدوجہد کا نتیجہ بالآخر برتری ہے، کیونکہ خدا کا وعدہ حق ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ نظام جو ظلم، تکبر، اور لالچ پر قائم ہو، وہ وقتی طور پر غالب ہو سکتا ہے، مگر انجام کار وہی ہو گا جو فرعون، نمرود، اور قارون کا ہوا۔ اس لیے موجودہ استعمار اور جدید سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مقابلہ صرف فکری یا سیاسی

محاذ پر نہیں بلکہ ایک روحانی بیداری، نفسیاتی آزادی، اور اخلاقی شعور کے ذریعے ہی ممکن ہے — اور یہی دین کا اصل ہدف ہے۔

اسلام میں مال کو فتنہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اسے مطلقاً برا نہیں کہا گیا۔ اصل خطرہ مال کی ذات میں نہیں، بلکہ اس سے متعلق انسان کے رویے اور نفسیاتی وابستگی میں پوشیدہ ہے۔ قرآن فرماتا ہے ": إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ" (التغابن:15) — "تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں، اور اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔" اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مال کا امتحان بن جانا ممکن ہے، اگر انسان اس سے درست تعلق قائم نہ رکھے۔ دین میں مالداری کے منفی اثرات سے بچنے کے لیے سب سے اہم پیشگی احتیاط یہ ہے کہ مال کو مقصدِ زندگی نہ بنایا جائے بلکہ اسے ایک ذریعہ سمجھا جائے — ذریعہ عبادت، ذریعہ خدمت، اور ذریعہ عزتِ نفس کی حفاظت کا۔

سب سے پہلی روحانی تربیت جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے وہ زہد ہے، یعنی دل کا دنیا سے بے نیاز ہونا۔ زہد کا مطلب دنیا کو ترک کرنا نہیں بلکہ دل میں اس کی حیثیت کو کم کرنا ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا" : الزُّهدُ ليسَ أن لا تَملِكَ شيئاً، ولكن أن لا يَملِكَكَ شيءٌ" — "زہد یہ نہیں کہ تم کسی چیز کے مالک نہ ہو، بلکہ زہد یہ ہے کہ کوئی چیز تمہاری مالک نہ بنے۔" یہ اصول انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ اگر مال آئے تو وہ شکر کرے اور اگر چلا جائے تو صبر۔

مالداری کے منفی اثرات سے بچنے کے لیے ایک اور بنیادی احتیاط یہ ہے کہ انسان مسلسل محاسبہ کرتا رہے۔ روزانہ اپنے دل میں یہ جھانکے کہ کیا مال مجھے خدا سے دور تو نہیں کر رہا؟ کیا میں دوسروں پر فخر کر رہا ہوں؟ کیا میری سخاوت بڑھ رہی ہے یا بخل پیدا ہو رہا ہے؟ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا": لَيْسَ مِنّا مَنْ لَمْ يُحاسِبْ نَفْسَهُ كُلَّ يَوْمٍ" —"ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جو ہر دن اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے۔"

تیسری اہم احتیاط یہ ہے کہ مال کا استعمال خالص نیت کے ساتھ ہو۔ اگر انسان کماتا ہے تاکہ حلال رزق سے اہل و عیال کی کفالت کرے، صدقہ دے، دینی خدمات انجام دے، اور عزتِ نفس کے ساتھ زندگی گزارے تو یہ کمائی عبادت بن جاتی ہے۔ مگر اگر یہی کمائی تکبر، دکھاوے، یا خواہشات کی پیروی کا ذریعہ بنے تو یہ تباہی کا راستہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا": كادَ الفَقْرُ أنْ يَكُونَ كُفْرًا، وكادَ الحِرْصُ أنْ يَهلِكَ الإنسانَ" —"قریب ہے کہ فقر انسان کو کفر تک لے جائے، اور قریب ہے کہ حرص انسان کو ہلاک کر دے۔" یہ حدیث ہمیں اس توازن کی طرف بلاتی ہے جس میں نہ فقر سے فرار ہو، نہ مال سے محبت، بلکہ اعتدال ہو۔

مالداری کے دوران ایک مستقل احتیاط یہ بھی ہے کہ انسان فقراء اور مستحقین سے خود کو جوڑے رکھے۔ مال کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اگر انسان صدقہ، خمس، زکوٰۃ اور ناداروں کی مدد کو اپنی زندگی کا معمول بنالے تو یہ مال کا غرور اور دنیا سے دل کا لگاؤ ختم کرتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے": خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا "(التوبہ:103)—"ان

کے مال میں سے صدقہ لے لو تاکہ انہیں پاک اور پاکیزہ کرو۔" یعنی صدقہ صرف دوسروں کی ضرورت نہیں پوری کرتا بلکہ خود صاحبِ مال کو بھی روحانی طور پر صاف کرتا ہے۔

ایک اور پیشگی احتیاط یہ ہے کہ انسان مال کے ذریعے تعلقات میں بگاڑ پیدا نہ ہونے دے۔ بعض اوقات مال انسان کو ایسا خود پسند بنا دیتا ہے کہ وہ غریبوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے یا اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ قرآن نے ایسے مالداروں کے انجام کی خبر دی ہے جنہوں نے کہا": مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَـٰذِهِ أَبَدًا" (الکہف:35) —"مجھے نہیں لگتا کہ یہ باغ کبھی ختم ہو گا"، اور انجام یہ ہوا کہ ان کا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اس غرور سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان مال کے ساتھ خاکساری، تواضع اور دل کی شکستگی کو لازم پکڑے۔

آخر میں سب سے بڑی احتیاط یہ ہے کہ انسان دعا کرتا رہے کہ اے خدا! مجھے اس مال کا مالک بنا جو میرے لیے خیر ہے، اور مجھے اس مال سے بچا لے جو مجھے تجھ سے دور کر دے۔ جیسا کہ امام سجادؑ نے دعا کی": اللَّهُمَّ اجْعَلْ غِنَايَ فِي نَفْسِي، وَالْيَقِينَ فِي قَلْبِي —" "پروردگار! میرے دل میں بے نیازی اور میرے قلب میں یقین پیدا فرما۔"

یوں دینِ اسلام میں مالداری کو ایک امانت کے طور پر دیکھا جاتا ہے، نہ کہ مقام، فخر یا تسلط کا ذریعہ۔ اس کے منفی اثرات سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ دل کو ہر وقت اللہ سے جوڑا جائے، نفس کا محاسبہ کیا جائے، اور مال کو صرف دنیا کی نہیں بلکہ آخرت کی بھی زینت بنایا جائے۔

معاشرے کی انتظامی قیادت دینی کیوں ہونی چاہیے؟

فلسفی اور سماجی تجزیے کی روشنی میں اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ سماج کی رہبری صرف خدا کی طرف سے کیوں متعین ہونی چاہیے اور اگر ولی خدا (معصوم امام) موجود نہ ہو تو صاحب تقوا اور پرہیزگار فقیہ ہی کیوں رہبری کا اہل ہو، تو اس کا جواب ایک جامع انسانی، فطری، اخلاقی، دینی اور سیاسی حکمت پر مبنی اصول سے دیا جاسکتا ہے۔ اس کی تفہیم کے لیے سب سے پہلے انسانی فطرت اور معاشرتی ساخت کا مطالعہ ضروری ہے۔

انسان ایک ایسا مخلوق ہے جو کثیر الجہتی، متضاد میلانات اور بدلتی ہوئی خواہشات کا حامل ہے۔ اس کی عقل محدود، خواہشات لا محدود، اور ارادہ مختلف اثرات کے تابع ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جب بھی انسانی قیادت صرف عقل، تجربہ یا طاقت کی بنیاد پر ہوئی، تو وہ یا تو ظلم کی طرف گئی، یا استحصال کی طرف، یا پھر فکری گمراہی و زوال کی جانب۔ اس کے برعکس جب انسانی رہبری الوہی اصولوں پر مبنی ہو، تو وہ عدالت، توازن اور ہدایت کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنے حال پر نہیں چھوڑا، بلکہ انہیں ایک ایسے نظام کے تحت جینے کا حکم دیا جس میں خدائی منصوبہ بندی کے تحت رہبری کا انتظام موجود ہو۔ یہ فلسفہ، صرف مذہبی ضرورت نہیں بلکہ ایک عقلی، اخلاقی اور فطری تقاضا بھی ہے۔

اس اصول کے مطابق، جو خالق انسان ہے، وہی اس کے کمال و نجات کے راستے کو بہتر جانتا ہے۔ وہی اس کے لیے قانون بنا سکتا ہے، اور وہی اس پر نگراں و رہبر بھی منتخب کر سکتا ہے۔ چنانچہ رسولوں، نبیوں اور بعد ازاں ائمہ علیہم السلام کی تقرری اسی خدائی قانون سازی اور منصوبہ بندی کا تسلسل ہے۔ اس فکری اور فلسفی اصول کو قرآنی استدلال میں بھی دیکھا جا سکتا ہے: "اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" (اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے)۔ اس طرح کی رہبری اس بات کی ضامن ہے کہ معاشرتی قوانین، سیاسی نظم، اخلاقی اصول، اقتصادی عدل اور فکری رہنمائی کسی ذاتی مفاد یا گروہی رجحان کے تحت نہ ہو، بلکہ وہ عالمگیر، ماورائے زمان و مکان اور حقیقت پر مبنی ہو۔

اب اگر معصوم امام علیہ السلام ظاہری طور پر موجود نہ ہوں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کون سا فرد یا ادارہ ہو سکتا ہے جو اس امامت کے فلسفے کو جزوی یا کلّی طور پر زندہ رکھ سکے؟ اس کے لیے وہی معیار ضروری ہے جو امامت کے لیے مطلوب تھا — یعنی تقویٰ، دین شناسی، نفسانی خواہشات پر قابو، شجاعت، عدل پسندی، اور خدائی احکام سے گہری وابستگی۔ لہٰذا فقہاء میں سے وہ افراد جو ان شرائط پر پورا اترتے ہوں، انہیں اس ذمہ داری کا اہل قرار دینا کوئی اجتہادی اختراع نہیں، بلکہ خود ائمہ معصومینؑ کا منصوبہ ہے۔ ان کی احادیث، فرامین اور نظام عدل کے اصول اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ غیبت کبریٰ میں جو فقیہ ان صفات سے متصف ہو، وہی نظام کی باگ دوڑ سنبھالنے کا اہل ہے۔ اس کی مثال امام حسن عسکریؑ کا وہ فرمان ہے جس میں انہوں نے ایک متقی، خود کو صراط مستقیم پر رکھنے والے، اور خواہشات نفسانی پر قابو رکھنے والے فقیہ کی تقلید کو واجب قرار دیا ہے۔

اب اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیوں معاشرے کے تمام شعبہ جات — تعلیم، معیشت، سیاست، قانون، ثقافت، ذرائع ابلاغ — کی نگرانی صرف ایک دینی جمہوریت کے تحت ہی ہونی چاہیے؟ اس کا جواب سماجی فلسفے میں اس نکتے سے جڑا ہے کہ انسان کی فطرت میں خیر اور شر دونوں کا داعیہ موجود ہوتا ہے، لیکن ہر معاشرتی نظام اپنے غالب نظامِ اقدار (value system) کے مطابق خیر اور شر کی تعریف متعین کرتا ہے۔ جب یہ اقدار مادی یا نفسانی رجحانات پر مبنی ہوں، جیسا کہ لبرل یا سرمایہ دار نظام میں ہوتا ہے، تو وہ معاشرے کو وقتی آسودگی تو دے سکتے ہیں لیکن روحانی، اخلاقی اور ابدی فلاح نہیں دے سکتے۔ اس کے برعکس دینی جمہوریت — جس کی بنیاد خدا کی حاکمیت، نبی و امام کی رہنمائی، اور شریعت کی بالادستی پر ہو — معاشرتی اقدار کی بنیاد الٰہی ہدایت پر رکھتی ہے۔

دینی جمہوریت اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ یہ نظام ایک طرف عوام کو مشورے، رائے اور شرکت کا حق دیتا ہے، اور دوسری طرف فیصلہ سازی کا معیار الٰہی اصولوں کو قرار دیتا ہے۔ اس میں فرد کو حاکم اعلیٰ نہیں بنایا جاتا، بلکہ خدا کو حاکم اعلیٰ مانا جاتا ہے اور فرد کو اس کے قانون کا پابند رکھا جاتا ہے۔ اس میں طاقت، دولت، قومیت، نسل یا جنس کی بنیاد پر برتری نہیں دی جاتی بلکہ تقویٰ، عدل، علم اور خدمت کو معیار مانا جاتا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جسے قرآن نے بیان کیا ہے: "إن أکرمکم عند الله أتقاکم" — اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

مزید برآں، چونکہ تمام شعبہ جات — خواہ وہ قانون ہو یا تعلیم، سیاست ہو یا معیشت — کسی نہ کسی سطح پر انسانی اقدار کی تشکیل کرتے ہیں، اس لیے ان کی نگرانی ایک ایسے نظام کے

تحت ہونی چاہیے جو ان اقدار کو وحی، عقل سلیم اور فطرت کے اصولوں کے مطابق مرتب کر سکے۔ ایسا نظام وہی ہو سکتا ہے جو امامت و ولایت کے تسلسل پر قائم ہو اور جس کی روح میں عدالت، ہدایت اور تقویٰ ہو۔ لہٰذا ایک دینی جمہوریت — جس میں عوام کا انتخاب، فقیہ کی رہبری، اور شریعت کی بالادستی ہو — نہ صرف اسلام کے مطابق ہے بلکہ انسانیت کی فطری ضرورت بھی ہے۔

اس تمام فکری خاکے کو اگر "غدیر" کے پیغام میں دیکھا جائے، تو وہ فقط علیؑ کی ولایت کا اعلان نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ایک آسمانی سیاسی و سماجی ماڈل کی بنیاد ہے۔ یہ ماڈل اس بات کی علامت ہے کہ قیادت کا حق صرف اسے ہے جسے خدا منتخب کرے یا اس کے نمائندے (ائمہؑ) جس کو اہل سمجھیں۔ یہی ماڈل آج بھی جدید جاہلیت کے مقابلے میں انسانیت کی نجات کا واحد فلسفہ ہے۔ یہی غدیر کا پیغام ہے، یہی دینی جمہوریت کا فلسفہ ہے، اور یہی اس سوال کا جواب ہے کہ رہبری صرف الٰہی معیار پر کیوں ہونی چاہیے۔

فطری، کائناتی اور نفسیاتی قوانین کا گہرائی سے مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ انسان کی حقیقی فلاح، استحکام اور ارتقاء صرف اور صرف خدائی رہبری کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ اگر ہم کائنات کی ہر شے کو دیکھیں تو وہاں ایک واضح اور متوازن نظام موجود ہے۔ سورج چاند، ستارے، ہوائیں، پانی، نباتات، حیوانات — یہ سب ایک خاص نظم، قانون اور حساب کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اس نظم کو نہ کوئی پارلیمان تشکیل دیتی ہے، نہ کوئی شخصی عقل، بلکہ یہ سب کچھ ایک علیم و حکیم ذات نے ترتیب دیا ہے جو ہر شے کو اس کی اصل حقیقت

کے مطابق چلاتی ہے۔ یہ کائناتی نظم اس امر کی علامت ہے کہ تخلیق کا نظام خود سے نہیں بلکہ ایک ایسی عقل کل سے جڑا ہے جو محدود، وقتی یا نفسانی خواہشات سے ماورا ہے۔

جب ہم انسان کو اس نظام کائنات کے مقابل رکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان چونکہ عقل و ارادہ رکھتا ہے، اسے قانونِ طبعی کے بجائے قانونِ اخلاق و اختیاری کے تحت زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل محدود ہے، اس کی خواہشات لا محدود، اس کے علم میں خطا کا امکان ہر وقت موجود، اور اس کے ارادے اندرونی و بیرونی اثرات کے تابع ہوتے ہیں۔ ایسے انسان اگر خود اپنا قانون بنائیں یا خود رہبر چنیں تو لازماً وہ رہبری ان کے مفادات، تعصبات، قومیت، جنس، یا طبقاتی نظام کے زیر اثر ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں بارہا انسانی حکومتیں ظلم، فریب، طبقاتی ناانصافی، استحصال اور خونریزی کی نمائندہ بنی ہیں۔ یہی "فتنہ" اور "حرج و مرج" کی اصل بنیاد ہے۔

انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان میں خود پرستی، غلبہ پسندی، برتری کا جذبہ، انتقام، خوف، حرص، اور تعصب جیسے میلان فطری طور پر موجود ہوتے ہیں۔ اگر اس پر کوئی الٰہی نگرانی نہ ہو، یا رہبری ایسا نہ ہو جو نفسِ مطمئنہ کا حامل ہو، تو انسان ان میلانات کے تابع ہو کر نہ صرف دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ خود بھی دائمی پریشانی و اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن نے بارہا "نفس" کے مختلف درجات کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی واضح کیا کہ ہدایت یافتہ نفس وہی ہو سکتا ہے جو "نفس امارہ" کو قابو میں رکھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا نظام کہاں سے آئے جو ہر انسان کے داخلی و خارجی فتنے پر قابو رکھے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے: وہی نظام جو خالق انسان نے خود عطا کیا ہے۔

خدائی رہبری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نفس پرستی سے پاک ہے، وہ ذاتی مفاد کے بجائے کل انسانیت کی خیر و صلاح کو پیش نظر رکھتی ہے۔ خدا نے نہ صرف پیغمبر بھیجے بلکہ ان کے ذریعے مکمل شریعت، نظام عدل، قانون، اور عملی نمونہ بھی عطا کیا۔ یہ سب کچھ محض عبادات یا اخروی نجات کے لیے نہیں بلکہ دنیاوی فلاح و عدل کے قیام کے لیے بھی تھا۔ قرآن بارہا کہتا ہے کہ ہم نے انبیاء کو اس لیے بھیجا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔ اور جب نبی کی ظاہری زندگی ختم ہو جائے، تو خدا اس امت کو بغیر رہبر کے نہیں چھوڑتا، بلکہ معصوم امام یا ان کی طرف سے منتخب کردہ جامع الشرائط فقیہ کے ذریعے اس رہبری کو جاری رکھتا ہے۔

خدائی رہبری وہ واحد رہبری ہے جو انسان کو نہ صرف اس کے انفرادی تزکیہ کی طرف بلاتی ہے بلکہ اجتماعی نظام کی اصلاح کا ذمہ بھی لیتی ہے۔ وہ دنیا میں امن، عدل، رحم، معاشرتی مساوات، معاشی توازن اور روحانی ارتقاء کا نظام دیتی ہے، اور آخرت میں نجات کا راستہ بھی مہیا کرتی ہے۔ اس کے برعکس وہ نظام جو محض انسانی تجربات یا اکثریت کی رائے پر مبنی ہو، وہ لازماً اپنے اندر تضادات، تبدیلیوں اور ظلم کا خطرہ رکھتا ہے کیونکہ وہ "حق مطلق" کی نمائندگی نہیں کرتا۔

مثال کے طور پر، جیسے جسم کے تمام نظام کو دماغ اور دل کنٹرول کرتے ہیں اور ان کی صحت پورے بدن کی صحت کی ضامن ہوتی ہے، اسی طرح معاشرے کا دماغ اور دل اس کا رہبر ہوتا ہے۔ اگر وہ رہبر نفس پرست، نادان یا فاسق ہو، تو پورا معاشرہ بیماری، ظلم، گمراہی اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر رہبر، خدا کی طرف سے مقرر شدہ یا اس کے

منتخب کردہ اصولوں کا پابند ہو، تو وہ معاشرے کو اسی طرح صحت، توازن، فلاح اور ترقی کی طرف لے جاتا ہے جیسے ایک صحت مند دل و دماغ جسم کو متحرک رکھتے ہیں۔

یہ بات پوری صداقت سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر انسان دنیا و آخرت دونوں میں فلاح چاہتا ہے، اگر وہ امن، عدل، ہدایت اور استحکام چاہتا ہے، اگر وہ اپنی انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی تعمیر بھی چاہتا ہے، تو اسے ہر حالت میں خدا کی رہبری کو اختیار کرنا ہو گا، اور معصوم یا اس کے نمائندے ولی فقیہ کی اطاعت کرنی ہو گی۔ کیونکہ وہی ایک ایسا مرکز ہے جہاں وحی، عقل، تقویٰ، علم، شریعت، اور عدل ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ یہی وہ مرکز ہے جو انسان کو "حرج و مرج" سے نکال کر "صراط مستقیم" کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جو فرد کو بھی نجات دیتا ہے اور ملت کو بھی۔ یہی فلسفہ ولایت ہے، اور یہی فطرت، عقل اور وحی کا متفقہ فیصلہ ہے۔

خدا کے دشمن، ماضی اور آج

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہود کے ایک مخصوص گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جو نہ صرف خدا کے نبیوں کو قتل کرتا رہا بلکہ اللہ کی کتابوں میں تحریف کا مرتکب بھی ہوا۔ ان کا کردار ہمیشہ سے آسمانی ہدایت کے مقابل اور اہل حق کے خلاف رکاوٹ بننے والا رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وحی کے علم کو جاننے کے باوجود اس کی اطاعت سے گریزاں رہے، اپنی خواہشات کو دین پر مقدم رکھا، اور خدا کے قوانین کو دنیاوی مفادات کے عوض بیچ ڈالا۔ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے " :یقتلون النبیین بغیرحق و یقولون قلوبنا غلف"، اور یہ کہ "یشترون بآیات اللہ ثمناً قلیلاً"، یعنی یہ لوگ خدا کی آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں۔

یہ کردار محض تاریخ میں دفن ہو جانے والا نہیں بلکہ ایک مسلسل چلنے والا نظامِ باطل ہے جو مختلف ادوار میں مختلف چہروں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اگر آج کی دنیا میں ان کی شناخت پر غور کیا جائے تو یہ وہی استکباری، صیہونی اور عالمی سامراجی قوتیں ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل کے تحریف شدہ مفادات پر مبنی فکری وسیاسی نظام کو اپنے مقاصد کی بنیاد بنایا ہوا ہے۔ ان کی جڑیں اسرائیل کی صیہونی ریاست، عالمی بینکاری نظام، کارپوریٹ میڈیا نیٹ ورکس، اور سیاسی تھنک ٹینکس میں پیوست ہیں، جنہوں نے پوری دنیا کو ایک نیو ورلڈ آرڈر، عالمی مارکیٹ اور لبرل کلچر کے تحت قابو میں رکھنے کا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔

ان کی سب سے بڑی دشمنی انبیائے کرام کے حقیقی وارثوں یعنی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ ہے، جو آج کے دور میں بھی ظلم کے خلاف، استکبار کے مقابل اور الٰہی نظام کی دعوت کے علمبردار ہیں۔ اہل تشیع کا عالمی فکر، امام مہدیؑ کے انتظار کا تصور، ولایت فقیہ کا عملی نظام، اور ظالم حکمرانوں کے خلاف مزاحمتی فکر — یہ سب ان کے لیے شدید خطرہ ہیں، کیونکہ یہ تصور زمین پر عدل و قسط کے قیام اور عالمی ظلم کے خاتمے کی نوید بن کر ابھرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں اسلامی انقلاب کے خلاف مسلسل سازشیں، عراق، یمن، لبنان، شام اور بحرین میں مزاحمتی تحریکوں کو کچلنے کی کوششیں، اور دنیا بھر میں شیعہ مسلمانوں کے خلاف قتل و غارت، دھماکے، میڈیا بلیک آؤٹ، اور نظریاتی مسخ شدگی کی مہم — یہ سب اس ایک عالمی صیہونی و سامراجی ذہن کی کارفرمائیاں ہیں جو دراصل اس دور کے "تحریف کرنے والے یہودیوں" کے روحانی وارث ہیں۔

ان کی شناخت صرف مذہب کے عنوان سے نہیں بلکہ فکری، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی اور میڈیا کی حکمرانی کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، نیٹو، سی آئی اے، اور موساد جیسے اداروں کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی مرضی کا تابع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ ظاہری طور پر انسانی حقوق، جمہوریت، ترقی، اور امن کے نعرے لگاتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ خونریزی، نسل کشی، اخلاقی انحطاط اور استعماری قبضے کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ وہی گروہ ہوتا ہے جو

"خدائی رہبری" کا قائل ہو، جو امامت و عدل کے قیام پر ایمان رکھتا ہو، اور جو استعمار کے ہر چہرے کو بے نقاب کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

آج بھی اگر ہم فلسطین پر جاری صیہونی مظالم کو دیکھیں، یا لبنان و یمن میں مزاحمتی تحریکوں کے خلاف عالمی خاموشی کا مشاہدہ کریں، یا ایران کی معاشی ناکہ بندی، یا دنیا بھر میں شیعہ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہمات کو دیکھیں تو یہ سب اسی تسلسل کا حصہ ہیں جس کا آغاز ان انبیاء کے خلاف ہوا جنہیں بے گناہ شہید کیا گیا۔ وہی "تحریف کرنے والے یہودی ذہن" آج بھی حق کے خلاف صف آرا ہے، اور اس کے مقابل میں کھڑے وہی لوگ ہیں جو غدیر کے وارث ہیں، جو عاشورا کے وارث ہیں، اور جو انتظارِ مہدیؑ کو فقط عقیدت نہیں بلکہ مزاحمت اور قیام کا مرکز سمجھتے ہیں۔

لہٰذا آج کے دور میں ان باطل قوتوں کو شناخت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے ظاہری نقاب سے ہٹ کر ان کے افعال، ان کے عزائم اور ان کے اہداف کو پہچانیں۔ اور ساتھ ہی ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ ہر وہ نظام، تحریک یا قوم جو عدل، آزادی، حریت، استقامت اور توحید کے راستے پر گامزن ہو، وہ ان کے حملوں کا نشانہ بنے گی۔ اسی لیے آج حق اور باطل کی صف بندی پہلے سے زیادہ واضح ہے — ایک طرف غدیر کا وارث نظامِ ولایت ہے، اور دوسری طرف وہ صیہونی و سامراجی قوتیں جو دنیا میں ظلم و تحریف کا پرانا کھیل نئے انداز سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

انسان مجبور ہے یا مختار ؟

قرآن مجید میں بظاہر ایک ایسا تضاد نظر آتا ہے جو بہت سے ذہنوں کو الجھا دیتا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ": تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے" (الشوری:30)، یعنی انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور جو بھی نقصان یا آزمائش اُسے پہنچتی ہے وہ اس کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف قرآن اسی انسان کی حرکات وسکنات کو اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے، یہاں تک کہ غزوۂ بدر میں نبی اکرمؐ کے تیر پھینکنے کے عمل کو بھی یوں بیان کرتا ہے ": جب تم نے تیر پھینکا تو درحقیقت تم نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا " (الأنفال:17)، اور اعلان فرماتا ہے کہ "اللہ ہر چیز کا خالق ہے " (الزمر:62)۔

ان دونوں بیانات کو اگر سطحی طور پر دیکھا جائے تو ایک الجھن پیدا ہوتی ہے: اگر سب کچھ اللہ کرتا ہے تو پھر انسان کے اعمال کا ذمہ دار وہ خود کیسے ٹھہرتا ہے؟ لیکن جب اس مسئلے کو دقیق انداز میں اسلامی فلسفہ، عرفان اور تفسیر کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو حقیقت بڑی لطیف انداز میں واضح ہو جاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ وجود کا سرچشمہ ہے۔ ہر شے کا خالق وہی ہے، ہر حرکت، ہر سکون، ہر واقعہ اسی کی مشیت سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ کائنات ایک منظم نظامِ تکوین کے تحت چل رہی ہے جس کی ہر سطح پر اللہ کی قدرت کارفرما ہے۔ اس نظام کے اندر

اللہ نے انسان کو ایک ممتاز مقام دیا ہے: اسے عقل عطا کی، ارادہ اور اختیار دیا، ہدایت بھیجی، اور خیر و شر کی پہچان سکھائی۔ چنانچہ انسان اللہ کی عطا کردہ اس قوتِ ارادی سے فیصلے کرتا ہے، راستے چنتا ہے، اور ان فیصلوں کے نتائج کا سامنا کرتا ہے۔ اس لیے جب انسان برائی کرتا ہے، ظلم کرتا ہے یا اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنی عقل و ارادے کے استعمال سے ایسا کرتا ہے، اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب قرآن فرماتا ہے کہ یہ تمہارے ہاتھوں کا کیا دھرا ہے۔

دوسری طرف اگر انسان کوئی عمل انجام دیتا ہے—نیکی ہو یا بدی—تو اس عمل کا وجود، اس کی تاثیر، اس کا ظہور، سب اللہ کی اجازت اور طاقت سے ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات اسباب کو وجود میں لاتی ہے، آگ میں جلا دینے کی تاثیر رکھتی ہے، پانی میں بجھانے کی طاقت رکھتی ہے، اور انسان کے ہاتھ، زبان، دماغ کو حرکت دیتی ہے۔ لہٰذا ہر عمل، چاہے انسان کا ہو یا کسی اور مخلوق کا، بالآخر اللہ کی ہی تخلیق ہے۔ وہی خالقِ ہر شے ہے، حتیٰ کہ انسان کے ارادے اور طاقت کا خالق بھی وہی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ نے انسان کو ارادہ عطا کیا، اس کی بنیاد پر فیصلے کا اختیار دیا، اس لیے جب وہ کسی عمل کا انتخاب کرتا ہے تو اس کا اخلاقی و شرعی ذمہ دار بھی خود ہوتا ہے۔

یہی وہ لطیف نکتہ ہے جو جبر و تفویض کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ نہ تو انسان مکمل مجبور ہے کہ جو کچھ کرے، اس میں اس کی کوئی مرضی نہ ہو، اور نہ ہی وہ مکمل خود مختار ہے کہ اس کا عمل اللہ کی مشیت سے بالکل آزاد ہو۔ اہلِ معرفت اور اسلامی فلاسفہ نے اس کو امر بین الامرین کا مقام قرار دیا ہے، یعنی انسان ایک ایسے مقام پر ہے جہاں وہ اپنی نیت،

ارادے، اور اختیار کے ساتھ عمل کرتا ہے، مگر وہ اختیار بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے اور اس عمل کا ظہور بھی اللہ کے ارادے اور طاقت سے ہوتا ہے۔

انسان کا گناہ، اس کا ظلم، اس کا انکار، اس کی کوتاہی — یہ سب اس کے نفس کی ترجیحات، اس کی خواہشات اور اس کے انتخاب کا نتیجہ ہیں، لہٰذا ان کا اخلاقی اور اخروی جوابدہ انسان خود ہے۔ لیکن وہ عمل وجود میں تب ہی آتا ہے جب اللہ اجازت دیتا ہے، یعنی وہ فعل کے وجود کا خالق ہے، مگر اس کے انتخاب کا ذمہ دار انسان ہے۔ اسی لیے قرآن ایک ہی وقت میں انسان کے اعمال کو اس کی "کمائی" کہتا ہے، اور ان کے وجود کو اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔

یہ حقیقت اس بات کی بھی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائناتی نظم کا ایک فعال اور باوقار رکن بنایا ہے۔ وہ چاہتا تو انسان کو مجبور مخلوق بنا دیتا، مگر اُس نے اُسے عقل و اختیار دے کر اس کائنات میں ایک بااختیار مقام عطا فرمایا۔ اسی اختیار کی آزمائش کا نام ہی زندگی ہے، اور اسی پر کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔ اس لیے جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے، اگر وہ ہماری کوتاہیوں کا نتیجہ ہو، تو اللہ ہمیں ہماری اصلاح کے لیے متوجہ کرتا ہے کہ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا ہے، اور اگر کوئی خیر پہنچے یا نیکی کا موقع ملے، تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ محض اللہ کا فضل اور اس کی توفیق سے ہے۔

پس، قرآن کے ان بظاہر متضاد بیانات میں درحقیقت ایک گہرا عرفانی اور حکیمانہ توازن ہے، جو انسان کو نہ غرور میں مبتلا کرتا ہے، نہ مایوسی میں، بلکہ اسے ایک باادب، باخبر اور بااختیار عبدِ الٰہی بننے کی دعوت دیتا ہے۔

آزمائش و امتحان، خدا اور انسان کا علم

قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ انسانوں کو آزماتا ہے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کون بہترین عمل کرتا ہے، کون سچّا ہے اور کون جھوٹا، کون صبر کرتا ہے اور کون پیٹھ پھیر جاتا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا" : وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰى نَعۡلَمَ الۡمُجٰهِدِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَالصّٰبِرِيۡنَ وَنَبۡلُوَا أَخۡبَارَكُمۡ "(محمد: 31)، یعنی: "ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے تاکہ ہم جان لیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور صبر کرنے والا، اور ہم تمہاری خبریں آزمائیں۔" بادی النظر میں یہ الفاظ یہ تاثر دیتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ کو کسی شے کا علم حاصل نہیں، اور وہ آزمائش کے ذریعے جاننا چاہتا ہے۔ مگر جب ہم اس بیان کو دقیق انداز میں اسلامی عقائد، فلسفہ اور عرفان کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو حقیقت ایک گہری معرفت کو آشکار کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے، اُس کا علم ازلی، ابدی اور کامل ہے۔ اُس پر کوئی چیز مخفی نہیں، نہ ماضی، نہ حال، نہ مستقبل۔ اُس کا علم مخلوقات کے وجود سے پہلے بھی ان کے ہر حال پر محیط ہوتا ہے۔ انسان پیدا ہونے سے پہلے، اس کے اعمال، اس کی نیتیں، اس کی کمزوریاں، اس کی قوتیں، اُس کی کامیابیاں اور ناکامیاں، سب اللہ کے علم میں ہوتے ہیں، کیونکہ اُس کا علم کسی چیز کے وجود کے بعد حاصل ہونے والا علم نہیں بلکہ عین تخلیق کے ساتھ جڑا ہوا، اس کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اللہ کسی کو آزماتا ہے تاکہ "وہ جان لے"، یہ دراصل اللہ کے علم میں اضافہ ہونے کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ اس سے مراد "ظہور و

انکشاف" ہوتا ہے، یعنی وہ چیز جو پہلے سے اللہ کے علم میں ہے، وہ بندے کی ذات سے ظاہر ہو جائے، بندے کی اپنی نظر میں آشکار ہو جائے، اور دوسروں پر بھی واضح ہو جائے۔

یہ بات قابلِ فہم ہے کہ انسان کے باطن میں کئی ممکنات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ خود کو نیک، سچا، یا صابر سمجھتا ہے، مگر جب تک وہ آزمائش کی بھٹی سے نہ گزرے، اس کی اصلیت نہ اس پر ظاہر ہوتی ہے، نہ لوگوں پر۔ آزمائش کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کے باطن کو ظاہر کرتا ہے، تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ اس میں کتنا ایمان، کتنا تقویٰ، کتنا صبر ہے۔ اس لیے قرآن جب فرماتا ہے کہ "اللہ جاننا چاہتا ہے"، تو اس سے مراد "ظہور میں لانا" اور "اس علم کو مشہود بنانا" ہوتا ہے، نہ کہ اسے حاصل کرنا۔ اس کو علماء و مفسرین "علمِ ظاہری" یا "علمِ فعلی" سے تعبیر کرتے ہیں، جو دراصل اللہ کے علم کے تقاضوں کے مطابق دنیا میں واقعات کے ظہور کا نام ہے۔

مزید یہ کہ امتحان صرف بندے کی کیفیت جاننے کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ خود بندے کی تربیت، تزکیہ، اور روحانی بلندی کے لیے بھی ہوتا ہے۔ آزمائش کے ذریعے انسان کے اندر موجود پوشیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں، اس کا توکل بڑھتا ہے، اس کے اندر صبر اور استقامت پیدا ہوتی ہے۔ یہ مراحل درحقیقت اللہ کی رحمت کی نشانیاں ہیں کہ وہ بندے کو محض جانچنے کے لیے نہیں بلکہ سنوارنے کے لیے آزماتا ہے۔ جیسے ایک استاد طالب علم کو امتحان دیتا ہے، حالانکہ وہ اُس کی قابلیت سے واقف ہوتا ہے، مگر چاہتا ہے کہ طالب علم خود محنت کرے، ترقی کرے، اور عملی دنیا میں خود کو منوائے۔

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ قرآن کی زبان میں جب اللہ تعالیٰ کسی فعل کو خود کی طرف منسوب کرتا ہے — جیسے "ہم جاننا چاہتے ہیں" — تو یہ انسان کے فہم اور زبان کے قریب تر اندازِ بیان ہوتا ہے تاکہ بندہ اُس حقیقت سے سبق لے سکے۔ اس اندازِ بیانیہ کا مقصد بندے کی تربیت ہے، نہ کہ اللہ کے علم پر کسی کمی کا اظہار۔ کیونکہ وہ تو "عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ" ہے، یعنی ظاہر اور چھپی ہر چیز کا جاننے والا۔

لہذا یہ کہنا کہ اللہ آزمائش اس لیے کرتا ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے، دراصل ایک تربیتی تعبیر ہے۔ اللہ جانتا ہے، مگر بندہ نہیں جانتا — نہ خود کو، نہ اپنی کمزوریوں کو، نہ اپنی صلاحیتوں کو۔ آزمائش کے ذریعے بندے پر اس کا اپنا مقام واضح ہوتا ہے، اور وہ اس امتحان میں گزر کر، اگر کامیاب ہو، تو کمال کے قریب ہو جاتا ہے۔ اور اگر ناکام ہو، تو توبہ، اصلاح اور رجوع کے دروازے اس پر کھلتے ہیں۔ اس لیے آزمائش، علمِ الٰہی کی کمی نہیں بلکہ انسان کی حقیقت کو اس کے اپنے سامنے لانے کا الٰہی نظام ہے، جو علمِ الٰہی کے تقاضے کے تحت ترتیب پایا ہے۔

آزمائش کا فلسفہ اسلامی معارف میں نہایت گہری معنویت رکھتا ہے۔ یہ صرف ایک وقتی حادثہ یا دردناک مرحلہ نہیں بلکہ انسان کی خلقت، اس کی تربیت، اس کی شخصیت کی تکمیل، اور اس کے باطن کے اسرار کے انکشاف کا ایک حکیمانہ نظام ہے۔ قرآن مجید اور معصومینؑ کے کلام میں آزمائش کو "ابتلاء" اور "فتنہ" جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، جن کا مقصد محض تکلیف دینا نہیں، بلکہ انسان کو چھانٹنا، نکھارنا اور پاک کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اسے عقل، ارادہ، شعور اور اختیار عطا کیا، اور پھر اسے اس دنیا میں بھیجا تاکہ وہ اپنے اختیار اور عمل سے کمال کی راہ پر گامزن ہو۔ مگر یہ راستہ صرف نعروں، دعووں یا خواہشات سے طے نہیں ہوتا۔ انسان کے باطن میں کون سے رجحانات غالب ہیں، وہ حق کو دیکھ کر اس کا ساتھ دیتا ہے یا نفس کی پیروی کرتا ہے، وہ تنہائی میں بھی اللہ سے ڈرتا ہے یا محض لوگوں کے درمیان متقی نظر آنا چاہتا ہے، یہ سب چیزیں اسی وقت ظاہر ہوتی ہیں جب انسان آزمائش سے گزرتا ہے۔

آزمائش کا عمومی تصور صرف مصیبت، تنگدستی، بیماری، اور ناکامی جیسی منفی اور دشوار حالتوں سے وابستہ ہوتا ہے، مگر قرآن کا اندازِ فکر بہت جامع اور عمیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے " : وَنَبۡلُوكُم بِالشَّرِّ۔ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً" (الأنبياء:35)، یعنی "ہم تمہیں برائی اور بھلائی دونوں سے آزماتے ہیں"۔ اس آیت کے مطابق آزمائش صرف زخم، درد، محرومی یا فقر سے نہیں ہوتی، بلکہ دولت، صحت، اقتدار، شہرت، حسن، علم، اور سکون بھی دراصل امتحان کے مختلف پیرائے ہیں۔

سختی اور دکھ کی آزمائش میں انسان کا صبر، توکل، استقامت، اور رجوع الی اللہ پرکھا جاتا ہے، جب کہ نعمت اور آسائش کی آزمائش میں اس کا شکر، انکساری، عدل، قناعت اور خدا فراموشی سے اجتناب آزمایا جاتا ہے۔ مصیبت میں خدا کو یاد رکھنا بعض اوقات آسان ہوتا ہے، مگر نعمت کے وقت خدا کو یاد رکھنا اور اسے اپنے عمل، اخلاق، اور رویوں میں ترجیح دینا زیادہ مشکل اور خطرناک امتحان ہوتا ہے۔ اکثر انسان نعمت میں مغرور ہو جاتے ہیں، خود کو

خود کفیل سمجھنے لگتے ہیں، اللہ کی عطا کو اپنا کارنامہ گردانے لگتے ہیں، اور پھر ریا، غرور، ظلم، غفلت اور شہوت کی وادی میں اتر جاتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی مثال اس بات کی روشن علامت ہے کہ اللہ کا دیا ہوا اقتدار، دولت، لشکر، ہوا پر تسلط، سب کچھ آزمائش تھا۔ انہوں نے اس نعمت کو آزمائش سمجھ کر جب بھی کسی عظیم کامیابی پر نظر کی تو فرمایا" :هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّي لِيَبۡلُوَنِي أَأَشۡكُرُ أَمۡ أَكۡفُرُ "(النمل:40) یعنی:" یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔" یہاں یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ آزمائش صرف زخم نہیں بلکہ زینت بھی ہو سکتی ہے، اور بسا اوقات زینت کا زہر آزمائش کے زخم سے زیادہ مہلک ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ آزمائش انسان کی اہلیت کے مطابق ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا" :لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَا "(البقرہ:286) یعنی اللہ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آزمائش بھی آتی ہے، وہ ہماری اندرونی صلاحیت، قوتِ برداشت، اور ترقی کے راستے سے مربوط ہوتی ہے۔ بعض آزمائشیں گناہوں کا کفارہ بن کر آتی ہیں، بعض روحانی بیداری کا سبب بنتی ہیں، اور بعض درجات کی بلندی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

اگر ہم اس نکتہ کو بھی پیش نظر رکھیں کہ آزمائش کا مطلب صرف امتحان لینا نہیں بلکہ تزکیہ کرنا ہے، تو ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ الٰہی نظام صرف انصاف کا

مظہر نہیں بلکہ رحمت کا بھی مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو محض گرا دینے کے لیے نہیں آزماتا، بلکہ سنوارنے، جگانے، اور قریب لانے کے لیے آزماتا ہے۔ مصیبت میں انسان جب گریہ کرتا ہے، دل نرم ہوتا ہے، اور دعا کی لذت سے آشنا ہوتا ہے، تب وہ دراصل اللہ سے ایک گہرا تعلق قائم کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب نعمت میں رہتے ہوئے خدا کی بندگی اور شکرگزاری اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ظرف اور عرفان کی بلندی کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔

لہٰذا، آزمائش ایک لازمی اور مقدس مرحلہ ہے، جس کے بغیر نہ کوئی بندہ نکھر سکتا ہے، نہ اس کی حقیقت ظاہر ہو سکتی ہے، اور نہ ہی وہ اللہ کے خاص قرب کا مستحق بن سکتا ہے۔ آزمائش دراصل انسان کے ظاہر کو باطن سے جوڑنے، اور اس کی باطنی صلاحیتوں کو کھولنے کا عمل ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو انسان کی دنیا کو تربیت گاہ اور آخرت کو نتیجہ گاہ بنا دیتا ہے۔

قرآن میں ہر شہ کا ذکر ہے، سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " :وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ "(الأنعام: 59)، یعنی کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں ہے جو کتابِ مبین میں موجود نہ ہو۔ اسی مفہوم کو بعض دیگر آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے، جیسے "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ "(الأنعام: 38)، یعنی ہم نے کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں دی۔ ان آیات کے پیش نظر بعض لوگوں کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر چیز قرآن میں ہے تو پھر وہ تمام سائنسی علوم، فنون، فلسفے، نفسیات، ٹیکنالوجی، تاریخ، طب، اور دیگر بشری علوم جو انسان نے ہزاروں برس کے تجربات، مشاہدات، اور تحقیقات سے حاصل کیے، وہ قرآن میں کہاں ہیں؟ کیا واقعی قرآن ہر چیز کو بیان کرتا ہے؟ اور اگر نہیں، تو ان آیات کا مفہوم کیا ہے؟

اس اشکال کو رفع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی زبان، اس کا اسلوب، اور اس کے نزول کا ہدف سمجھا جائے۔ قرآن نہ تو ایک سائنسی انسائیکلوپیڈیا ہے، نہ ہی محض تاریخی یا فلسفیانہ دستاویز، اور نہ ہی ایک عددی معلومات کا دفتر۔ قرآن ایک هُدیٰ ہے، یعنی ایک ایسا الٰہی رہنما جو انسان کو معرفت، بندگی، ہدایت، تزکیہ، اور نجات کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا اصل موضوع "انسان" اور اس کا ربط "خالق" کے ساتھ ہے۔ لہٰذا جب قرآن کہتا ہے کہ ہر خشک و تر چیز اس میں موجود ہے، تو اس سے مراد یہ نہیں کہ تمام سائنسی فارمولے، میڈیکل نسخے، یا انجینئرنگ کے اصول لفظی طور پر اس میں درج ہوں، بلکہ اس کا

مطلب یہ ہے کہ ان تمام علوم کی اساس، بنیاد، ہدایت کا اصول، اور ان کے صحیح یا غلط ہونے کے معیارات قرآن میں موجود ہیں۔

علم کی دو سطحیں ہوتی ہیں: ایک، ظاہر و محسوس کی سطح پر حاصل ہونے والا علم، جس میں انسان عقل و تجربہ سے کام لیتا ہے، جیسے سائنس، طب، معاشیات وغیرہ؛ اور دوسرا، ان علوم کی سمت، اخلاقی قدر، اور ان کے صحیح استعمال کا علم، جو وحی اور ہدایت سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن انسان کو اس دوسرے درجے کے علم میں رہنمائی دیتا ہے کہ وہ اپنے ظاہری علم کو کیسے خیر و نیکی میں استعمال کرے، اسے فساد، ظلم، استعمار یا مادہ پرستی کا ذریعہ نہ بنائے۔ مثلاً، قرآن سائنس کی تمام تفصیلات بیان نہیں کرتا، مگر وہ بار بار "تتفکرون"، "تعقلون"، "تنظرون" جیسے الفاظ کے ذریعے عقل کو متحرک کرتا ہے، اور پھر بتاتا ہے کہ علم کا اصل مقصد ایمان، خشیت، تذکّر، اور عبودیت ہے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ ہر چیز اس میں ہے، تو وہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ہر چیز کا اصول، یا ہر شعبۂ علم کا مرکزی اخلاقی دائرہ قرآن میں موجود ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا" : اللہ نے قرآن کو اس طرح نازل کیا کہ اس میں ہر چیز کی تفسیر موجود ہے، یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی جو تمہیں درکار ہوں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی علم واقعی انسانیت کی فلاح، اصلاح، اور کمال کے لیے ہے، تو اس کی بنیاد قرآن میں موجود اخلاقی و فکری اصولوں سے ٹکراؤ نہیں رکھتی بلکہ ان اصولوں کی گہرائی میں موجود ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ، بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں "کتاب مبین" سے خود لوحِ محفوظ مراد لی ہے، جو اس کائنات کا ازلی و ابدی علم ہے، اور قرآن اس لوح کا ایک جلوہ اور نازل شدہ نسخہ ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو قرآن کو "جامعِ کلیات" کہا جائے گا، کہ اس میں ہر شے کی بنیاد، اصل، اور اس کے اخلاقی و معنوی رخ کی طرف اشارہ موجود ہے، جب کہ تفصیلات کا انکشاف زمانے، عقل، اور تجربے کے ذریعہ ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن میں ہر خشک و تر چیز ہے، دراصل یہ کہنے کے مترادف ہے کہ قرآن علم و زندگی کے ہر پہلو کی سمت متعین کرتا ہے، اس کی بنیادوں کو مہیا کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ کون سا علم نور ہے اور کون سا علم شرّ۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ اصول دیتا ہے، اور انسان کو مکلف بناتا ہے کہ وہ عقل و بصیرت کے ساتھ ان اصولوں کو اپنی زندگی، معاشرت، علم، اور تہذیب میں نافذ کرے۔ اگر قرآن خود ہر چیز کی تفصیل دینے لگے تو انسان کی آزادی، اختیار، تدبر، اور علمی ترقی کا دروازہ بند ہو جائے۔ مگر قرآن نے انسان کو وہ شعور دیا ہے جس سے وہ تمام شعبہ ہائے علم کو الٰہی مرضی کے مطابق استوار کر سکتا ہے۔

اسی لیے اہل بیت علیہم السلام سے روایت ہے کہ قرآن زندہ کتاب ہے، جو ہر زمانے کی ضرورتوں کے مطابق اپنے معانی عطا کرتا ہے۔ اس کی گہرائی میں ہر دور کے سوالات کا جواب، اور ہر علم کی بنیاد کا سرچشمہ موجود ہے۔ پس جو قرآن کو ظاہری لغت اور حروف میں محدود سمجھتا ہے، وہ اس کے باطنی نور اور فکری جامعیت سے غافل ہے۔

قرآن اور اہلبیتؑ کو دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ ان کا رشتہ ایسا گہرا، لازمی، اور جدا ناشدنی ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

اپنی امت کے لیے جو دو عظیم ترین امانتیں چھوڑی ہیں، وہ یہی دو ہیں: کتاب اللہ اور عترت اہل بیتؑ۔ مشہور و متواتر حدیث ثقلین میں رسول اللہ صل اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں" : انی تارك فيكم الثقلين، كتاب الله وعترتي اهل بيتي، ما ان تمسكتم بهما لن تضلوا بعدی، و انهما لن يفترقا حتى يردا علىّ الحوض"۔ یعنی: میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت، میرے اہل بیت۔ تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے، اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔

اس حدیث میں قرآن اور اہل بیتؑ کو ایک اکائی کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جن کا ربط محض رسمی یا نسبی نہیں، بلکہ علمی، روحانی، اور ہدایتی بنیادوں پر ہے۔ قرآن اللہ کی وہ کتاب ہے جو ہدایت ہے، اور اہل بیتؑ اس ہدایت کے جیتے جاگتے ترجمان اور محافظ ہیں۔ قرآن اصول و کلیات بیان کرتا ہے، مگر اس کی گہرائی، تاویل، تفسیر، اور عملی تطبیق اہل بیتؑ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس کا ایک نمونہ امام علیؑ کا یہ مشہور قول ہے" : ذٰلِكَ القُرآنُ فَاسْتَنْطِقُوهُ، وَلَنْ يَنْطِقَ، وَلَكِنْ أُخْبِرُكُمْ عَنْهُ"... یعنی یہ قرآن ہے، اسے خود بولنے پر آمادہ کرو، مگر وہ بولتا نہیں؛ پس میں تمہیں اس کی خبر دیتا ہوں۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ قرآن کو سمجھنے اور بیان کرنے والا ایک زندہ امام درکار ہے، جو اس کی روح اور معانی سے آشنا ہو۔

اہل بیتؑ نہ صرف قرآن کے شارح ہیں، بلکہ خود قرآن کی عملی شکل بھی ہیں۔ ان کی زندگی، اخلاق، عبادات، سیاست، سیرت، اور تعلیمات قرآن کی مجسم تفسیر ہیں۔ رسول اللہ صل اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد اگر امت کو کسی نے قرآن کی روشنی میں دین کا اصل

چہرہ دکھایا، تو وہ اہل بیتؑ ہی تھے۔ امام جعفر صادقؑ، امام باقرؑ، اور دیگر ائمہؑ کی جو احادیث، فقہی احکام، اور دینی معارف ہم تک پہنچے ہیں، وہ سب قرآن کی بنیاد پر ہیں۔ ان میں کوئی بات قرآن سے ٹکرانے والی نہیں، بلکہ وہ قرآن کی روح کی توضیح و تشریح کرتی ہیں۔

مزید یہ کہ اہل بیتؑ کو اللہ تعالیٰ نے معصوم قرار دیا ہے، جیسا کہ آیت تطہیر میں ہے" :إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا "(الاحزاب: 33)، یعنی اللہ کا ارادہ ہے کہ اہل بیت سے ہر رجس کو دور کرے اور انہیں پاک و پاکیزہ رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔ یہ عصمت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ قرآن کی تشریح میں کسی ذاتی رائے، خواہش، یا غلطی کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ ان کی ہدایت قرآن کی ہدایت ہی کا پرتو ہوتی ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ سے لے کر امام مہدیؑ تک، ہر امامؑ نے قرآن کی تعلیم، اس کے معارف، اور اس کی روشنی میں معاشرہ سازی کا فریضہ انجام دیا۔ خود امام علیؑ نے فرمایا" :لو شئت لأوقرت سبعين بعيرًا بتفسير بسم الله الرحمن الرحيم "یعنی اگر میں چاہوں تو" بسم اللہ الرحمن الرحیم "کی تفسیر میں ستر اونٹوں کا بوجھ بھر سکتا ہوں۔ یہ بات قرآن کے باطنی معانی میں ان کی معرفت کا گواہ ہے۔

امام زین العابدینؑ کی دعائیں، امام باقرؑ کے دروس، امام صادقؑ کی علمی محافل، اور امام رضاؑ کے مناظرے قرآن کے زندہ مظاہر تھے۔ وہ قرآن کی ایسی تفسیر کرتے تھے جو صرف الفاظ کی حد تک محدود نہیں تھی، بلکہ دل، عقل، اور روح کو زندہ کرتی تھی۔

قرآن اور اہل بیتؑ کے درمیان یہ رشتہ محض تفسیری یا تعلیمی نہیں بلکہ ایک قدسی رشتہ ہے۔ قرآن، اللہ کا کلام ہے، اور اہل بیتؑ اس کلام کے رازدار ہیں؛ قرآن، اللہ کی طرف سے ہدایت ہے، اور اہل بیتؑ اس ہدایت کی ضیاء ہیں؛ قرآن خاموش ہدایت ہے، اور اہل بیتؑ وہ زبان ہیں جو اسے بولنے پر آمادہ کرتی ہے؛ قرآن اصول ہے، اور اہل بیتؑ ان اصولوں کا تطبیقی چہرہ ہیں۔

پس اگر کوئی شخص قرآن کو صرف اپنے فہم سے سمجھنا چاہے اور اہل بیتؑ کی ہدایت سے کنارہ کشی کرے، تو وہ ظاہری الفاظ میں الجھ جائے گا اور حقیقی نور سے محروم رہ جائے گا۔ قرآن کو اہل بیتؑ کے ذریعے سمجھنا، اور اہل بیتؑ کو قرآن کی روشنی میں پہچاننا، یہی وہ دوطرفہ تعلق ہے جس کے بغیر نہ دین مکمل ہوتا ہے اور نہ ہدایت حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں کا تمسک ہی نجات کی ضمانت ہے، اور یہی اسلام کا اصل سرمایہ ہے۔

مزاحمت اور تسلیم - کب اور کیوں؟

انسانی زندگی میں ایسے لمحات بارہا آتے ہیں جب وہ کسی ایسے مسئلے میں الجھ جاتا ہے جو بظاہر حل نہیں ہو رہا ہوتا۔ مسلسل جدوجہد، کشمکش، اور ناکامی کے تجربے انسان کے ذہن و دل پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ جدید علمِ نفسیات ایسے مواقع پر ایک مشورہ دیتا ہے: اگر کسی مسئلے میں بار بار مزاحمت اور کوشش کے باوجود بھی کوئی پیشرفت نہ ہو رہی ہو، اور اس کوشش کا نتیجہ صرف ذہنی دباؤ، اضطراب، اور توانائی کا ضیاع ہو رہا ہو، تو بہتر یہی ہے کہ وقتی طور پر اس معاملے کو چھوڑ دیا جائے، اسے قبول کیا جائے، یا اس سے فاصلہ اختیار کیا جائے تاکہ اندرونی سکون بحال ہو، اور انسان خود کو تازہ دم کر سکے۔ اس نظریے کے مطابق، مزاحمت جب حد سے بڑھ جائے اور حل کی جگہ زخم پیدا کرنے لگے، تو وہ نفسیاتی نقصان کا باعث بنتی ہے۔

تاہم، اسلامی تعلیمات اس منظرنامے کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتی ہیں۔ دینِ اسلام انسانی زندگی کو صرف ذہنی سکون یا جذباتی توازن کی بنیاد پر نہیں دیکھتا بلکہ اس کا مرکز و محور حق اور باطل، عدل اور ظلم، اور ذمہ داری و فرار کی تمیز ہے۔ قرآن و سنت، اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ زندگی کے بعض موڑ ایسے بھی ہوتے ہیں جب خاموشی جرم اور پیچھے ہٹنا بزدلی بن جاتا ہے۔ دین میں ایسے حالات میں "دفاع" واجب قرار دیا گیا ہے، جہاں نہ صرف اپنی جان و مال کا تحفظ مطلوب ہے بلکہ ایمان، اقدار، عزت، مظلوموں، حرمِ الٰہی، اور اصولوں کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام

اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگیاں اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ حق کی راہ میں مزاحمت صرف ایک جذباتی ردعمل نہیں بلکہ ایک الٰہی فریضہ ہے، جو کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا، چاہے اس کے نتائج کتنے ہی شدید ہوں۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نفسیات مزاحمت نہ کرنے کی بات کرے اور دین دفاع کو واجب قرار دے، تو ایک صاحبِ ایمان انسان اس تضاد کا سامنا کیسے کرے؟ کیا یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کے مخالف ہیں یا ان کے درمیان کوئی ہم آہنگی ممکن ہے؟

دراصل، یہ تضاد ظاہری ہے، حقیقت میں ان دونوں نظریات کی نوعیت، دائرہ کار، اور مقصد مختلف ہے۔ علمِ نفسیات فرد کی باطنی حالت، جذباتی استحکام، اور ذہنی صحت کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ جب کوئی فرد کسی ذاتی تعلق، خواہش، یا ناکامی سے الجھ کر ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو نفسیات کہتی ہے کہ وہاں رک جانا، قبول کرنا، یا letting go کرنا صحت مند عمل ہے۔ یہ مزاحمت خود سے، کسی شخص سے، یا کسی صورتِ حال سے ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ انسان بزدل یا بے حس ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذہنی توانائی اور جذباتی توازن کو ضائع نہ کرے۔

دوسری طرف، دینِ اسلام کی "مزاحمت" اور "دفاع" کا تصور ایک انفرادی نفسیاتی سکون سے بلند ہو کر اجتماعی، اخلاقی اور الٰہی دائرے میں آتا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ صرف ذاتی ہو تو ممکن ہے کہ وہاں صبر، درگزر یا کنارہ کشی بہتر ہو، لیکن اگر مسئلہ حق و باطل، ظلم و عدل، یا دین و کفر کی لڑائی کا ہو تو دین خاموشی کو جرم شمار کرتا ہے۔ امام حسینؑ کا کربلا میں قیام صرف ایک سیاسی یا شخصی مزاحمت نہیں تھی بلکہ یہ مزاحمت ایک الٰہی امر، اخلاقی فریضہ اور دینی

بیداری کی آخری علامت تھی۔ اسی لیے علماء، مجاہدین، اور اہلِ دین جب "آخری سانس تک ڈٹے رہنے" کی بات کرتے ہیں، تو وہ صرف جذبات کی بات نہیں کرتے بلکہ اس استقامت کے پیچھے ایک فکری، روحانی اور شرعی بنیاد ہوتی ہے۔

پس یہ فرق سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ کب ایک مسئلہ صرف نفسیاتی دائرے میں ہے اور کب وہ دینی، اخلاقی اور اجتماعی دائرے میں آ چکا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ضد، انا یا غلط فہمی میں کسی مسئلے کو پکڑ کر بیٹھا ہو، اور وہ مسئلہ اس کی ذہنی تباہی کا باعث بن رہا ہو، تو نفسیاتی اصول اسے چھوڑنے کا مشورہ دیں گے، اور یہ مشورہ عین عقل و حکمت پر مبنی ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مظلوموں کے دفاع، باطل کے انکار، یا دین کے تحفظ کے لیے کھڑا ہے تو اس سے پیچھے ہٹنے کا مشورہ دینا گویا اس کی روحانی ذمہ داری سے فرار ہے، اور دین ایسے موقع پر استقامت اور قربانی کی تلقین کرتا ہے۔

اسلام کا مزاج توازن، بصیرت، اور حکمت پر مبنی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل دی تاکہ وہ فرق کر سکے۔ یہی فرق اصل بصیرت ہے: کب مزاحمت فائدہ مند ہے اور کب نقصان دہ۔ کب تسلیم عقلمندی ہے اور کب بزدلی۔ کب سکوت عبادت ہے اور کب گناہ۔ پس ایک باشعور انسان وہی ہے جو دین و نفسیات، عقل و جذبہ، مزاحمت و سکون، اور فریضہ و سہولت کے درمیان توازن کو سمجھے، اور ہر حالت میں وہ راستہ چنے جو اسے اپنی ذات کی اصلاح، معاشرے کی خدمت، اور اللہ کی رضا کے قریب لے جائے۔

یہی ہم آہنگی انسان کی نجات کی راہ ہے—نہ حد سے زیادہ ضد، نہ بے جا خاموشی؛ نہ ہر وقت کی لڑائی، نہ ہر وقت کی پسپائی؛ بلکہ حکمت، شعور، قربانی اور روحانی ذمہ داری کے ساتھ ہر

لمحے کو پہچاننا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ یہی وہ راہ ہے جو انسان کو صرف ذہنی سکون ہی نہیں بلکہ رضائے الٰہی، روحانی تکمیل، اور ابدی فلاح تک پہنچا سکتی ہے۔

عروج وزوال کے قانون اور مغربی معاشرہ

ہمارے معاشرے میں اکثر سننے کو ملتا ہے کہ قومیں فحاشی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ اس تصور کے خلاف بعض حلقوں کی طرف سے اعتراض سامنے آتا ہے کہ اگر واقعی ایسا ہوتا تو امریکہ اور یورپ، جو آج کے دور کی سب سے زیادہ فحاشی کو فروغ دینے والی طاقتیں ہیں، کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔ ان اعتراضات کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جاتا ہے: "اگر فحاشی سے قومیں تباہ ہوتیں تو سب سے پہلے امریکہ اور یورپ تباہ ہوتے۔" اس دلیل کو سوشل میڈیا پر خوب پذیرائی ملتی ہے، اور لوگ اسے "عقلی" اور "سائنسی" سمجھ کر مذہبی بیانیے کو پرکھنے کا ایک نیا پیمانہ تصور کرتے ہیں۔

لیکن اس اعتراض کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف حقیقت سے دور ہے بلکہ تباہی کے مفہوم کو بھی سطحی انداز میں سمجھنے کی غلطی پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ "تباہی" کا مطلب صرف ٹینکوں، میزائلوں، یا معیشت کے دیوالیہ ہونے تک محدود نہیں ہوتا۔ قرآن مجید اور تاریخِ انسانی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ قوموں کی تباہی صرف ظاہری زوال سے نہیں، بلکہ ان کے اخلاقی، روحانی، فکری، اور تمدنی نظام کے انہدام سے بھی ہوا کرتی ہے۔

قرآن میں حضرت لوطؑ کی قوم کا تذکرہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جب کوئی قوم حیا، عفت، فطری جنسی رویوں، اور خاندانی نظام سے کھلواڑ کرتی ہے، تو وہ صرف جسمانی گناہ نہیں کرتی

بلکہ اپنے معاشرے کی بنیادوں کو بھی کھوکھلا کر دیتی ہے۔ قوم لوط کی بربادی صرف ایک جنسی فعل پر مبنی نہیں تھی بلکہ وہ ایک مجموعی اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکی تھی جس کا نتیجہ قدرتی عذاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آج مغربی معاشرے، اگرچہ سائنسی، عسکری اور معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ نظر آتے ہیں، لیکن ان کا خاندانی نظام مکمل طور پر شکست خوردہ ہے۔ یورپ میں شادی کی شرح مسلسل کم ہو رہی ہے، طلاق کی شرح عروج پر ہے، غیر ازدواجی تعلقات عام ہو چکے ہیں، بچے بغیر والدین کے پرورش پا رہے ہیں، اور جنسی آزادی کے نام پر انسانی فطرت کا استحصال ہو رہا ہے۔ مغرب میں بڑھتی ہوئی ذہنی بیماریوں، ڈپریشن، خودکشیوں، اور تنہائی کا گراف اس روحانی تباہی کا واضح ثبوت ہے جسے میڈیا اور ٹیکنالوجی کی چمک دمک چھپا نہیں سکتی۔

تباہی کا ایک اور اہم پہلو ظلم اور ناانصافی ہے۔ اسلام کی نظر میں ظلم کسی بھی قوم کی ہلاکت کا اولین سبب ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم" یعنی حکومت کفر کے ساتھ تو قائم رہ سکتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ نہیں۔ اب اگر مغربی اقوام کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تمام تر ترقی نو آبادیاتی استحصال، جنگوں، خونریزی، اور دوسرے اقوام کی لوٹ مار پر قائم ہے۔ امریکہ اور یورپ نے افریقہ، ایشیا، اور مشرق وسطیٰ کے وسائل پر نہ صرف قبضہ کیا بلکہ ان کے معاشروں کو سیاسی، سماجی، اور ثقافتی طور پر بھی منتشر کیا۔ لاکھوں انسانوں کی جانوں کا ضیاع، غلامی کا نظام، نسلی امتیاز، مذہبی منافرت، اور وسائل کی چوری، سب کچھ ان "مہذب اقوام" کے جرائم کی فہرست میں شامل ہے۔

اسی طرح جدید دور کی ایک تباہ کن شکل "ماڈرن جہالت" ہے۔ یہ وہ جہالت ہے جو علم و فنون کے باوجود انسانی فطرت، روحانیت، اور مقصدِ حیات سے ناواقف رکھتی ہے۔ مغرب نے سائنس و ٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی، مگر انسان کو صرف ایک حیوانی وجود یا اقتصادی پرزہ سمجھا۔ تعلیم کو مادہ پرستی کی خدمت میں جھونک دیا، اور انسان کی روحانی بقا کو نظر انداز کیا۔ علم کو نور بنانے کی بجائے وہ اسے حرص و ہوس کا آلہ بنا بیٹھے۔ ایسے معاشرے جہاں انسان کو اپنی روحانی، اخلاقی، اور فطری حیثیت کا شعور نہ ہو، وہ خواہ کتنے ہی ترقی یافتہ ہوں، درحقیقت جہالت کے عمیق گڑھے میں گرے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مغرب میں سیاسی جھوٹ، دھوکہ دہی، اور معاشی فراڈ کو حکمتِ عملی کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ عوام کو میڈیا، اشتہارات، اور نظامِ تعلیم کے ذریعے مصنوعی خوشیوں، جھوٹے خوابوں، اور لذتوں میں الجھا دیا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے انسانیت کے سارے معیار بدل ڈالے ہیں۔ اب خیر و شر کا پیمانہ "منافع" بن چکا ہے۔ دولت کی دوڑ، منافقت پر مبنی تعلقات، ماحولیاتی تباہی، اور وسائل کی ناہموار تقسیم، سب اس جدید تمدن کی علامات ہیں، جو اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔

لہذا یہ کہنا کہ امریکہ اور یورپ "تباہ نہیں ہوئے"، ایک سطحی سوچ کا نتیجہ ہے۔ وہ تباہی جو ان کے تمدنی، اخلاقی، روحانی اور خاندانی نظام میں آ چکی ہے، وہ ظاہری بلڈنگز، سڑکیں، ٹیکنالوجی یا ڈالر کی شرحِ مبادلہ سے نہیں ناپی جا سکتی۔ وہ قومیں جنہوں نے اپنی انسانیت کھو دی ہو، جن کے دل سخت ہو چکے ہوں، جو سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق نہ کر سکیں، جو خواہشات کو خدا بنا لیں، وہ درحقیقت تباہ ہو چکی ہوتی ہیں، چاہے ان کی معیشت ترقی کی بلندیوں پر کیوں نہ ہو۔

لہذا یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ فحاشی، ظلم، جہالت، جھوٹ، اور ناانصافی، یہ سب آپس میں مربوط اسباب ہیں، جو ایک قوم کو تباہی کے گڑھے میں دھکیلتے ہیں۔ فحاشی ایک دروازہ ہے جس سے روحانی زوال شروع ہوتا ہے، اور جب قوم اس دروازے کو وسیع کرکے اپنے نظام کا حصہ بنالیتی ہے، تو پھر نہ صرف ان کا اخلاق، بلکہ ان کی تاریخ، تہذیب، اور خودشناسی بھی تباہ ہوجاتی ہے۔ مغرب اسی زوال کی مثال ہے، جس کی تباہی کا وقت قریب ہے، اگرچہ ان کے آسمان پر ابھی بھی کچھ دیر کے لیے روشنی باقی ہے۔

جب ہم مغربی معاشرے کو "اخلاقی زوال"، "روحانی تباہی" یا "مادّی حیوانیت" کا مظہر قرار دیتے ہیں تو پھر وہ روشن پہلو کیسے سامنے آتے ہیں جن میں فلسطین کے حق میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں، یا کہیں انسان دوستی، جانوروں کے حقوق، ماحولیاتی تحفظ، اقلیتوں کے لیے آواز اٹھانے کا جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے؟ کیا مغربی معاشرہ دو چہروں کا حامل ہے؟ اور اگر ہاں، تو ان دونوں رخوں کے درمیان تناسب کیسا ہے؟ اس مخمصے کو سمجھنے کے لیے ہمیں تہذیبی، فکری، اور روحانی گہرائیوں میں جانا ہوگا۔

پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ کوئی بھی معاشرہ یک رنگ نہیں ہوتا۔ ہر تمدن کے اندر خیر و شر، روشنی و تاریکی، ہدایت و گمراہی کے عناصر کسی نہ کسی سطح پر موجود ہوتے ہیں۔ مغربی معاشرے کی بھی یہی حقیقت ہے کہ وہاں صرف حیوانیت یا صرف انسانیت نہیں، بلکہ ایک پیچیدہ امتزاج ہے۔ اگر ایک طرف وہ سرمایہ دارانہ نظام، جنسی انحراف، استعماری ذہنیت، مادہ پرستی اور روحانی خلا کا گڑھ ہیں، تو دوسری طرف اسی زمین پر ایسے افراد، تحریکیں اور گروہ بھی موجود ہیں جو عدل، امن، آزادی، انسانیت، اور سچائی کے علمبردار بن کر سامنے

آتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ دین سے دور سہی، لیکن فطری ضمیر اور فطری ہدایت کے تحت ظلم کے خلاف بولنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

فلسطین کے حق میں ہونے والے مظاہرے، جن میں لاکھوں مغربی باشندے شامل ہوئے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسانی ضمیر مر نہیں گیا۔ میڈیا اور ریاستی دباؤ کے باوجود جن لوگوں نے اسرائیل کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، وہ مغربی نظام کے خلاف مزاحمت کی ایک فطری لہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی جرأت، فہم، اور اخلاقی بصیرت یقینی طور پر قابلِ تحسین ہے۔ تاہم یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ افراد اور گروہ مغربی نظام کے نمائندہ نہیں بلکہ اکثر اوقات اُس نظام کے خلاف مزاحم ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مغرب کی ریاستی پالیسیوں، صیہونی حمایت، اور میڈیا کے جھوٹ کے برخلاف کھڑے ہوتے ہیں۔ یوں یہ مغرب کے اندر ایک "ضمیر کی اقلیت" ہیں، جو اندھیرے میں ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی کی مانند ہیں۔

اب اگر تناسب کی بات کی جائے تو یہ انسانی ضمیر پر مبنی اقلیت یقیناً موجود ہے مگر وہ غالب طبقہ نہیں۔ مغربی معاشروں کی اکثریت یا تو مصلحت پسند ہے، یا پھر مکمل طور پر میڈیا اور ثقافتی نظام کی ذہن سازی کا شکار ہے۔ ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو سیاسی طور پر بے حس، معاشی مفادات میں الجھی ہوئی، یا ذاتی آزادی کو سب کچھ سمجھنے والی ہے۔ ظلم ان کے سامنے ہو یا کسی اور پر، وہ خاموش رہنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ گویا ایک طرف انفرادی سطح پر روشنی کے جگنو ضرور ہیں، لیکن اجتماعی سطح پر وہی حیوانیت، خودغرضی، اور روحانی پستی حاوی ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ مغرب کی انسان دوستی اکثر "فریم شدہ" اور مخصوص دائرے میں بند ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جانوروں کے حقوق پر سینکڑوں قوانین اور تنظیمیں کام کرتی ہیں، لیکن انہی معاشروں میں بچوں کی ماں کے بغیر پرورش، خاندانی نظام کا زوال، یا اخلاقی حدود کی پامالی پر کوئی سوال نہیں اٹھاتا۔ یہ وہ "selective morality" ہے جو کسی الٰہی ہدایت پر نہیں بلکہ خواہشات، مفادات، اور جذباتی رجحانات پر مبنی ہے۔ اس طرح کی انسان دوستی کا معیار ناپائیدار اور متغیر ہوتا ہے، جو اصل میں ایک داخلی خلا اور مذہب سے بے گانگی کا نتیجہ ہے۔

لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ مغربی معاشرہ ایک ایسے میدان کی مانند ہے جہاں روشنی کے کچھ قطعات تاریکی کے وسیع دائرے میں موجود ہیں۔ وہ اقلیت جو مظلوموں کے لیے آوز اٹھاتی ہے، وہ فطرتِ انسانی کی بقا کا نشان ہے، لیکن وہ غالب تمدنی بیانیے کو تبدیل کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔ اکثریت جس سمت میں جا رہی ہے، وہ حیوانی جبلتوں، منافع پرستی، ثقافتی غلبے، اور روحانیت سے بیزاری کی طرف ہے۔

مغربی معاشرے کی اس دورنگی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے ایک تہذیب کی حیثیت سے دیکھیں نہ کہ صرف انفرادی شخصیات کے نیک و بد رویوں کی بنیاد پر۔ انسان دوستی کے مظاہر کو خوش آئند مانتے ہوئے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کا اصول ہے " : ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسیھم انفسھم — "جو لوگ اللہ کو بھول جاتے ہیں، اللہ ان کو خود ان کے آپ سے غافل کر دیتا ہے۔ مغرب کی اکثریتی تہذیب اسی غفلت

کا شکار ہے۔ اور یہ غفلت کسی بھی قوم کے روحانی و اخلاقی زوال کا پیش خیمہ ہوتی ہے، چاہے اس کے درمیان کچھ نیک نفوس کتنی ہی شدت سے سچ کے حق میں کیوں نہ کھڑے ہوں۔

... مغرب میں جو انسان دوستی اور عدل پسندی کے مظاہر نظر آتے ہیں، وہ پورے معاشرے کی غالب شناخت نہیں بلکہ ایک اقلیتی مگر موئثر طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو تعلیمی اداروں، سول سوسائٹی، غیر سرکاری تنظیموں، یا انفرادی ضمیر کی بیداری کے تحت بولتے ہیں۔ ان کی تعداد لاکھوں میں ضرور ہو سکتی ہے، لیکن اربوں کی آبادی کے مقابلے میں یہ تناسب بہت کم ہے۔

دوسری طرف، جو طبقہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کا محافظ ہے، جو میڈیا، معیشت، سیاست اور ٹیکنالوجی کے ذریعے عالمی بیانیہ کنٹرول کرتا ہے، وہی طبقہ دراصل مغربی تہذیب کی حقیقی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ طبقہ ظلم، فحاشی، مادہ پرستی، اور روحانی خلا کو نہ صرف فروغ دیتا ہے بلکہ اسے جدید "آزادی" اور "ترقی" کے عنوان سے پھیلانے کا ذمہ دار بھی ہے۔ وہ افراد اور تحریکیں جو فطری ضمیر کی بنیاد پر ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، وہ اس سسٹم سے بغاوت کی علامت ہوتے ہیں، نہ کہ اس نظام کا مظہر۔

یہاں ہمیں امام خمینیؒ کی ایک مشہور بات یاد آتی ہے کہ" :ہماری جنگ مشرق و مغرب سے نہیں، بلکہ ظلم اور عدل کے درمیان ہے۔ "مغرب کے وہ افراد جو عدل کے لیے کھڑے ہیں، وہ ہمارے فکری حلیف ہو سکتے ہیں، اگرچہ دینی لحاظ سے وہ ابھی ہدایت سے محروم ہوں۔ جبکہ مغرب کے وہ عناصر جو ظلم، استعمار، اور روحانی زوال کے پروردہ ہیں، وہ اس "تباہی" کا اصل چہرہ ہیں جس کا قرآن اور سنت میں ذکر آیا ہے۔

لہٰذا مغربی معاشرے کے دو چہرے ہیں: ایک "نظامی چہرہ" ہے جو طاقت، مفاد، اور حرص کا نمائندہ ہے، اور دوسرا "ضمیری چہرہ" ہے جو فطرت، ہمدردی، اور سچائی کا مظہر ہے۔ یہ دوسرا چہرہ اقلیت میں ہے، لیکن اس کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی فطرت مکمل طور پر فنا نہیں ہوئی۔ تاہم، جب ہم کسی قوم یا تہذیب کے انجام کو دیکھتے ہیں تو وہ انجام ہمیشہ اس طبقے کے اعمال پر ہوتا ہے جو طاقت اور نظام کی باگ ڈور سنبھالے ہوتا ہے، نہ کہ ان پر جو حق کے متلاشی ہوں لیکن اختیار سے محروم ہوں۔

پس، یہ پیچیدہ حقیقت ہمیں سکھاتی ہے کہ مغرب ایک مخلوط تمدن ہے، جس میں فکری، اخلاقی، اور روحانی سطح پر کئی پرتیں ہیں۔ ایک تہذیب کا مکمل تجزیہ صرف اس کی ظاہری ترقی یا جزوی خیرات کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے نظام، اقدار، مقاصد، اور تاریخ کو سامنے رکھ کر ہی اس کے اصل رخ کو پہچانا جا سکتا ہے۔ مغرب کی موجودہ تہذیب، اپنی اکثریتی ساخت اور نظامی رجحانات کے اعتبار سے، بلاشبہ اس زوال کی طرف گامزن ہے جس کا انتباہ انبیاء نے ہمیشہ دیا ہے، اور جس کا آغاز فحاشی، ظلم، اور روحانی بے سمتی سے ہوتا ہے۔

شیطان کا نیکیوں کو نیکیوں کے ذریعے روکنے کا حربہ

شیطان کی چالاکیوں میں سب سے پیچیدہ اور خطرناک چال یہ ہے کہ وہ نیکی کو نیکی کے ذریعے روکتا ہے۔ وہ براہ راست برائی کی طرف دعوت نہیں دیتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایک مومن یا دیندار انسان کھلی برائی کو فوراً رد کر دے گا۔ اس لیے وہ نیکی کی ایسی صورت کو سامنے لاتا ہے جو بظاہر پاکیزہ اور متقی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کا باطن دین کے اصل مقصد سے خالی ہوتا ہے۔ وہ ان اعمال کو فروغ دیتا ہے جو فرد کو ذاتی نیکی کے دھوکے میں مبتلا رکھتے ہیں، لیکن معاشرے کی سطح پر ظالم وطاغوتی نظام کو جوں کا توں رہنے دیتے ہیں۔ شیطان ان اعمال کی مخالفت کرتا ہے جو نظام شکن ہوں، جو طاغوتی ڈھانچوں کو ہلانے والے ہوں، جو انسان کو خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنے سے روکتے ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں جب وہ اپنے بیٹے کی قربانی کے لیے جارہے تھے، شیطان ایک نہایت بزرگ اور متقی انسان کی صورت میں ان کے سامنے آیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ابراہیمؑ کو ایک نیکی کے ذریعے بڑی نیکی سے باز رکھے۔ وہ انہیں قربانی جیسے عظیم ترین عمل سے روکنے کے لیے نرمی، اخلاق اور تقویٰ کی زبان استعمال کرتا ہے، تاکہ وہ ابراہیمؑ کو اس قربانی سے ہٹا سکے جو انسانیت کی تاریخ کا سب سے اہم اور انقلابی لمحہ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان صرف فحاشی یا جھوٹ کے ذریعے نہیں بہکاتا بلکہ بعض اوقات

عبادت، ذکر، خیرات، اور ظاہری تقویٰ جیسے اعمال کو بھی استعمال کرتا ہے تاکہ اصل دین سے ہٹایا جا سکے۔

آج کے دور میں شیطان کا سب سے مؤثر ہتھیار "مذہب" بن چکا ہے — وہ مذہب جو صرف رسوم و رواج کا مجموعہ ہے، جو نماز، روزہ، حج، اور عزاداری جیسے اعمال کو انجام تو دیتا ہے لیکن ان میں روح اور معرفت نہیں ہوتی، ان کا تعلق کسی انقلابی سوچ سے نہیں ہوتا، نہ ہی وہ انسان کو طاغوتی سسٹم سے ٹکرانے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ یہ مذہب صرف ذاتی نجات کا پیغام دیتا ہے، سماجی یا سیاسی بیداری نہیں پیدا کرتا۔ دین کا اصل پیغام تو یہ ہے کہ فرد کو ایک ایسے سسٹم سے جوڑا جائے جو عدل، توحید، مساوات، اور بندگی پر قائم ہو۔ دین فرد اور معاشرے دونوں کی اصلاح چاہتا ہے، لیکن جب دین کو صرف مذہب میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو طاغوت کے لیے آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی حکومت جاری رکھے۔

اسی لیے شیطان ان چھوٹی نیکیوں کو عام کرتا ہے جن سے فرد کو ایک جھوٹی تسلی ملتی ہے کہ وہ نیک ہے، جب کہ وہ حقیقت میں طاغوتی نظام کی بقاء کا غیر محسوس حصہ بن جاتا ہے۔ وہ نیکی جو فرد کو بیدار نہ کرے، جو ظالم کے خلاف کھڑا نہ کرے، جو معاشرتی ناہمواری پر خاموش رہے، جو ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کرے — وہ نیکی نہیں بلکہ ایک جمود ہے، ایک پردہ ہے جو اصل مقصد سے غفلت میں رکھتا ہے۔

عزاداری بھی اس چال کا شکار بن سکتی ہے اگر اسے صرف چند روایتی مجالس، ماتم، اور نوحہ خوانی تک محدود رکھا جائے، اور اس کے اندر وہ انقلابی روح شامل نہ ہو جو امام حسین علیہ السلام کا اصل پیغام تھا۔ امام حسینؑ کا قیام محض اشک بہانے کے لیے نہ تھا بلکہ ایک طاغوتی

سسٹم کے خلاف مکمل بغاوت تھی۔ اگر ہماری عزاداری ہمیں ظلم، کرپشن، استعمار، اور استکبار کے خلاف نہ کھڑا کرے، تو ہم نے اسے صرف ایک مذہبی رسم بنا دیا ہے، نہ کہ دین کا زندہ شعور۔

شیطان کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ انسان کو دین کے اصل جوہر سے دور کر دے اور اسے مذہب کے پردے میں جکڑ کر رکھے۔ ایسے میں انسان خود کو نیک سمجھتا ہے، مگر وہ نیکی طاغوت کو چیلنج کرنے کے بجائے اس کے ساتھ سمجھوتے پر مبنی ہوتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نیکی اور عبادت کو صرف ذاتی روحانیت کے بجائے اجتماعی بیداری، شعور، اور انقلابی جدوجہد کا ذریعہ بنائیں، تاکہ ہمارا دین محض مذہب نہ رہ جائے، بلکہ ایک زندہ اور بیدار نظام بنے جو شیطان کی ہر چال کو ناکام بنا سکے۔

اسلامی تاریخ میں شیطان کے فریب اور چالاکی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جہاں اس نے دین کو مذہب کی سطح تک محدود کر کے اصل روح کو بے اثر کرنے کی کوشش کی۔ اس کی سب سے بڑی چال یہی رہی ہے کہ وہ دین کے نام پر ہی دین کو کمزور کرے، اور وہ نیکی کے پردے میں ہی گمراہی پھیلائے۔

سب سے واضح مثال جنگ صفین کی ہے، شیطان نے اپنے فریب سے ایسا ماحول پیدا کیا کہ دشمن کی فوج نے نیزوں پر قرآن بلند کر دیے۔ اس ظاہری مذہبی علامت نے کچھ افراد کے دلوں کو ہلا دیا، اور انہوں نے حضرت علیؑ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ جنگ روک دی جائے کیونکہ اب سامنے قرآن ہے۔ یہ قرآن حقیقی معنی میں نہیں، بلکہ صرف ایک بہانہ تھا تاکہ حق کو روکا جا سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ "یہ قرآن بولتا نہیں، ان نیزوں کے پیچھے

باطل ہے"، لیکن لوگ مذہب کے ظاہر میں بہک گئے اور وہ حق کی مکمل فتح سے محروم رہ گئے۔

اسی طرح کربلا کا واقعہ بھی شیطان کے اسی فریب کا تسلسل ہے۔ یزید نے دین کے نام پر حکومت قائم کی تھی، نماز بھی ہوتی تھی، حج بھی جاری تھا، اور ظاہری مذہب پوری طرح سے قائم تھا، لیکن اندر سے پورا نظام ظلم، فسق، فحاشی، اور طاغوتیت پر مبنی تھا۔ کوفہ کے لوگ جو نماز پڑھتے تھے، جنہوں نے خطبے سنے تھے، جو دین کا نام لیتے تھے، وہی لوگ امام حسینؑ کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ امن اور ریاست کی حفاظت، دین کی اصل خدمت ہے، اور امام حسینؑ کی تحریک فتنے کا باعث ہے۔ اس طرح مذہب کے ذریعے دین کی روح کا گلا گھونٹا گیا۔

عباسی دور میں جب خلافت کو ایک ظاہری دینی شکل دی گئی، تو وہاں بھی شیطان نے یہی حربہ استعمال کیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں جب علمی اور فکری بیداری کی فضا پیدا ہوئی، تو عباسی خلفاء نے دین کو فقہی اختلافات، عبادات کی بحثوں اور علمی مباحث تک محدود کر دیا تاکہ کوئی سسٹم، طاقت یا عوامی شعور ان کے ظلم پر سوال نہ اٹھائے۔ دین کو علم کے قید خانے میں بند کر دیا گیا، تاکہ وہ سماجی و سیاسی میدان میں متحرک نہ ہو سکے۔

تاریخ کے کئی اور موڑوں پر بھی یہی دیکھا گیا کہ جب کبھی بھی کسی انقلابی تحریک نے دین کی اصل روح کے ساتھ نظام کو چیلنج کرنا چاہا، شیطان نے یا تو لوگوں کو ذاتی عبادات میں الجھا دیا، یا ایسی مذہبی قیادت کو فروغ دیا جو سسٹم پر تنقید کے بجائے صرف ظاہری اخلاقیات کی تعلیم دیتی تھی۔

معاصر تاریخ میں بھی شیطان کے فریب کا یہی سلسلہ جاری رہا ہے، جہاں اس نے دین کے مقدس نام کو استعمال کرتے ہوئے طاغوتی نظام کی جڑیں مضبوط کیں، اور عوام کو ایسے مذہبی فریم ورک میں قید رکھا جو نظام کے خلاف قیام کی جرأت نہ پیدا کر سکے۔ شیطان نے عبادات، اخلاقیات اور رسوم کو اس طرح پیش کیا کہ لوگ انہی کو دین کا کُل سمجھ بیٹھے، اور یوں اصل دین یعنی نظامِ عدل، ظلم کے خلاف جہاد، اور ولایتِ حقہ کی اطاعت کو نظر انداز کر دیا۔

ایک نمایاں مثال سعودی عرب کا نظام ہے، جہاں قرآن اور سنت کا نام لے کر ایک ایسا نظام قائم کیا گیا جو مکمل طور پر استکباری طاقتوں سے جڑا ہوا ہے۔ وہاں نماز، روزہ حج سب کچھ ہے، مذہبی پولیس ہے، شرعی عدالتیں ہیں، لیکن یہ سب اس وقت بے معنی ہو جاتے ہیں جب نظامِ حکومت امریکہ اور صیہونی طاقتوں کا حلیف بن جائے، فلسطینی مظلوموں کے خلاف خاموشی اختیار کرے، اور اپنے ملک میں سیاسی شعور اور فکری بیداری کو دبائے۔ شیطان نے وہاں مذہب کو دین کے مقابل کھڑا کر دیا ہے، تاکہ لوگ حکمرانوں کے ظلم کے خلاف اٹھنے کے بجائے خاموش رہیں، اور ظاہری عبادات کو کافی سمجھیں۔

پاکستان میں بھی ایک طویل عرصے تک مذہب کو محض رسوم و رواج، میلاد، محفل، ذکر، اور جمعہ کے خطبے تک محدود رکھا گیا، جبکہ سیاست، معیشت، تعلیم، اور میڈیا جیسے شعبے مغربی فکر اور طاغوتی نظام کے تحت پروان چڑھتے رہے۔ مذہبی حلقوں کو تعزیتی مجالس، ذکر و نعت، اور صوفیانہ مشغولیات میں مصروف رکھا گیا تاکہ وہ کبھی تعلیمی نصاب، عدالتی نظام، کرپشن، یا استعماری غلامی کے خلاف موثر آواز نہ اٹھا سکیں۔ نتیجتاً عوام کے ذہنوں میں یہ

تصور راسخ ہو گیا کہ دین صرف ذاتی اصلاح کا نام ہے، اجتماعی جدوجہد اور نظام کی تبدیلی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

ایران کی اسلامی تحریک اس فریب کی سب سے بڑی توڑ ہے۔ امام خمینیؒ نے یہی فرمایا تھا کہ "اسلام نماز، روزہ، حج اور زکات تک محدود نہیں، بلکہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جس میں ظالم حکمرانوں کے خلاف قیام بھی عبادت ہے۔" انہوں نے واضح کیا کہ جب تک دین طاغوت شکن نہ ہو، وہ شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے اسلامی انقلاب کو روکنے کیلئے عالمی استکبار نے نہ صرف عسکری و معاشی ہتھکنڈے استعمال کیے بلکہ فکری جنگ بھی چھیڑی، تاکہ لوگوں کو دین کے انقلابی پہلو سے غافل رکھا جائے۔

افغانستان میں بھی ایک وقت میں دینی جہاد کو امریکہ اور سعودی عرب نے اپنی مرضی سے استعمال کیا، اور جب سوویت یونین کے خلاف جہاد ختم ہوا، تو عوام کو پھر سے ایک ایسے مذہب کی طرف دھکیل دیا گیا جس میں تعلیم، تعمیر، اور خودمختاری کا کوئی تصور نہ تھا، بلکہ شدت پسندی، فرقہ واریت، اور طاغوتی مفادات کے تحفظ کا ایک آلہ بن گیا۔

معاصر دنیا میں شیطان نے "سیکولر مذہب" کا تصور بھی پیدا کیا ہے، جس میں مذہب کو بالکل نجی زندگی تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ مغربی معاشرے اس کا واضح نمونہ ہیں، جہاں مذہب کا نام تو موجود ہے، لیکن وہ ریاست، معیشت، تعلیم، اور قانون سازی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔ یہاں بھی شیطان نے یہ تاثر دیا کہ اگر کوئی اپنی ذاتی زندگی میں اچھا ہے، تو وہ کافی ہے، حالانکہ دین کا تقاضا ہے کہ انسان ظلم اور باطل نظام کے خلاف قیام کرے۔

یہ سب مثالیں اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ شیطان صرف برائی کے ذریعے گمراہ نہیں کرتا، بلکہ نیکی کے پردے میں، مذہب کے لبادے میں، عبادات کے ذریعے دین کی اصل روح کو مٹا دیتا ہے، تاکہ طاغوتی نظام بے خوف و خطر قائم رہ سکے۔ نجات انفرادی عبادات میں محدود نہیں، بلکہ اجتماعی شعور، ظلم کے خلاف قیام، اور دینِ کامل کی بالادستی کی جدوجہد میں ہے۔ یہی شیطان کا سب سے کامیاب ہتھیار رہا ہے کہ وہ نیکی کو اس حد تک محدود کر دیتا ہے کہ وہ کسی تبدیلی، کسی قیام، کسی اصلاح اور کسی انکارِ طاغوت کا سبب نہ بن سکے۔ دین کو مسجد اور مدرسے تک محدود کر دیا جاتا ہے، تاکہ بازار، حکومت، تعلیم، اور معیشت جیسے اہم میدانوں میں طاغوت بلا روک ٹوک اپنا اثر قائم رکھے۔ ان تمام مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب تک انسان نیکی کی اصل روح کو نہ پہچانے، اور اسے ظلم شکن و نظام ساز نہ بنائے، وہ شیطان کے ان پوشیدہ فریبوں سے بچ نہیں سکتا، چاہے وہ بظاہر جتنا بھی دیندار کیوں نہ ہو۔

دین و مذہب انفرادی و ذاتی معاملہ نہیں ہے

انسانی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی سیرت کی تعمیر صرف انفرادی کوششوں سے وابستہ نہیں بلکہ اس کا گہرا تعلق اُس ماحول، معاشرے اور روابط سے بھی ہے جن میں انسان رہتا ہے۔ اسی بنیاد پر "خود نگہداشت (self-care) " صرف ایک انفرادی عمل نہیں بلکہ ایک سماجی و اخلاقی فریضہ بن جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی ذہنی، جسمانی اور روحانی صحت کا خیال رکھتا ہے تو اس کا فائدہ صرف اسے نہیں بلکہ اس کے قریبی افراد، اہلِ خانہ، دوستوں، حتیٰ کہ معاشرے کے بڑے دائرے کو بھی ہوتا ہے۔ وہ انسان اپنی بہتر، متوازن اور پر اثر شخصیت کے ذریعے دوسروں پر مثبت اثر ڈالنے کے قابل ہوتا ہے۔ کوئی فرد، خواہ وہ کتنا ہی تنہائی پسند کیوں نہ ہو، مکمل طور پر معاشرے سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ سانس بھی لیتا ہے تو اس کی آواز کسی نہ کسی کے دل میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ اسی تناظر میں "خود نگہداشت" یا self-care کو صرف ایک نجی، انفرادی عمل سمجھنا ایک سادہ لوحی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اپنی ذات پر کی جانے والی محنت، چاہے وہ جسمانی ہو، ذہنی ہو یا روحانی، وہ اس کی اپنی ذات سے کہیں آگے جا کر اثر انداز ہوتی ہے۔ انسان جب اپنے خیالات کو سنوارتا ہے، اپنے جذبات کو متوازن کرتا ہے، اپنی روح کو جِلا بخشتا ہے، تو وہ صرف اپنے لیے بہتر نہیں ہوتا بلکہ اپنے ارد گرد کی دنیا کو بھی روشنی دیتا ہے۔

علمِ نفسیات کی رو سے انسان ایک "سماجی مخلوق" ہے۔ اس کا رویہ، مزاج اور افعال نہ صرف اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ دوسرے افراد پر بھی گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ ایک شخص اگر ذہنی دباؤ، الجھن، یا نفسیاتی عدم توازن کا شکار ہو، تو اس کی بات چیت، فیصلہ سازی، اور ردعمل کا انداز بھی متاثر ہوتا ہے، جو ارد گرد کے افراد پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہی شخص خود کو سنبھالے، اپنی جذباتی حالت کو سنوارے، اور روحانی طور پر خود کو سنوارتا رہے تو وہ نہ صرف خود بہتر زندگی گزارے گا بلکہ ایک پرامن اور صحت مند سماجی فضا پیدا کرے گا۔ علم نفسیات اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایک متوازن اور جذباتی طور پر مستحکم فرد نہ صرف اپنے فیصلوں میں بہتر ہوتا ہے بلکہ وہ دوسروں کی بات سننے، ان کے احساسات سمجھنے، اور اُن کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسا شخص اپنی باتوں اور خاموشیوں سے، اپنے عمل اور طرزِ زندگی سے، دوسروں پر وہ اثر ڈال سکتا ہے جو صرف کتابیں یا نصیحتیں نہیں ڈال سکتیں۔ دوسری طرف، ایک الجھا ہوا، تھکا ہارا، یا خود سے غافل شخص صرف اپنے مسائل کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے اہلِ خانہ، دوستوں، ساتھیوں، اور حتیٰ کہ اپنے شاگردوں یا پیروکاروں کے لیے بھی اذیت کا سبب بن سکتا ہے۔ اُس کی عدم توجہ، چڑچڑاپن، بے ربط باتیں یا غیر متوازن رویے دوسرے دلوں میں اضطراب پیدا کرتے ہیں۔

علمِ سماجیات بھی اس نکتہ کو اجاگر کرتا ہے کہ کوئی بھی انسانی فعل مکمل طور پر نجی یا ذاتی نہیں ہوتا۔ ہر عمل، چاہے وہ قول ہو یا فعل، کسی نہ کسی سطح پر معاشرتی اثرات رکھتا ہے۔ جب کسی فرد کا رویہ غیر اخلاقی، غیر ذمہ دارانہ یا دین سے دوری پر مبنی ہو، تو اس کے اثرات صرف

اس کی ذات تک محدود نہیں رہتے۔ بچے، نوجوان، یا دوسرے متاثر ہونے والے افراد غیر شعوری طور پر اس رویے کو سیکھتے اور اپناتے ہیں، جس سے ایک منفی سلسلہ وجود میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام، بالخصوص مکتبِ تشیع، فرد کو تنہا مخاطب نہیں کرتا بلکہ اسے معاشرے کے ایک ذمہ دار رکن کے طور پر دیکھتا ہے۔ علم سماجیات میں اس پہلو کو "اجتماعی اثرات" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ ہر شخص اپنے ماحول میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس سے جُڑے افراد اس کے خیالات، طرزِ عمل، اور طرزِ زندگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر ہم دین کے تناظر میں بات کریں تو اسلام، بالخصوص مکتبِ اہل بیتؑ، اس تصور کو نہایت سنجیدگی سے بیان کرتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ "کونولنا زیناً ولا تکونو علینا شیناً" یعنی ہمارے لیے زینت بنو، باعثِ ننگ نہ بنو۔ یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ایک مؤمن کا کردار، لباس، اخلاق، طرزِ گفتار اور حتیٰ کہ خاموشی بھی دینِ اسلام کا تعارف بن سکتی ہے۔ پس اگر ہم دینی اقدار سے غافل ہوں، تو صرف اپنا نقصان نہیں کر رہے بلکہ اہلِ بیتؑ کے پیغام اور تشیع کی ساکھ کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔

یہ تصور کہ دین یا مذہب ایک نجی معاملہ ہے، جدید مغربی لبرل فلسفے کا گمراہ کن تسلسل ہے جو فرد کو اجتماعی ذمہ داریوں سے علیحدہ کر کے صرف ذاتی آزادی تک محدود کر دیتا ہے۔ جبکہ اسلامی فکر میں انسان کا ہر عمل ایک امانت ہے، ایک ذمہ داری ہے، اور ایک پیغام ہے جو وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو دے رہا ہے۔ نماز اور روزہ کو صرف ذاتی عبادت یا فردی

روحانی ریاضت سمجھنا ایک محدود تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان عبادات کے معاشرتی اثرات نہایت گہرے اور مثبت ہوتے ہیں۔ نماز انسان کو وقت کی پابندی، عاجزی، اور پاکیزگی کا عادی بناتی ہے، جو اسے دوسروں کے حقوق کا احترام سکھاتی ہے۔ یہ صرف بندے اور خدا کے درمیان ایک رابطہ نہیں، بلکہ یہ روزانہ کی بنیاد پر وقت کی پابندی، صف بندی، اجتماعیت، اور نظم و ضبط کی مشق ہے، جو انسان کو فردیت سے نکال کر اجتماعی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ روزہ انسان کو بھوک اور پیاس کے ذریعے دوسروں کی تکلیف کا احساس دلاتا ہے، جس سے وہ معاشرے میں ہمدرد اور مددگار کردار ادا کرنے کے قابل بنتا ہے۔ یہ خواہشات پر قابو، صبر، دوسروں کی بھوک کا احساس، اور طبقاتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک واجب عمل ہے جو معاشرتی رحم دلی، کفایت شعاری، اور ذمہ داری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ **حجاب** اور نگاہ نیچی رکھنے جیسے احکامات، جنہیں کبھی کبھی صرف انفرادی عبادات سمجھا جاتا ہے، دراصل معاشرتی پاکیزگی، عزتِ نفس، اور بے راہ روی سے تحفظ کا ذریعہ ہیں جو پورے معاشرے کو اخلاقی انحطاط سے بچاتے ہیں۔ حجاب اور داڑھی کے احکام اگرچہ ظاہری عبادات کی صورت میں نظر آتے ہیں، مگر ان کے نفسیاتی اور سماجی اثرات نہایت گہرے اور بامعنی ہوتے ہیں۔ حجاب صرف جسم کی پردہ پوشی نہیں، بلکہ یہ ایک عورت کی خودمختاری، خود شعوری اور اپنے جسم کی حرمت کے بارے میں واضح پیغام ہے۔ نفسیاتی طور پر حجاب عورت کو اپنی شناخت اور اقدار کی بنیاد پر جینے کا اعتماد دیتا ہے۔ یہ اسے دوسروں کی نظروں میں ایک جسم کے بجائے ایک شخصیت، ایک عقل مند انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ حجاب عورت کو غیر ضروری جنسی نظروں سے محفوظ رکھ کر ذہنی سکون عطا کرتا ہے اور اسے معاشرے میں اپنے کردار کو محفوظ، پُر اعتماد اور مثبت طریقے

سے ادا کرنے کا موقع دیتا ہے۔ حجاب عورت کی اندرونی طاقت کو بیدار کرتا ہے کہ وہ اپنی عزت خود متعین کرے نہ کہ دوسروں کی نظروں سے اپنی قدر و قیمت ناپے۔

اسی طرح داڑھی بھی صرف چہرے کے بال نہیں، بلکہ ایک مرد کی دینی شناخت اور اس کی اصولی وابستگی کا اظہار ہے۔ نفسیاتی طور پر داڑھی انسان کو اپنی اصل، اپنی فطرت اور اپنے مقصد کی یاد دلاتی ہے۔ یہ خود کو یاد دہانی ہے کہ میں کسی بڑے مقصد کا نمائندہ ہوں۔ یہ اعتماد اور یکسوئی پیدا کرتی ہے کہ انسان اپنے عقیدے سے وابستہ ہے، چاہے معاشرہ کسی اور سمت جا رہا ہو۔ سماجی اعتبار سے داڑھی وقار، سنجیدگی اور فکری گہرائی کی علامت بنتی ہے، اور فرد کو اس کی شخصیت میں گہرائی اور وزن عطا کرتی ہے۔ داڑھی رکھنے والا مرد خود کو ایک ذمہ دار، دین دار، اور روایات سے جڑا ہوا انسان محسوس کرتا ہے، جو دوسروں کے لیے ایک رول ماڈل بن سکتا ہے۔

یہ ظاہری علامات اپنے اندر ایک خاموش مگر پُر اثر پیغام رکھتی ہیں: کہ انسان نے اپنے نفس پر قابو پا لیا ہے، وہ اپنی ظاہری و باطنی دنیا کا مالک ہے، اور وہ دوسروں کی خواہشات یا معاشرتی دباؤ کے بجائے، اپنے رب کے احکام کو مقدم رکھتا ہے۔ یہ خود احتسابی، ضبط نفس، اور اصول پسندی کے وہ مظاہر ہیں جن سے ایک پاکیزہ، متوازن اور پُر امن معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

ان عبادات کا اصل مقصد صرف خدا سے قرب حاصل کرنا نہیں، بلکہ ایک ایسا انسان بنانا ہے جو سماج میں عدل، امانت، خیر خواہی اور خدمت کا پیکر ہو۔ اسلام کے یہ تمام واجب احکام اپنے ظاہر میں انفرادی ہو سکتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اجتماعی زندگی کی اصلاح اور ایک عادلانہ و متوازن معاشرے کی تشکیل کا نہایت گہرا، مربوط اور حکیمانہ نظام پیش کرتے

ہیں۔ یہی دین کی روح ہے کہ فرد کی تربیت کے ذریعے معاشرہ سنوارا جائے، اور یہی وہ تدریجی و حکیمانہ حکمت ہے جو صرف وحی کی روشنی سے حاصل ہوتی ہے۔

اس بحث کا ایک گہرا زاویہ یہ بھی ہے کہ ہر عمل، خواہ نیکی ہو یا گناہ، صرف اپنے کرنے والے پر اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ وہ "معاشرتی فضا" کا حصہ بنتا ہے۔ جیسے ایک شخص اگر گندگی پھینکے تو صرف اس کا کمرہ نہیں بلکہ پورا محلہ بدبودار ہو جاتا ہے، ایسے ہی اگر کوئی شخص دین سے دوری، بد اخلاقی، بد تہذیبی، یا منفی خیالات کو عام کرے تو وہ صرف اپنی روح کو نہیں آلودہ کر رہا بلکہ دوسروں کے ذہنوں میں بھی زہر بھر رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین ہمیں صرف اپنے آپ کو سنوارنے کا نہیں کہتا بلکہ " کنتم خیر امة " کہہ کر ہمیں دوسروں کے لیے خیر و نیکی کا ذریعہ بننے کی تلقین کرتا ہے۔

قرآن مجید اور تعلیماتِ معصومینؑ کے مطابق ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اعمال کی اصلاح کرے بلکہ جہاں ممکن ہو، دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی نرم مزاجی، حکمت اور موعظۂ حسنہ سے کام لے۔ تاہم یہ بات بھی ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے فرائض انجام دینے کے لیے علم، حالات کی نزاکت اور مخاطب کی صلاحیتوں کا خیال رکھا جائے۔ یہ ہر ایک پر لازم نہیں کہ ہر مقام پر ہر بات کہے، لیکن یہ شعور ضرور ہونا چاہیے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ معاشرے کو متاثر کر رہا ہے۔ ہمیں اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارا ہر قدم، ہر بات، ہر خاموشی، ایک پیغام رکھتی ہے۔ کوئی بھی عمل خلا میں نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی کے دل کو چھوتا ہے، کسی کی سوچ کو بدلتا ہے، کسی کے قدموں کی سمت کو درست یا منحرف کرتا ہے۔ اس لیے خود کی

اصلاح، تزکیۂ نفس، اور اپنی جسمانی و ذہنی صحت کا خیال رکھنا صرف ایک ذاتی کوشش نہیں، بلکہ ایک معاشرتی و دینی فریضہ ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ خود کی اصلاح اور نگہداشت ایک ایسا عمل ہے جس کے اثرات ہماری اولاد، شریکِ حیات، والدین، شاگردوں، پڑوسیوں، اور حتیٰ کہ معاشرے کے کمزور طبقوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اگر ہم دین کی پابندی، اخلاقی رویوں، اور روحانی ترقی کو صرف ذاتی نجات کے لیے سمجھیں گے تو ہم دین اسلام کے اجتماعی پیغام سے محروم رہ جائیں گے۔ دین صرف فرد کا تعلق خدا سے جوڑنے کا نام نہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان کو ایک با اخلاق، حساس اور ذمہ دار سماجی فرد بنانا بھی مقصد ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ کوئی بھی فعل، خاص کر دینی یا غیر دینی، مکمل طور پر انفرادی نہیں ہوتا۔ اس کے ہمہ گیر اور دور رس اثرات ہوتے ہیں، جن کا شعور رکھنا ہی ایک بالغ اور باادب مؤمن کی پہچان ہے۔

یہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک اسلامی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ افراد کی خود آگاہی، ان کی نفسیاتی ہم آہنگی، اور ان کی دینی وابستگی، دراصل ایک ایسے سماج کی ضمانت ہے جو باہمی شفقت، ہمدردی، اور روحانی بالیدگی سے لبریز ہو۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے، ہمارے شاگرد، ہمارا معاشرہ بہتر ہو، تو ہمیں خود سے آغاز کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے خیالات، اپنی دعاؤں، اپنے رویوں، اور اپنے مقصدِ زندگی کو دینی بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا، کیونکہ ہماری ذات ہی دوسروں کے لیے سب سے مؤثر پیغام ہے۔

اپنے اعمال سے شیطان کو طاقتور نہ بننے دیں!

روزمرہ زندگی میں کئی ایسے افکار و اعمال ہوتے ہیں جو بظاہر معمولی یا غیر اہم نظر آتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ استعماری مفادات کو تقویت دیتے ہیں اور فرد و معاشرے کی فکری، ثقافتی، معاشی اور روحانی آزادی کو آہستہ آہستہ زائل کر دیتے ہیں۔ ان افکار و اعمال کو پہچاننا اور ان سے بچنا ایک باشعور اور بیدار قوم کے لیے نہایت ضروری ہے۔

سب سے پہلے زبان اور تہذیب کی سطح پر نو آبادیاتی اثرات بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنی زبان کو کمتر اور غیر ملکی زبان کو اعلیٰ سمجھنے لگتے ہیں، جب مقامی ادب، شاعری، محاورات اور تاریخی حکایات کو ترک کر کے مغربی ثقافت اور اصطلاحات کو اپنانے لگتے ہیں تو یہ محض ایک علمی یا ثقافتی انتخاب نہیں ہوتا، بلکہ ایک فکری غلامی کی علامت ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم نہ صرف اپنی زبان بلکہ اپنی تہذیب، ورثے اور اجتماعی حافظے سے بھی دور ہو جاتے ہیں، جس کا فائدہ براہ راست استعماری نظام کو ہوتا ہے، کیونکہ ایسی قومیں اپنے تشخص سے محروم ہو کر بیرونی ایجنڈوں کو زیادہ آسانی سے قبول کرتی ہیں۔

اسی طرح تعلیم کا نظام اگر مغربی فکر، تاریخ اور فلسفہ پر مبنی ہو اور اس میں مقامی یا اسلامی فکر کو محض جزوی حیثیت دی گئی ہو تو یہ بھی نو آبادیاتی ذہن سازی کا حصہ ہوتا ہے۔ جب طلبہ کو بچپن سے ہی یہ باور کرایا جائے کہ ترقی، علم، عقل اور سائنس صرف مغرب کی دین ہیں اور ہمارے تمدن میں ان کی مثال موجود نہیں، تو وہ فکری طور پر مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اس

مرعوبیت کے تحت وہ نہ صرف مغرب کی ہر بات کو سچ سمجھتے ہیں بلکہ اپنے دینی اور تہذیبی سرمائے سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔

میڈیا اور تفریحی ذرائع بھی استعماری ایجنڈوں کو پھیلانے کے مؤثر ذرائع بن چکے ہیں۔ جب ہم بغیر تنقیدی شعور کے غیر ملکی فلمیں، ڈرامے، میوزک اور فیشن کو اپناتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ایک پورا طرزِ فکر اور طرزِ حیات بھی اختیار کر لیتے ہیں، جو اکثر مادہ پرستی، انفرادیت، مذہب بیزاری اور جنسی آزادی جیسے تصورات کو فروغ دیتا ہے۔ یہ تمام تصورات ہمارے اسلامی اور مشرقی معاشروں کے لیے اجنبی اور مضر ہیں، لیکن چونکہ وہ خوبصورت انداز میں پیش کیے جاتے ہیں، ہم انہیں "ترقی" یا "جدت" سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔

معاشی سطح پر بھی استعماری نظام کی جڑیں ہمارے روزمرہ کے رویوں میں پیوست ہیں۔ جب ہم مقامی مصنوعات کے بجائے عالمی برانڈز کو ترجیح دیتے ہیں، جب ہم مغربی طرزِ زندگی کو کامیابی کی علامت سمجھ کر غیر ضروری اشیاء خریدتے ہیں، جب ہم سودی بینکاری نظام کو ناگزیر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں تو ہم دراصل اس نظام کو طاقت دے رہے ہوتے ہیں جو عالمی سطح پر غریب ممالک کا استحصال کرتا ہے۔ ہماری معمولی خریداری یا مالی ترجیحات بھی عالمی معیشت کے استعمار کو زندہ رکھنے میں کردار ادا کرتی ہیں۔

دینی اور فکری سطح پر بھی بعض رویے استعماری سوچ کو تقویت دیتے ہیں، جیسے دین کو محض عبادات تک محدود کر دینا اور اسے معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور فکری مسائل سے جدا سمجھنا۔ جب ہم دینی فکر کو جدید دنیا کے مسائل سے الگ کر دیتے ہیں، تو ہم نادانستہ طور پر

وہی کام کر رہے ہوتے ہیں جو استعماری طاقتیں چاہتی ہیں: ایک غیر متحرک، غیر سیاسی اور صرف انفرادی دین، جو ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کرے، اور جو طاقت کے نظام کو چیلنج نہ کرے۔

یوں مجموعی طور پر ہماری زبان، لباس، تعلیم، تفریح، خریداری، دین فہمی، اور اقدار میں چھپے ہوئے وہ تمام چھوٹے بڑے عوامل جو ہمارے اندر احساسِ کمتری، فکری غلامی، یا استعماری نظام سے مصالحت پیدا کرتے ہیں، ہمیں اُن سے مسلسل ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف علمی یا اخلاقی مسئلہ نہیں، بلکہ یہ ہماری اجتماعی بقا اور حقیقی آزادی کا مسئلہ ہے۔ جب تک ہم ان روزمرہ کے اعمال و افکار کا شعور حاصل نہیں کرتے، ہم آزاد قوم کہلانے کے مستحق نہیں بن سکتے، چاہے ظاہری طور پر ہمیں کتنی ہی دھوکے کی خود مختاری حاصل ہو۔

عائلی (خاندانی) زندگی میں بھی بہت سے ایسے رویے اور افکار شامل ہو چکے ہیں جو بظاہر ذاتی یا جدید طرزِ زندگی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن دراصل وہ استعماری ایجنڈوں کا تسلسل ہوتے ہیں۔ ان رویوں کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ استعمار نے صرف سیاسی یا معاشی سطح پر ہی نہیں بلکہ خاندان کے مقدس ادارے پر بھی حملہ کیا ہے، تاکہ معاشرے کی بنیادی اکائی کو کمزور کیا جا سکے۔

عائلی زندگی میں سب سے پہلا اور بڑا خطرہ مرد و زن کے تعلق کو رقابت یا مساوات کی جنگ میں بدل دینا ہے۔ مغربی استعماری فکر میں عورت کی آزادی کا مطلب اکثر مرد کے برابر یا اس سے بے نیاز ہونا لیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورت کو اپنی نسوانیت، ماں یا

بیوی کے کردار، اور گھر کی معنویت سے بدظن کر دیا جاتا ہے۔ جب عورت یہ سمجھے کہ گھرداری کرنا، بچوں کی پرورش، یا شوہر کے ساتھ رفاقت صرف ایک غلامی ہے، اور حقیقی آزادی صرف بیرون خانہ پیشہ ورانہ زندگی میں ہے، تو وہ نادانستہ طور پر اس نظریے کو قبول کر رہی ہوتی ہے جو استعماری نظام نے اس پر مسلط کیا ہے — یعنی خاندان کی مرکزیت کو توڑنا۔

اسی طرح مرد کی ذمہ داری کا احساس ختم کر کے اسے صرف مادی کفالت تک محدود کرنا بھی ایک استعماری سوچ ہے۔ جب مرد یہ سمجھے کہ اس کا صرف یہ فرض ہے کہ وہ کمائے اور باقی سب کچھ عورت یا بچے خود سنبھال لیں، تو وہ روحانی قیادت، تربیت، محبت، اور باہمی مشورے کے اصولوں سے دور ہو جاتا ہے، جو اسلامی عائلی نظام کا جوہر ہے۔

استعماری فکر نے والدین اور اولاد کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی میڈیا، کارٹونز، گیمز اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایک ایسی دنیا میں لے جایا جاتا ہے جو ان کے والدین کی اقدار، زبان، اور روایت سے مختلف ہوتی ہے۔ والدین کی نصیحت، تجربہ یا دینی شعور ان کے لیے غیر متعلقہ محسوس ہونے لگتا ہے، اور وہ بیرونی آئیڈیلز کے تحت اپنی زندگی کے فیصلے کرنے لگتے ہیں۔

مزید برآں، خاندانی نظام میں صبر، قربانی، اور باہمی سمجھوتے کی جگہ انفرادیت، آزادی، اور جذباتی خودمختاری کو فوقیت دینا ایک استعماری طرزِ فکر ہے۔ مغرب میں خاندان کا تصور اب ایک غیر ضروری یا وقتی شراکت داری تک محدود ہو چکا ہے۔ جب ہمارے معاشرے میں طلاق کو معمول، ماں باپ سے علیحدگی کو آزادی، اور رشتہ داریوں کو بوجھ سمجھا جانے

لگے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم محض کلچر کی پیروی نہیں کر رہے، بلکہ ایک فکری غلامی کا شکار ہو چکے ہیں۔

ایک اور پہلو رسومات، تقریبات، اور خاندانی زندگی کی نمود و نمائش ہے۔ جب شادی بیاہ یا میل ملاقات کے مواقع پر اسلامی سادگی کی جگہ مغربی اسٹائل، مہنگے برانڈز، اور دکھاوے کی عادتیں غالب آجائیں، تو یہ بھی استعماری سرمایہ دارانہ نظام کے مفادات کو تقویت دینے والا عمل ہے، جو خاندان کو معاشی دباؤ میں ڈال کر اس کی روحانی و اخلاقی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔

اسی طرح پردے اور حجاب جیسے شعائر کو پسماندگی یا کمزور عورت کی علامت بنانا، اور مخلوط میل جول کو ترقی کا زینہ سمجھنا بھی وہ افکار ہیں جو عائلی نظام کو گھن کی طرح چاٹتے ہیں۔ یہ تمام تصورات اس نظام کا حصہ ہیں جو عورت کو جسمانی نمائش اور صارفیت کا نشان بناتا ہے، اور مرد و عورت کے باوقار تعلق کو سطحی تفریح میں تبدیل کر دیتا ہے۔

ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے گھروں، خاندانوں اور روزمرہ کے رویوں میں ان باریکیوں کو نہ سمجھیں، تو ہم اپنے بچوں کو ایک ایسی فکری اور روحانی غلامی کی طرف دھکیل رہے ہیں جس کا انجام صرف تنہائی، بے سکونی، اور خاندانی انتشار ہے۔ اسلامی عائلی نظام محض عبادات یا اخلاقیات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل تمدنی تحفظ ہے، جسے بچانا استعمار سے حقیقی آزادی کی بنیاد ہے۔

سماجی برائیاں جیسے لڑائی جھگڑا، کینہ، بغض، حسد، لالچ، غیبت، بہتان، اور بدگمانی — سب درحقیقت شیطانی نظام کے اندرونی ہتھیار ہیں، جو انسانوں کے دلوں میں پھوٹ ڈال کر

معاشرتی وحدت، اخوت، اور باہمی اعتماد کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ برائیاں نہ صرف افراد کو اندر سے کھوکھلا کرتی ہیں بلکہ پورے معاشرے کو کمزور اور دشمن کے لیے آسان شکار بنا دیتی ہیں۔

قرآن مجید شیطان کو " الَّذِی یُوَسْوِسُ فِی صُدُورِ النَّاسِ " کہتا ہے—یعنی وہ انسان کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر ان کے مابین نفرت، شک، اور فساد پیدا کرتا ہے۔ جب بھائی بھائی سے، پڑوسی پڑوسی سے، عالم عوام سے، اور فرقے ایک دوسرے سے بدظن ہو جاتے ہیں، تو درحقیقت شیطان اپنا مقصد پورا کر چکا ہوتا ہے۔

یہی وہ روحانی و سماجی ماحول ہے جس میں استعمار سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیونکہ جب امت اندر سے ٹوٹ چکی ہو، تو باہر سے غلام بنانا یا کنٹرول کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ان برائیوں سے اجتناب محض اخلاقی تقاضا نہیں بلکہ ایک تحریکِ آزادی کا جزو ہے—ایک ایسا جہاد جس میں دل کو شیطان کے اثر سے پاک کر کے اللہ، امت، اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کیا جائے۔

سچ یہ ہے کہ جو انسان اپنی ذات کے اندر شیطان کو شکست دیتا ہے، وہی شیطانی استعمار کے خلاف بھی مؤثر مزاحمت کر سکتا ہے۔ اس لیے اصلاحِ نفس اور تہذیبِ معاشرہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

کسب و کار (تجارت و معیشت) کے میدان میں بھی استعماری مفادات بڑی باریکی اور حکمت کے ساتھ ہماری روزمرہ زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ یہ اثرات صرف معاشی نظم

تک محدود نہیں رہتے بلکہ ہمارے رویوں، ترجیحات، نیتوں اور لین دین کے اصولوں تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں سے ایسے نظام کو مستحکم کرتے ہیں جو نہ صرف ہماری خود مختاری کو زائل کرتا ہے بلکہ استعماری ایجنڈے کی تقویت کا ذریعہ بنتا ہے۔

سب سے پہلا نکتہ نفع پرستی اور حرص ہے۔ سرمایہ دارانہ استعمار نے تجارت و معیشت کو صرف منافع کمانے کا ذریعہ بنا دیا ہے، چاہے وہ نفع حلال ہو یا حرام، عدل پر مبنی ہو یا ظلم پر۔ جب کوئی تاجر یا کاروباری شخص اپنے نفع کی خاطر صارف کو دھوکہ دیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، ملاوٹ کرتا ہے، یا مارکیٹ میں غیر ضروری طلب پیدا کر کے قیمتیں بڑھاتا ہے، تو وہ درحقیقت اس استعماری فکر کا حصہ بن رہا ہوتا ہے جو اخلاقیات سے خالی معیشت کو فروغ دیتی ہے۔ اسلامی تجارت کا مرکز “امانت” اور “خدمت” ہے، جبکہ استعماری تجارت کا مرکز “فائدہ کسی بھی قیمت پر” ہے۔

ایک اور نمایاں اثر غیر ملکی مصنوعات کی اندھی تقلید اور ترجیح ہے۔ جب ہم ہر شے میں صرف بیرونی برانڈز کو اہمیت دیتے ہیں، مقامی صنعت کو کمتر سمجھتے ہیں، اور بغیر تحقیق کے عالمی مصنوعات کو فوقیت دیتے ہیں، تو ہم دراصل ان معیشتوں کو مضبوط کر رہے ہوتے ہیں جنہوں نے ہمارے وسائل، ثقافت اور فکری خود مختاری کو نشانہ بنایا ہے۔ ایک عام صارف کا یہ فیصلہ کہ وہ کس کمپنی کی چیز خریدتا ہے، درحقیقت ایک سیاسی و تہذیبی فیصلہ بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح سودی نظام کو معیشت کا ناگزیر جزو سمجھ لینا بھی استعمار کی ذہن سازی کا نتیجہ ہے۔ اسلامی معاشی فکر سود کو ظلم، استحصال اور طبقاتی تفریق کی جڑ سمجھتی ہے، جبکہ مغربی نظام نے سودی بینکاری کو ترقی کا لازمی جزو بنا دیا ہے۔ جب ایک مسلمان تاجر یا ادارہ سودی قرضہ لیتا ہے، یا سودی منافع کو "معمول" سمجھتا ہے، تو وہ عملاً اسی نظام کو فروغ دے رہا ہوتا ہے جو استعمار کا بنیادی آلہ ہے۔

مزید برآں، کارپوریٹ کلچر اور صارفیت ((consumerism)) بھی استعماری مقاصد کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب کاروبار کا ہدف لوگوں کی حقیقی ضروریات پوری کرنے کے بجائے ان میں مصنوعی خواہشات پیدا کرنا بن جائے، جب اشتہارات کا مقصد لوگوں کو اس بات پر قائل کرنا ہو کہ وہ وہ چیز بھی خریدیں جس کی انہیں ضرورت نہیں، تو یہ صرف تجارتی چالاکی نہیں بلکہ فکری غلامی ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ قرض، فضول خرچی اور بے سکونی کا شکار ہو جاتا ہے۔

کسب وکار میں اسلامی اقدار کا فقدان بھی ایک استعماری کامیابی ہے۔ جب کاروبار میں سچائی، دیانت، حسنِ سلوک، ہمدردی، عدل، کفایت شعاری، اور نیت کی درستگی جیسی صفات کمزور پڑ جائیں، تو وہ نظام بن جاتا ہے جو دولت تو پیدا کرتا ہے لیکن بربادی، بے انصافی، اور نابرابری کے ساتھ۔

اسی زمرے میں عورت کو کاروباری یا تجارتی نمائش کا ذریعہ بنانا بھی ایک گہرا استعماری حربہ ہے۔ جب عورت کو اشتہارات، نمائندگی، یا مارکیٹنگ میں محض ایک پرکشش تصویر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، تو وہ اسلام کے عزت و عصمت والے تصورِ نسوانیت کے خلاف

ایک بغاوت بن جاتا ہے، جس کے نتائج معاشرتی انارکی، فحاشی، اور اخلاقی زوال کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

کامیابی کا پیمانہ صرف مادی دولت کو بنانا بھی استعماری ذہنیت کی پیداوار ہے۔ اسلامی تصورِ رزق میں قناعت، برکت، پاکیزگی، اور ذمہ داری شامل ہے، لیکن جب ہم صرف زیادہ پیسے کو کامیابی کا معیار بنالیتے ہیں تو ہم نادانستہ طور پر اپنی روح کو خالی کرتے جاتے ہیں، اور سرمایہ دارانہ استعمار کے ہدف — "انسان کو صرف ایک صارف یا پروڈیوسر بنا دینا" — کو مکمل کر دیتے ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ کسب و کار کو محض دنیا کمانے کا ذریعہ نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے ایک امانت، ایک خدمت، اور ایک دینی فریضہ سمجھ کر انجام دیا جائے۔ جب تک ہم معیشت کو اسلامی اصولوں پر استوار نہیں کرتے، ہم ظاہری دھوکے کی ترقی کے باوجود استعماری شکنجے سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

استعماری فکر نے ہماری عائلی، معاشی، اور فکری زندگی کے بنیادی ڈھانچے کو کمزور کرنے کے لیے ایسے افکار و رویے عام کیے جو ہمیں اپنی اقدار سے دور اور مغربی نظام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ خاندانی نظام میں آزادی کے نام پر عورت کے کردار، والدین و اولاد کے تعلق، اور مرد کی ذمہ داری کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ معیشت میں نفع پرستی، سود، صارفیت، اور غیر ملکی اشیاء کی غلامی نے خود کفالت و دیانت کی جگہ لے لی ہے۔ جب تک ہم ان افکار سے شعوری اجتناب نہیں کرتے، ہم ظاہری ترقی نہ ہونے کے باوجود استعمار کے فکری، ثقافتی اور معاشی بندھنوں میں جکڑے رہیں گے اور آخرت میں بھی پچھتاوا حاصل کریں گے۔ استعمار و

سامراج کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو وہ محض سیاسی یا اقتصادی نظام نہیں بلکہ ایک شیطانی ذہنیت اور طرزِ فکر ہے جو انسان کو اس کی فطرت، دین، عقل، عزت اور آزادی سے جدا کر کے اسے محض ایک استعمال ہونے والا "وسیلہ" بنا دیتا ہے۔ یہ وہی شیطانی چال ہے جو انسان کو دھوکے میں مبتلا کر کے خیر کو شر اور شر کو خیر کی صورت میں پیش کرتی ہے۔

قرآن مجید نے شیطان کو "عَدُوٌّ مُبِينٌ" (کھلا دشمن) قرار دیا ہے، اور یہی استعمار بھی ہے — جو امت کے عقیدہ، معاش، عزت، نسل، اور ثقافت پر حملہ آور ہے۔ یہ وہی شیطان ہے جو غیبی صورت میں نہیں بلکہ مادی اداروں، میڈیا، معیشت، تعلیم اور سیاست کی شکل میں کام کر رہا ہے۔ آج کا استعمار جدید ترین ٹیکنالوجی، ترقی، آزادی، اور انسانی حقوق کے نام پر وہی کام کر رہا ہے جو قدیم شیطان نے آدمؑ و حواؑ کو جنت سے نکالنے کے لیے کیا تھا: "وسوسہ ڈالنا، جھوٹا وعدہ دینا، اور فریب دینا"۔

لہٰذا استعمار کو صرف ایک دنیاوی نظام نہیں بلکہ "شیطانی نظام" سمجھنا ایک بیدار فکری اور ایمانی شعور کی علامت ہے۔ اور اس شیطان سے نجات کا واحد راستہ وہی ہے جو قرآن نے بتایا: اللہ کی پناہ، تقویٰ، علم، اور اجتماعی بیداری۔ یہی استعمار کے خلاف اصل جہاد ہے۔

حقیقت و واقعیت یا تواھمات و گمان

حقائق وہ چیزیں ہیں جو اپنے وجود میں ثابت، مستقل، اور غیر متغیر ہوں، یعنی جن کا ہونا کسی کی رائے، پسند یا سوچ پر منحصر نہ ہو بلکہ وہ اپنی اصل میں موجود ہوں، چاہے کوئی انہیں مانے یا نہ مانے۔ حقیقت وہ ہے جو علم و شعور کی روشنی میں درست ہو، اور جسے جھٹلانے کے لیے کوئی معقول دلیل نہ دی جا سکے۔

کسی چیز کو حقیقت کہلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وجود یا صداقت پر دلیل موجود ہو، یا وہ مشاہدے، تجربے، عقل یا وحی سے ثابت ہو۔ مثال کے طور پر سورج کا طلوع ہونا ایک حقیقت ہے کیونکہ یہ ہر روز مشاہدے میں آتا ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی غیر متبدل ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، کیونکہ یہ عقلی اصول ہے جس میں تبدیلی ممکن نہیں۔

حقیقت وہ ہوتی ہے جو اصل میں ہو، اور جسے عقل، تجربہ، یا الہامی علم کی روشنی میں ثابت کیا جا سکے۔ سچائی کا تعلق حقیقت سے ہے، لیکن ہر سچ بولی جانے والی بات حقیقت نہیں ہوتی، جب تک وہ کسی معروضی، اصولی یا الہامی بنیاد پر درست ثابت نہ ہو جائے۔

وہ عقائد جو حقیقت اور واقعیت کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں، انسان کی فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں کیونکہ فطرت خود ایک الٰہی نظام ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب کوئی عقیدہ فطری ہو، یعنی انسانی عقل، ضمیر، اور فطری

میلانات کے ساتھ ہم آہنگ ہو، تو وہ دل میں اتارتا ہے، اطمینان بخشتا ہے اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایسے عقائد محض رسم و رواج یا تقلیدی بنیادوں پر نہیں ہوتے، بلکہ دلیل، بصیرت اور فطری شعور پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر عمل کرنے والا شخص زندگی میں سکون اور استقامت پاتا ہے، کیونکہ وہ ایک ایسے راستے پر گامزن ہوتا ہے جو اس کی تخلیق کے مقصد اور اس کی داخلی ساخت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ ان عقائد میں جھوٹ، تضاد، یا وقتی فائدے کی گنجائش نہیں ہوتی، بلکہ یہ دائمی اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جن کی جڑیں انسانی فطرت اور کائناتی قوانین میں پیوستہ ہوتی ہیں۔

قوانین فطرت وہ الٰہی ضابطے ہیں جو نہ صرف کائنات کے نظم و ضبط کو قائم رکھتے ہیں بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں توازن، عدل، اور کامیابی کا راستہ دکھاتے ہیں۔ جب انسان ان قوانین کا پاس رکھتا ہے، یعنی ان کے مطابق سوچتا، جیتا، اور عمل کرتا ہے، تو وہ زندگی کے پیچیدہ راستوں میں بھی سیدھا اور محفوظ چلتا ہے۔ اس کے برعکس، جب وہ ان قوانین کو نظر انداز کرتا ہے تو اسے بے سکونی، ناکامی اور گمراہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے فطری اور حقیقی عقائد ہی انسان کو اس کے اصل مقام اور مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور یہی عقائد انسان کو سچی کامیابی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

مذہبی عقائد اگر حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہوں تو ہی انسان کی ہدایت، سکونِ قلب، اور نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایسے عقائد عقل و فطرت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، ان کی بنیاد علم، دلیل، اور الہام پر ہوتی ہے، اور ان کا اثر انسان کے اخلاق، کردار اور رویّے میں مثبت طور

پر ظاہر ہوتا ہے۔ دینِ حق کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو سچائی سے روشناس کروایا جائے، اسے زندگی کے اصل مقصد سے آگاہ کیا جائے، اور اسے ایسے اصول دیے جائیں جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا سبب بنیں۔

لیکن اگر مذہبی عقائد حقیقت سے خالی ہوں، محض اندھی تقلید، جذباتی وابستگی، یا تاریخی روایات و توہمات پر مبنی ہوں تو وہ انسان کو نہ صرف گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں بلکہ اس کی عقل و فطرت کو بھی دبا دیتے ہیں۔ ایسے عقائد میں نہ روشنی ہوتی ہے، نہ رہنمائی، بلکہ وہ انسان کو ایک ایسے راستے پر لے جاتے ہیں جو حق سے دور اور باطل کے قریب ہوتا ہے۔

قرآن بار بار عقل و تفکر کو دعوت دیتا ہے، اسی لیے ایک سچا دین کبھی بھی آنکھیں بند کر کے ماننے کو نہیں کہتا بلکہ سوال، تحقیق، اور فہم کی بنیاد پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ جب مذہب اپنے اصل، یعنی وحی، عقل، اور فطرت کی روشنی سے جڑا ہوتا ہے تو وہ معاشرے کو عدل، رحم، اور حکمت عطا کرتا ہے۔ لیکن جب وہ توہمات اور بے بنیاد روایتوں کا شکار ہو جائے تو وہ مذہب کے نام پر ظلم، تعصب، اور جہالت کو فروغ دیتا ہے۔

لہٰذا مذہبی عقائد تب ہی فائدہ مند، نجات دہندہ، اور فطرت کے مطابق ہوتے ہیں جب ان کی بنیاد حقیقت اور واقعیت پر ہو۔ بصورت دیگر وہ محض رسمی رسوم، جذباتی وابستگی، یا توہمات کی زنجیریں بن جاتے ہیں جو انسان کو ترقی کی راہ سے ہٹا کر جمود، خوف، اور اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔

دشمن کی چالاکیاں اور ہماری بے وقوفیاں

منتظرین امام مہدی عج کی فعالیتیں اور ان کی دینی و معاشرتی جدوجہد اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اپنے گردوپیش کے حالات، دشمن کی چالوں، اور وقت کی ضرورتوں کو پوری بصیرت کے ساتھ نہ سمجھیں۔ نیکیوں کا ڈھیر، عبادات کی کثرت، انفرادی تقویٰ، اور خیرات کے مظاہر اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، لیکن اگر ان تمام اعمال کا رُخ زمانے کے امامؑ کی راہ ہموار کرنے اور دشمن کے فتنوں کے مقابلے کے لیے نہ ہو، تو ان کی تاثیر محض انفرادی نجات تک محدود رہ جاتی ہے اور اجتماعی اصلاح کے میدان میں بے اثر ہو جاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں عبادات کو محض رسومات کے طور پر نہیں بلکہ تربیتِ نفس، تقویتِ ایمان، اور معاشرتی عدل و بیداری کے لیے ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ"۔ یعنی نماز برائیوں سے روکتی ہے۔ اگر کوئی نماز گزار فرد فحشاء و منکرات سے نہیں رُک رہا، یا سماجی سطح پر ظلم و فساد کے خلاف آواز بلند نہیں کر رہا، تو اس کی نماز محض ظاہری کیفیت کی حد تک محدود ہے۔ یہی اصول دیگر عبادات جیسے روزہ، زکات، حج، اور صدقات پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

آج کے دور میں جہاں صہیونی نظامِ دنیا پوری طاقت کے ساتھ نہ صرف مسلم معاشروں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہے بلکہ فکری، ثقافتی، اور اقتصادی محاذ پر مسلمانوں کی شناخت کو

مٹانے کے لیے کوشاں ہے، ایسے میں اگر کوئی شخص یا جماعت مہدویت کے نام پر صرف ذاتی اعمال و عبادات کو کافی سمجھے اور دشمن کے اہداف، سازشوں، اور چالوں سے غفلت برتے تو یہ نہ صرف لاعلمی ہے بلکہ امام وقتؑ کی نصرت سے محرومی کا سبب بن سکتی ہے۔ امام صادقؑ کا فرمان ہے: "أعبد الناس من اقام الفرائض"، یعنی سب سے بڑا عابد وہ ہے جو واجبات کو درست طریقے سے انجام دے، اور واجبات میں فقط نماز و روزہ ہی نہیں بلکہ ظلم کے خلاف قیام، مستضعفین کی مدد، اور باطل نظام کے مقابلے میں آواز بلند کرنا بھی شامل ہے۔

صہیونی نظام کی سب سے بڑی مکاری یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو ظاہری دینداری میں مشغول رکھ کر ان سے دشمن شناسی کی حس سلب کرلیتا ہے۔ یوں ایک مسلمان فرد یا جماعت اپنی عبادات پر مطمئن ہو کر یہ سمجھ بیٹھتی ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کر رہا ہے، حالانکہ زمانے کے طاغوت کی شناخت اور اس کے خلاف فکری، ثقافتی، اور علمی مزاحمت بھی دینی فریضہ ہے۔ امام خمینیؒ اسی نکتے پر زور دیتے تھے کہ "اسلام صرف عبادت کا دین نہیں بلکہ ظلم کے خلاف قیام کا دین ہے"۔

منتظرین مہدیؑ کی اصل پہچان یہی ہونی چاہیے کہ وہ ایک طرف اپنی روحانی اصلاح، اخلاقی تربیت اور دینی علم میں پختگی حاصل کریں، اور دوسری طرف وقت کے فرعونوں اور صہیونی سازشوں کے مقابلے میں اپنی فکری و عملی صف بندی کریں۔ اگر وہ صرف نیکیوں کے چند ڈھیر پر اکتفا کریں اور دشمن کی چالوں سے بے خبر رہیں تو یہ نیکیاں وہ تاثیر پیدا نہ کر سکیں گی جو اسلام کا اصل مطلوب ہے۔ حضرت علیؑ کا فرمان ہے: "حق کو پہچانو تا کہ اہلِ حق کو

پہچان سکو"۔ جب تک حق کی پہچان نہ ہو اور باطل کے نظام کو نہ سمجھا جائے، اس وقت تک ہماری نیکیوں کا رخ بھی درست متعین نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا، موجودہ حالات میں ایک سچے منتظر کی ذمہ داری فقط فردی عبادات اور روایتی نیکیوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اسے چاہیے کہ وہ عالمی استکبار، صہیونیت، مغربی تہذیب کی فتنہ انگیزی، اور امت مسلمہ کے فکری انحرافات کو سمجھے، ان کے خلاف علمی و تربیتی محاذ پر اترے، اور امام وقتؑ کے ظہور کے لیے وہ زمینہ فراہم کرے جو معاشرتی بیداری، عدل کے قیام، اور حق کی طرف ہجرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسی نیکیاں ہی امام کے لشکر میں شامل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں، باقی سب فقط ظاہری نیکیوں کا دھوکہ ہیں جنہیں دشمن نے ہمارے لیے مایۂ فخر اور اصل ہدف سے غفلت کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

قیامِ حق کی جدوجہد میں ناامیدی حرام ہے

تاریخِ انسانیت میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ قومیں اجتماعی طور پر گمراہ ہو گئیں، انقلابی تحریکیں زوال کا شکار ہو گئیں، اور دیندار افراد دین سے منہ موڑ بیٹھے۔ قرآن نے بارہا ہمیں ان واقعات کی یاد دہانی کروائی ہے جہاں اکثریت نے حق کا انکار کیا، یا جہاں کچھ افراد نے وقتی قربانی دینے کے بعد راہِ حق کو چھوڑ دیا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مومنین کو کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اکثریت کے بگاڑ کو دیکھ کر اپنی ذمہ داری ترک کر دیں یا مایوسی کا شکار ہو جائیں۔ بلکہ وہ بار بار انہیں تاکید فرماتا ہے کہ تم پر جو حق واضح ہو چکا ہے، اور جس پر تمہیں یقین حاصل ہے، اُس پر ڈٹے رہو، اور اپنی استطاعت، ہمت اور وسائل کے دائرے میں جو تم پر فریضہ عائد ہوتا ہے، اُسے ترک نہ کرو، چاہے تم تنہا رہ جاؤ۔

قرآن کریم کی وہ آیت جس میں ارشاد ہوتا ہے: "افإن مات أو قتل انقلبتم علی أعقابکم؟" یعنی "کیا اگر رسول شہید ہو جائیں تو تم الٹے قدم واپس پلٹ جاؤ گے؟" ایک زبردست مہمیز ہے ہر حق پرست کے لیے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ حتیٰ اگر سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں، حتیٰ کہ اگر نبی بھی دنیا سے تشریف لے جائیں، تب بھی ایک سچے مومن کا فرض تبدیل نہیں ہوتا۔ اُس کی وابستگی کسی ہستی کی زندگی یا کسی گروہ کی تعداد سے مشروط نہیں، بلکہ اُس کی وفاداری حق، عدل، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ حق کی راہ پر چلنا کبھی بھی ایک اجتماعی فیشن نہیں رہا۔ ہمیشہ سے حق پرست کم تعداد میں رہے ہیں، اُن پر طنز ہوا، اُنہیں تنہا کیا گیا، اور انہیں دنیاوی کامیابی سے محروم دکھایا گیا۔ مگر وہی لوگ تاریخ کے اصل کامیاب انسان قرار پائے، کیونکہ انہوں نے حق کو فقط نعرہ یا احتجاج نہیں سمجھا بلکہ ایک ذمہ داری، ایک عہد، ایک امانت جانا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اُنہیں "صادقین"، "صابرین"، اور "متقین" جیسے القابات سے نوازا۔

اگر آج امت مسلمہ اجتماعی طور پر دین سے منحرف ہو جائے، ملحدانہ افکار کو قبول کر لے، اور انقلابی تحریکیں دنیا پرستی، قومی مفاد یا ذاتی اغراض کی نذر ہو جائیں، تو ایک سچے مومن کو اپنی راہ بدلنے کی اجازت نہیں۔ اُس پر واجب ہے کہ وہ حق کی شمع کو تھامے رکھے، چاہے وہ اندھیری رات ہو، چاہے طوفان ہو، یا چاہے اُس کے ساتھی ایک ایک کر کے پیچھے ہٹتے جائیں۔ وہ اپنی استطاعت کے مطابق، چاہے قلم سے ہو یا زبان سے، عمل سے ہو یا دعا سے، اپنے فریضے کو ادا کرتا رہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جو ایمان کو وقتی جذبے سے جدا کرتا ہے۔ وقتی جذبہ حالات کے زیر و بم کا شکار ہوتا ہے، جبکہ ایمان ایک اندرونی روشنی ہے جو کسی تعریف یا تنقید، تنہائی یا مقبولیت، کامیابی یا ناکامی سے متاثر نہیں ہوتی۔ یہ ایمان ہی ہے جو ہمیں انفرادی سطح پر بھی میدان میں قائم رکھتا ہے، اور یہی وہ عنصر ہے جو دنیا کی ہر تاریکی میں اُمید کا چراغ بن کر روشن ہوتا ہے۔

پس، مومن کی نگاہ ہمیشہ اس بات پر ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں کیا جواب دے گا۔ اُسے اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کر رہا ہے یا نہیں، نہ کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اگر دنیا پیچھے ہٹ جائے تو بھی وہ آگے بڑھتا ہے، اگر سب سو جائیں تو بھی وہ جاگتا ہے، کیونکہ اُس کا مقصد فقط دنیا میں اثر ڈالنا نہیں بلکہ اپنے رب کی رضا حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو ہر دور کے سچے مصلح، نبی، اور ولی نے اپنایا اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ حق پر ڈٹے رہنے والے ہی دراصل وقت کے امام کے حقیقی منتظر اور دین کے اصل وفادار ہیں۔

امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے ظہور کا انتظار صرف وقت گزرنے کا نام نہیں، بلکہ ایک فکری، روحانی، اور عملی جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن کچھ افراد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تھک جاتے ہیں، مایوس ہو جاتے ہیں یا گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے لائحہ عمل یہ ہونا چاہیے کہ وہ انتظار کو محض ایک تاریخی واقعہ کے منتظر رہنے کے بجائے اپنے باطن، فکر، اور کردار کی مسلسل اصلاح کے عمل میں بدل دیں۔

پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے عقیدے کی تجدید کریں۔ ظہور کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ ایک شخصیت ظاہر ہوگی، بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ حق کا عالمی ظہور ہوگا، عدل غالب آئے گا، اور باطل کا خاتمہ ہوگا۔ جو لوگ تھک جاتے ہیں اُنہیں چاہیئے کہ وہ دوبارہ اس سوال پر غور کریں کہ کیا وہ صرف ظاہری نجات دہندہ کے منتظر تھے، یا وہ واقعی عدل، تقویٰ، اور توحید کے نظام کے قیام کے خواہشمند ہیں؟ اگر وہ واقعی امام کے مقصد کے حامی ہیں تو اُنہیں اپنے کردار کو اُس مقصد کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

دوسرا اہم قدم یہ ہے کہ علم و بصیرت میں اضافہ کیا جائے۔ گمراہی اکثر جہالت سے جنم لیتی ہے۔ اگر انسان قرآن، اہل بیتؑ کی سیرت، اور دینی تعلیمات کو شعوری طور پر سمجھنے کی کوشش کرے، تو اس کا عقیدہ کمزور نہیں ہوتا بلکہ مزید گہرا ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو چاہیے کہ وہ اپنے دین کے بنیادی اصولوں کو مضبوط کریں، عصرِ غیبت کے فلسفے کو سمجھیں، اور امامت کے جامع مفہوم پر تدبر کریں۔

تیسرا قدم عملی تعلق کا قیام ہے۔ انتظار صرف زبانی نہیں ہونا چاہیے بلکہ عملی ہونا چاہیے۔ نماز باجماعت، صداقت، امانت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، سماجی عدل، اور ظالم کے خلاف کھڑا ہونا—یہ سب اس عملی انتظار کا حصہ ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اصولوں سے کٹ جائے تو وہ نہ صرف ظہور سے دور ہو جاتا ہے، بلکہ خود گمراہی کے دلدل میں جا گرتا ہے۔

چوتھا نکتہ روحانی تربیت ہے۔ امامؑ کا حقیقی منتظر وہی ہو سکتا ہے جو اپنے نفس کا مجاہد ہو، جس نے اپنی خواہشات، غصے، حسد، تکبر، اور دنیا پرستی پر قابو پایا ہو۔ ایسے افراد جو مایوس ہو جاتے ہیں اُنہیں چاہیے کہ وہ دعا، توبہ، مناجات، اور تذکیۂ نفس کے ذریعے اپنے دل کو منور کریں تاکہ امامؑ سے روحانی تعلق دوبارہ قائم ہو۔

آخر میں، یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انتظار ایک اجتماعی تحریک ہے۔ انسان جب تنہا ہو جاتا ہے تو کمزور پڑتا ہے۔ ایسے افراد کو چاہیے کہ وہ باایمان افراد کی مجالس میں شریک ہوں، ایسے دینی مراکز یا تحریکات کا حصہ بنیں جو امامؑ کے راستے پر کام کر رہی ہیں، تاکہ وہ تنہائی سے نکل کر امید، عمل، اور ہدایت کے ماحول میں داخل ہوں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "جو امام قائمؑ کے انتظار میں مر جائے، وہ اس طرح ہے جیسے وہ اُن کے خیمے میں تلوار لے کر دشمن سے جنگ کر رہا ہو۔" اس حدیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ انتظار صرف بیٹھے رہنے کا نام نہیں، بلکہ میدان میں ڈٹے رہنے کا نام ہے، چاہے وقت کتنا بھی طویل کیوں نہ ہو۔ جو لوگ تھک جاتے ہیں، اُنہیں چاہیئے کہ وہ خود کو نئے سرے سے متحرک کریں، ورنہ وقت اُنہیں تاریخ کے کنارے پھینک دے گا اور قافلۂ امامؑ آگے بڑھ جائے گا۔

لبرل سیکیولرازم کے داخلی تضادات اور اس نظریئے سے نجات کا طریقہ

لبرل سیکیولرازم بظاہر آزادی، مساوات، اور عقلی سوچ کی حمایت کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس کے ماننے والوں کی زندگیوں میں گہرے تضادات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ نظریہ انسان کو فردِ واحد کے طور پر دیکھتا ہے جو اپنے فیصلوں میں آزاد ہے، مگر عملی طور پر یہ آزادی صرف اُس حد تک دی جاتی ہے جہاں وہ موجودہ نظام کی معاشی، ثقافتی اور سیاسی طاقتوں سے نہ ٹکرائے۔ لبرل افراد، ایک طرف مذہب اور اقدار کو ذاتی معاملہ قرار دیتے ہیں، لیکن دوسری طرف وہ معاشرتی ڈھانچے، میڈیا، اور تعلیمی نظام میں مخصوص غیر مذہبی یا مغربی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ تنوع اور رواداری کا نعرہ لگاتے ہیں، مگر اسلامی شناخت یا شعائر کی سوشیل اور قانونی سطح پر جگہ محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہاں تک لبرل سیکیولر معیشت کا تعلق ہے، اس کا بنیادی فلسفہ انفرادی آزادی اور مساوی مواقع پر زور دیتا ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام سے جُڑنے کے بعد یہ فلسفہ خود اپنے اصولوں کی نفی کرنے لگتا ہے۔ آزاد منڈی کی معیشت میں طاقتور ادارے اور کارپوریشنز غریب طبقے کو دبا کر رکھتے ہیں، جس سے مساوات کا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔ آزادی کا تصور اس وقت بیکار ہو جاتا ہے جب تعلیم، صحت، اور ملازمت جیسی بنیادی سہولتیں دولت کی بنیاد پر محدود ہو جائیں۔ سرمایہ دارانہ حرص اور منافع کی دوڑ لبرل سیکیولرازم کے اخلاقی اور فکری دعووں

کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ اس طرح لبرل سیکیولر معیشت اپنے ہی فلسفیانہ نظریات، جیسے انصاف، آزادی اور مساوات، کے ساتھ شدید تصادم کا شکار ہو جاتی ہے۔

یہ نظام اس لیے اب تک باقی ہے کیونکہ اس نے اپنے تضادات کو چھپانے اور عوامی شعور کو مخصوص سانچوں میں ڈھالنے کا ایک مؤثر طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ لبرل سیکیولرازم نے آزادی، حقوق، اور ترقی کے خوشنما نعروں کو اس قدر بار بار دہرا کر عوام کے اذہان میں راسخ کر دیا ہے کہ لوگ اس کے اندرونی تضادات پر سوال اٹھانے کے بجائے اسی کو نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں۔ تعلیم، میڈیا، تفریح، اور ٹیکنالوجی جیسے طاقتور ذرائع کے ذریعے اس نظام نے ایک ایسا تہذیبی جال بچھایا ہے جو انسان کی فکری آزادی کو سلب کرتا ہے، مگر بظاہر اُسے مکمل آزاد دکھاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس نظام نے اپنی طاقت کا مرکز صرف اخلاقی یا نظریاتی دعووں میں نہیں بلکہ مالیاتی اداروں، عسکری قوتوں، اور سیاسی گٹھ جوڑ میں رکھا ہے۔ جو بھی اس نظام کے خلاف مؤثر مزاحمت کرتا ہے، اُسے یا تو ختم کر دیا جاتا ہے یا پھر اُسے اسی نظام کا حصہ بنا کر بے اثر کر دیا جاتا ہے۔

اس نظام کی بقا کا ایک اور راز انسانی خواہشات کو بڑھاوا دینا اور روحانی خلا کو وقتی لذتوں اور مادی آسائشوں سے بھرنے کی چالاکی میں پوشیدہ ہے۔ لوگ اپنی اندرونی بے سکونی کو محسوس تو کرتے ہیں، مگر اسے کسی اعلیٰ مقصد یا الٰہی ہدایت سے جوڑنے کے بجائے، مزید سہولتوں، آزادیوں، یا لذتوں کی تلاش میں گم رہتے ہیں۔

یوں یہ نظام بظاہر خود کو عقلی، منصفانہ اور ترقی پسند کہہ کر اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے، جبکہ اندر سے وہ انسان کی اصل فطرت، اس کی روحانی احتیاج، اور اس کے اجتماعی و اخلاقی ارتقا کو کچلتا چلا جاتا ہے، مگر پھر بھی باقی ہے کیونکہ اس نے شعور کو مغلوب اور حرص کو غالب کر دیا ہے۔

لبرل – سیکیولرازم سے مکمل نجات تب ہی ممکن ہے جب فرد اور معاشرہ اپنے فکری، روحانی اور تہذیبی شعور کو دوبارہ بیدار کرے اور مادّی ترقی کے فریب سے نکل کر حقیقی انسانیت، الٰہی ہدایت، اور فطری فہم کی طرف لوٹے۔ یہ نجات محض سیاسی یا معاشی انقلاب سے نہیں آئے گی بلکہ ایک فکری و اخلاقی بیداری کے ذریعے حاصل ہو گی جو فرد کے دل و دماغ میں تبدیلی لائے۔

سب سے پہلے، ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ مغربی لبرل – سیکیولرازم کی جڑیں انسان کی خواہشات، خود مختاری، اور خدا سے بیزاری میں پیوست ہیں۔ اس کا توڑ صرف ایک ایسے نظامِ فکر و حیات سے ممکن ہے جو انسان کو اس کی اصل حقیقت سے روشناس کرائے — یعنی وہ عبدِ خدا ہے، اور اس کی آزادی صرف اسی وقت بامعنی ہے جب وہ الٰہی حدود کے اندر ہو۔

یہ نجات قرآن، سنتِ معصومین علیہم السلام، اور اہلِ بیت کے قائم کردہ عدل پر مبنی نظام کے قیام سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ فرد کو پہلے اپنے اندر ایمان، تقویٰ، معرفتِ امام، اور شعورِ وقت پیدا کرنا ہو گا۔ جب دل خدا کی یاد سے آباد ہو اور عقل امامِ وقت کے علم سے منور ہو، تب ہی فرد ایک ایسا کردار ادا کر سکتا ہے جو ظالم تہذیبوں کو للکار سکے۔

معاشرتی سطح پر یہ نجات تبھی ممکن ہے جب تعلیمی نظام، میڈیا، معیشت اور سیاست کو الٰہی اصولوں پر استوار کیا جائے۔ یہ کام تدریجی، مستقل، اور قربانیوں سے بھرپور ہو گا۔ امام مہدی (عج) کے ظہور کی تیاری بھی اسی شعوری و فکری بیداری سے مشروط ہے۔ جب معاشرہ ظلم کے خلاف فقط احتجاج نہیں، بلکہ عملی طور پر عدل پر مبنی ایک متبادل نظام کو اپنانے کے لیے تیار ہو گا، تب ہی یہ نظام گرے گا۔

لہٰذا نجات کا راستہ صرف رد سے نہیں، بلکہ ایک صالح، عادل، روحانی اور عقلانی متبادل کی تعمیر سے ممکن ہے — جو اسلامِ ناب محمدی (ص) کے سائے میں پروان چڑھے۔

امام برحق سے بنا تعلق تمام عبادات بے کار ہیں

ہدایت ایک ایسی نعمت ہے جو انسان کو محض اچھے اور برے کے فرق سے آگاہ نہیں کرتی بلکہ اسے صحیح راہ پر چلنے کی سمت عطا کرتی ہے۔ قرآن مجید نے ہدایت کو نور، روشنی، اور راستہ قرار دیا ہے، جو انسان کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو "ہدایت دینے والے" قرار دیا گیا ہے، یعنی وہ صرف احکامات نہیں بتاتے بلکہ انسان کی روح اور وجود کو ایک مخصوص سمت، ایک مرکز کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہ مرکز اللہ تعالیٰ کی قربت ہے، اور اس قربت کا مظہر و ذریعہ امام برحق ہے، جو ہر دور میں انسانوں کے لیے اللہ کی طرف جانے والی واحد محفوظ شاہراہ ہوتا ہے۔

جب ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس کی سب سے پہلی شرط قبلے کی طرف رخ کرنا ہے۔ ظاہری طور پر اگر نماز میں کوئی کمی بھی نہ ہو، کوئی سستی نہ ہو، خشوع و خضوع بھی موجود ہو، مگر اگر رخ قبلہ کی طرف نہ ہو تو شریعت کے نزدیک وہ نماز باطل ہے۔ اسی طرح، زندگی میں انسان جو بھی نیکی کا کام کرے، وہ روزہ ہو یا زکات، حج ہو یا صدقہ، تہجد ہو یا اذکار — اگر ان تمام اعمال کی سمت درست نہ ہو تو وہ اعمال بھی قبلے سے ہٹے ہوئے نماز کی طرح بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کی شکل باقی رہتی ہے مگر روح ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان سب اعمال کا اصل مقصد اللہ کی رضا ہے، اور اللہ کی رضا صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ہم اس کے معصوم

نمائندے یعنی امام وقت علیہ السلام کی معرفت اور ان کی طرف رجوع کے ساتھ اعمال انجام دیں۔

سمت صرف ایک فکری یا نظریاتی تصور نہیں، بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ جو شخص اپنے عمل کی سمت نہیں پہچانتا وہ اپنی تمام توانائی، وقت، عبادت، ریاضت، یہاں تک کہ قربانی جیسے عظیم عمل بھی ایک ایسی راہ پر صرف کر رہا ہوتا ہے جو اسے منزل تک نہیں لے جاتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک قیمتی ہدیہ لے کر کسی ایسے دروازے پر پہنچے جہاں سے قبولیت کا کوئی امکان ہی نہ ہو۔ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی طرف توجہ، ان کی معرفت، ان کی اطاعت اور ان کے ظہور کی تمنا ہی وہ سمت ہے جس کے بغیر نیکیاں اپنی معنویت کھو دیتی ہیں۔

دنیا کے مال و دولت کو صدقہ کر دینا، مسلسل نماز و روزہ میں مشغول رہنا، ہر سال حج کرنا، اور یہاں تک کہ شب و روز مجلس عزاداری برپا کرنا اگر امام وقت کی معرفت اور ان کے مشن کے ساتھ مربوط نہ ہوں تو یہ سب ظاہر پرستی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امام وہ قطب ہے جس کے گرد تمام عبادات کو گردش کرنی ہے، وہ قبلہ ہے روحانیات کا۔ اگر ہم اس قبلے سے غافل ہو گئے تو ہماری عبادتیں وہی حیثیت رکھیں گی جو جسم میں روح کے بغیر ہوتی ہے۔

لہٰذا، حقیقی ہدایت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی تمام عبادات، نیکیوں، قربانیوں، عزاداریوں، اور زندگی کے ہر شعبے کو امام وقت علیہ السلام کی اطاعت اور قربت کے سانچے میں ڈھال دے۔ تب جا کر وہ نماز، وہ روزہ، وہ صدقہ اور وہ حج بھی اللہ کی بارگاہ

میں قبولیت کے شرف کو حاصل کرے گا، ورنہ سب کچھ محض ایک رسمی عمل رہ جائے گا جس کی نہ دنیا میں روشنی ہو گی نہ آخرت میں نجات۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے ہر عمل سے پہلے یہ طے کریں کہ ہماری نیت اور ہماری توجہ کس سمت میں ہے۔ اگر وہ سمت امام زمانہ علیہ السلام کی طرف ہے، تو وہی عمل ہمیں خدا کے قریب کرے گا۔ اگر ہم نے امام کو چھوڑ کر عبادت کے میدان میں قدم رکھا تو گویا ہم نے قبلے سے رخ پھیر لیا، اور قبلے سے ہٹی ہوئی نماز اللہ کو منظور نہیں۔ سمت ہی عبادت کی روح ہے، اور امام ہی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ یہی ہدایت ہے، اور یہی نجات کا راستہ۔

جب امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف پردۂ غیبت میں ہیں، تو ان کی غیبت کا یہ مطلب نہیں کہ امت بغیر راہنما یا ہدایت کے چھوڑ دی گئی ہے۔ جس طرح زمین کبھی بھی حجتِ خدا سے خالی نہیں ہوتی، اسی طرح امام کی غیبت کے دوران بھی ان کے نائبین کے ذریعے امت کی ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دی کہ دورانِ غیبت ان فقہاء کی طرف رجوع کریں جو دین کے عالم، نفس کے نگہبان، نفس پر غالب اور شیطان سے بچنے والے ہوں۔ یہی فقہاء، امام کے نائب کے طور پر، امت کے لیے قبلہ کا تعین کرتے ہیں اور راستہ دکھاتے ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا امام کی طرف رجوع ہے، اور ان کی اطاعت امام کی اطاعت ہے۔

ولایتِ فقیہ اسی سلسلہ ہدایت کی ایک زندہ علامت ہے۔ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے اس مفہوم کو عملی شکل دی، جب انہوں نے قرآن و سنت، عقل و اجماع کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا کہ دورِ غیبت میں حکومت اور رہنمائی کا حق اسی فقیہ کو ہے جو عدل، تقویٰ، علم، اور

زمانہ شناسی کے ساتھ دین و دنیا کو امام کی نیابت میں سنبھال سکے۔ یہ ولایت فقط ایک سیاسی نظریہ نہیں بلکہ ایک روحانی، فکری اور شرعی سمت ہے۔ جس طرح نماز میں قبلہ کی سمت کے بغیر نماز کا تصور نہیں، اسی طرح عصرِ غیبت میں ولایت فقیہ کی اطاعت کے بغیر دینی زندگی کی راہ متعین نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص عبادتوں میں مشغول ہو، صدقات دیتا ہو، حج کرتا ہو، اور عزاداری کرتا ہو، مگر زمانے کے ولی کو پہچانے بغیر، ان کی اطاعت کے بغیر زندگی گزارے، تو وہ حقیقتاً اپنی روحانی سمت سے بے خبر ہے۔

امام زمانہؑ کے ظہور کی تیاری کا سب سے بنیادی مرحلہ یہی ہے کہ ہم ان کی نیابت میں مقرر ولی فقیہ کے زیرِ سایہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منظم کریں۔ امام کی مرضی اور قربت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ہم اس نظام کا حصہ بنیں جسے امامؑ نے اپنے دورِ غیبت میں ہماری رہنمائی کے لیے باقی رکھا ہے۔ ولایت فقیہ، امام کی غیبت میں وہ روشن چراغ ہے جو اندھیروں میں حق کا راستہ دکھاتا ہے، اور ہمیں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ یہی چراغ ہمیں امام کے ظہور کے قابل بناتا ہے، اور ہماری عبادات کو ایک مرکز، ایک جہت، اور ایک قبولیت کی سمت عطا کرتا ہے۔ اس سمت کے بغیر سب کچھ فقط ایک خالی خول بن جاتا ہے، جس میں نہ روح ہوتی ہے نہ اثر۔ اس لیے آج کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ ہم ولی فقیہ کی قیادت کو اپنی دینی، فکری، اور عملی زندگی کا مرکز بنائیں، کیونکہ یہی غیبت میں ہدایت کی سمت ہے۔

اسلامی ثقافت، تہذیب اور تمدن

ثقافت، تہذیب اور تمدن — یہ تینوں اصطلاحات بظاہر ایک دوسرے کے مترادف معلوم ہوتی ہیں، مگر ان کے معانی، دائرہ کار اور اطلاق میں باریک مگر اہم فرق پایا جاتا ہے۔

ثقافت بنیادی طور پر کسی قوم یا معاشرے کی ذہنی، فکری اور روحانی حالت کا نام ہے۔ اس میں عقائد، رسوم و رواج، اخلاقی اقدار، زبان، ادب، مذہب، فنونِ لطیفہ، لباس، خوراک، شادی بیاہ کے طریقے اور انسانی رویّے شامل ہوتے ہیں۔ ثقافت انسان کی باطنی زندگی اور اس کے ذہنی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وہ غیر مادی اور فکری ورثہ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہے، اور ایک قوم کی پہچان بناتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ صرف مادی ترقی حاصل کر لے لیکن اپنے اخلاقی اور فکری ورثے سے کٹ جائے تو وہ ثقافتی لحاظ سے خالی ہو جاتا ہے۔

تہذیب اس ثقافت کا وہ پہلو ہے جو دوسروں کے ساتھ تعامل، آداب، سلیقہ، حسنِ اظہار اور حسنِ تعلقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انسانی رویّے کا نکھرا ہوا اور اعلیٰ روپ ہے۔ تہذیب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی ثقافت میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور سماجی حسن بھی پیدا ہو جائے۔ تہذیب، ثقافت کا وہ حصہ ہے جو انسان کو مہذب بناتا ہے، یعنی ایسا انسان جو دوسروں کے ساتھ ہمدردی، نرمی، رواداری اور وقار کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ثقافت اندرونی کیفیت ہے جبکہ تہذیب اس کا عملی اور خارجی اظہار ہے۔

تمدن مادی ترقی، سائنسی ایجادات، تکنیکی سہولیات، شہری نظم و نسق، اور انفراسٹرکچر سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کوئی قوم سڑکیں بناتی ہے، ادارے قائم کرتی ہے، ٹیکنالوجی میں آگے بڑھتی ہے، شہروں کو ترتیب دیتی ہے اور سائنسی علوم میں مہارت حاصل کرتی ہے تو یہ تمدن کہلاتا ہے۔ تمدن انسان کی ظاہری اور مادی ترقی کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ تہذیب انسان کی باطنی خوبصورتی اور اخلاقی بلندی کی علامت ہے۔ تمدن کے بغیر زندگی مشکل ہو سکتی ہے، مگر تہذیب کے بغیر زندگی بدصورت اور درشت ہو جاتی ہے۔

تینوں اصطلاحات کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ ثقافت ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس پر تہذیب تعمیر ہوتی ہے، اور تہذیب جب مادی ترقی کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو تمدن بنتی ہے۔ ایک ترقی یافتہ تمدن اگر اپنی ثقافت اور تہذیب سے خالی ہو تو وہ مشینوں اور عمارتوں کا مجموعہ تو ہو سکتا ہے، مگر ایک زندہ انسانوں کا معاشرہ نہیں۔ اسی طرح ایک اعلیٰ ثقافت اگر تمدن اور تہذیب سے محروم ہو جائے تو وہ صرف خیالات کا ذخیرہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اصل مقصود نہ صرف تمدن ہے نہ صرف تہذیب، بلکہ ایک ایسی ہم آہنگی ہے جس میں فرد کی روح، سوسائٹی کی اخلاقیات، اور قوم کی مادی ترقی سب ایک خدا پرستانہ نظام کے تحت متوازن اور مربوط ہوں۔ اسلامی تمدن دراصل ایک ایسی تہذیب کا ظہور ہے جو وحی، عقل اور فطرت کی روشنی میں اپنی ثقافت کو سنوار کر ایک روحانی و مادی نظامِ زندگی میں ڈھالتی ہے۔ اسلام کی نظر میں ثقافت، تہذیب اور تمدن محض الفاظ یا تاریخی مظاہر نہیں بلکہ یہ سب انسانی زندگی کے ان شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن میں عقیدہ، اخلاق، عمل، علم اور اجتماعیت باہم مربوط ہو کر ایک خدائی نظامِ حیات کو

ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا اطلاقی اور عملی مظہر اسلامی معاشرے کی تشکیل میں نظر آتا ہے، جو نہ صرف خدا کے احکام کی اطاعت پر قائم ہوتا ہے بلکہ اس میں انسان کی روحانی، فکری، اخلاقی اور مادی ضروریات بھی خدا کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت پوری کی جاتی ہیں۔

ثقافت کی اگر بات کی جائے تو اسلام میں ثقافت کا سرچشمہ قرآن، سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ، اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات ہیں۔ ایک اسلامی ثقافت وہ ہے جس میں توحید مرکزِ فکر ہو، انسان کی زندگی مقصد سے خالی نہ ہو، حلال و حرام کا شعور ہو، اور جہاں علم، ادب، شعر، فن، لباس، زبان، طرزِ گفتگو، طرزِ زندگی سب کچھ اللہ کی بندگی کے دائرے میں آکر اپنا رنگ اختیار کرے۔ اسلامی ثقافت کسی قوم کے رسم و رواج یا جغرافیائی حدود تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک فکری و روحانی کیفیت ہے جو انسان کے باطن کو خدا سے جوڑتی ہے اور اس کے ظاہر میں شائستگی، وقار اور دیانت داری کا رنگ بھر دیتی ہے۔

اسلامی تہذیب دراصل اسی ثقافت کا نکھرا ہوا اور سلوک یافتہ عملی روپ ہے۔ جب ایک فرد یا معاشرہ علم، ادب، اخلاق، طرزِ تعلق، حسنِ سلوک اور انسانی کرامت کے اصولوں پر عمل کرتا ہے تو وہ ایک مہذب معاشرہ بن جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی سیرتِ طیبہ، امام علی علیہ السلام کے فرامین، امام زین العابدین علیہ السلام کی دعائیں، اور دیگر آئمہ کی زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی تہذیب کا مظہر وہ ہے جہاں فرد تنہا بھی ہو تو بھی حق و عدل سے جڑا ہو، اور اجتماع میں بھی ہو تو خیر و انصاف کا علم بردار ہو۔ وہاں نہ جھوٹ ہے، نہ خیانت، نہ ظلم، نہ فحاشی، نہ غفلت — بلکہ ہر عمل کا پیمانہ خدا کی رضا ہے۔

تمدن کی جب بات آتی ہے تو اسلام میں تمدن کا مفہوم صرف سڑکیں، عمارتیں، ٹیکنالوجی یا اقتصادی ترقی تک محدود نہیں، بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جس میں عدل ہو، امن ہو، علم کی روشنی ہو، وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو، اور حاکمیت اللہ کی ہو۔ اسلامی تمدن وہ ہے جہاں حکمرانی کا اصول "اطیعو اللہ و الرسول و اولا الامر" پر ہو، جہاں علم و معرفت کو فوقیت دی جائے، جہاں معیشت سود سے پاک ہو، جہاں انصاف خریدا نہ جا سکے، جہاں کمزور کی فریاد سنی جائے، اور جہاں ترقی کا معیار فقط مال نہیں بلکہ تقویٰ اور خدمتِ خلق ہو۔

اس عملی مظہر کی روشن ترین مثال مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست ہے، جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے ایک ایسی معاشرت قائم کی جو دین و دنیا دونوں کا امتزاج تھی۔ وہاں مسجد مرکزِ فکر بھی تھی، عدالت بھی، تعلیمی ادارہ بھی اور سماجی تحفظ کا مرکز بھی۔ یہی نمونہ امام علی علیہ السلام کی حکومت میں ہمیں نظر آتا ہے اس کے بعد اس کی جھلک ایران میں انقلاب کے بعد قائم ہونے والی حکومت ملتی ہے، جہاں انتظامی نظم، اقتصادی عدل، تعلیمی فروغ، فکری آزادی اور روحانی بالیدگی ایک ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔

لہذا، اسلام کی نظر میں ثقافت وہ روح ہے جو فرد کے اندر بیداری اور خدا آشنائی پیدا کرتی ہے، تہذیب وہ روشنی ہے جو اس کے کردار میں نرمی، شائستگی اور توازن لاتی ہے، اور تمدن وہ معاشرتی سانچہ ہے جس میں یہ سب عملی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ تینوں مل کر ایک ایسے نظامِ زندگی کی تشکیل کرتے ہیں جو نہ صرف دنیا میں فلاح لاتا ہے بلکہ آخرت کی کامیابی کا زینہ بھی بنتا ہے۔

انقلابیت کب تک؟!!

بہت سے انسان یا مسلمان اس وقت تک انقلابی بنے رہتے ہیں جب تک وہ زندگی کی مشکلات، رکاوٹوں اور آزمائشوں میں گھرے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ایک اضطراب، بے چینی اور فطری ردّعمل پایا جاتا ہے جو انھیں جدوجہد، تبدیلی اور اصلاح کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ راحت اور اطمینان کی منزل کو نہیں پا لیتے۔ جیسے ہی حالات بہتر ہونے لگتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی پریشانیاں دور کر دیتا ہے، تو وہ لوگ جو پہلے خدا کو پکار رہے ہوتے ہیں، اب اس کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے انقلابی جذبات، جو درحقیقت کسی وقتی درد یا پریشانی کی پیداوار ہوتے ہیں، کمزور پڑنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے ہیں۔

یہی فطری انسانی رویہ قرآن مجید نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ جب انسان سمندر کی کشتی میں سوار ہوتا ہے اور اچانک طوفان آ جاتا ہے، تو وہ پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ خدا کو پکارتا ہے، دعا کرتا ہے، اور نجات کے وعدے کرتا ہے۔ لیکن جب خدا اُسے بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے، تو وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کس طرح عاجزی کے ساتھ اللہ سے فریاد کر رہا تھا۔ اب وہ دوبارہ دنیا کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے اور اللہ کے احسانات کا انکار کرنے لگتا ہے۔

یہ طرزِ عمل صرف ماضی کے انسانوں سے مخصوص نہیں بلکہ آج کے معاشرے میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بہت سے لوگ دین، اخلاق، انصاف اور قربانی کے اصولوں کی بات اُس وقت کرتے ہیں جب وہ کسی محرومی، ظلم یا مسئلے کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے ہی وہ طاقت، مال، عزت یا سکون حاصل کر لیتے ہیں، اُن کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ ان کا رویہ، ان کی سوچ، اور ان کی زبان کا لہجہ تک بدل جاتا ہے۔ وہ انقلابی سوچ جو مشکل حالات میں پیدا ہوئی تھی، اب آسائشوں کی نرمی میں گم ہو جاتی ہے۔

ایسے افراد کے انقلاب کی بنیاد دراصل جذبات اور وقتی حالات پر ہوتی ہے، نہ کہ ایمان، بصیرت اور اصولی نظریے پر۔ قرآن کریم ان رویّوں کی نشاندہی کر کے ہمیں خبردار کرتا ہے کہ انقلاب اور اصلاح کی راہ میں سچائی، استقامت اور مسلسل خضوع و خشوع لازم ہے، نہ کہ صرف مصیبت کے وقت کی وابستگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقی مومن اور وقتی انقلابی کے درمیان فرق ظاہر ہوتا ہے۔

مرتد یہی شخص ہوتا ہے جو دین کو قبول کرنے کے بعد اُس سے علانیہ انکار کر دیتا ہے۔ اُس کے ارتداد کی جڑ اکثر مفاد پرستی، دنیاوی آسائشوں کا حصول یا کسی وقتی جذباتی وابستگی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ شخص جس نے کسی بحران، جنگ، یا ظلم کے خلاف کھڑے ہو کر دین کو قبول کیا تھا، لیکن جب اسے طاقت، مقام یا راحت ملی تو اُس نے دین کی ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا شروع کر دیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب اُس کی حاجتیں پوری ہو چکی ہیں، اب اُسے اللہ، رسول یا دینی اصولوں کی ضرورت نہیں رہی۔ اس فکری زوال کی انتہا ارتداد ہے، یعنی دین سے مکمل انکار۔

انقلابی ارتداد کا نفسیاتی تجزیہ ہمیں انسانی نفس کی اُن گہری پرتوں تک لے جاتا ہے جہاں خواہش، خوف، توقع، محرومی، اور شناخت کی تشکیل جیسے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ عام طور پر جب کوئی شخص ظلم، ناانصافی یا محرومی کا شکار ہوتا ہے، تو اُس کے اندر ایک فطری اضطراب جنم لیتا ہے جو اُسے انقلابی سوچ کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ انقلاب بسا اوقات ایک نفسیاتی ردعمل ہوتا ہے، جو وقتی جذبات، غصے یا معاشرتی دباؤ کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ اس میں شعور کی گہرائی اور اصولی بصیرت کی کمی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ جذبہ پائیدار ثابت نہیں ہوتا۔

انقلابی جذبہ اگر فقط وقتی جذبات یا ذاتی محرومی پر قائم ہو تو جیسے ہی وہ شخص کسی حد تک اپنی خواہش پوری کرلیتا ہے، یا اُسے طاقت، مقام، یا معاشرتی قبولیت حاصل ہو جاتی ہے، تو اُس کا نفس مطمئن ہو کر واپس آرام طلبی، خود پرستی یا مفاد پرستی کی طرف لوٹنے لگتا ہے۔ یہاں پر ارتداد کی بنیاد پڑتی ہے۔ ایسے لوگ دراصل کسی اصول یا نظریے کے وفادار نہیں ہوتے بلکہ اپنے احساسِ محرومی یا غصے کے وفادار ہوتے ہیں، اور جب وہ احساس ختم ہو جاتا ہے تو ان کی وفاداری بھی ختم ہو جاتی ہے۔

نفسیاتی طور پر انقلابی ارتداد اکثر تین عناصر سے جنم لیتا ہے:

اول، "احساسِ مفاد" جو انسان کو دین یا انقلاب کی طرف فقط اس لیے مائل کرتا ہے کہ اس میں اُسے نفع نظر آتا ہے۔

دوم، "احساسِ شناخت" جب انسان ایک گروہ، نعرے یا لیڈر کے ساتھ اپنی شناخت جوڑ لیتا ہے اور ذاتی شعور کو فروغ نہیں دیتا، تو وہ جب شناخت کے اس ماڈل سے مایوس ہوتا ہے تو ارتداد کا شکار ہو جاتا ہے۔

سوم، "احساسِ تھکن" یعنی مسلسل جدوجہد، مخالفت یا قربانی سے پیدا ہونے والی ذہنی تھکن، جو انسان کو راہِ حق سے پیچھے ہٹنے پر آمادہ کرتی ہے۔

مزید برآں، نفسِ انسانی اکثر "راحت" اور "پناہ" کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب وہ دین یا انقلاب کو فقط نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اُسے اپنی آزمائش یا مجاہدے کا میدان نہیں مانتا، تو جیسے ہی اُسے استقامت اور قربانی کی طلب سامنے آتی ہے، وہ پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بارہا "صبر" اور "ثبات" کی تلقین کی گئی ہے، کیونکہ یہ ارتداد کے خلاف سب سے مؤثر نفسیاتی تریاق ہیں۔

لب لباب انقلابی ارتداد کا نفسیاتی سبب دین یا تحریک سے زیادہ "خود انسان کی باطنی تربیت، نیت کی گہرائی، اور نفس کے ساتھ تعلق کی نوعیت" میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنے نفس کی اصلاح نہیں کرتا، اپنے ہدف کو اللہ کی رضا سے جوڑ کر ذاتی مفاد سے آزاد نہیں کرتا، اُس وقت تک وہ کسی بھی انقلابی تحریک کا سچا وفادار نہیں بن سکتا، چاہے وقتی طور پر وہ کتنا ہی جوش و خروش دکھائے۔

خلاصتا انسانی شخصیت میں جب انقلاب کی روح بیدار ہوتی ہے تو وہ عام طور پر کسی خاص دکھ، ظلم، ناانصافی یا بحران کے ردعمل میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسے میں انسان کا سارا جذبہ اور

جدوجہد اس ایک مخصوص مسئلے کے گرد گھومنے لگتی ہے، اور وہ اُسی مقصد کے حصول کو اپنی کامیابی سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، یا حالات بہتر ہو جاتے ہیں، تو اس کی وہ حرارت، اخلاص اور تحرک ختم ہونے لگتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات وہ شخص واپس اسی بے حسی، خود غرضی اور غفلت کی حالت میں لوٹ آتا ہے جس کے خلاف وہ کبھی اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ کیفیت دراصل ایک انقلابی ارتداد ہے، یعنی انقلاب سے واپسی، یا اُس روحانی بیداری کا زوال۔

اس ارتداد سے بچنے کا ایک مؤثر طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے ہدف کو محدود اور وقتی مطالبات تک مقید نہ کرے بلکہ اُسے وسعت دے، اُس کی گہرائی اور معنویت کو سمجھے، اور اُسے کسی اعلیٰ دینی، فکری اور اخروی مقصد سے جوڑے۔ جب کسی انقلابی یا اصلاحی تحریک کا مرکز فقط دنیاوی آسائش، قومی فخر، یا وقتی انصاف ہو، تو وہ مقصد کے حصول پر یا ناکامی کی صورت میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر مقصد کو اللہ کی رضا، انسانیت کی نجات، اور قیامت کی جوابدہی کے شعور سے جوڑ دیا جائے تو وہ انقلاب وقتی نہیں رہتا بلکہ دائمی جہت اختیار کر لیتا ہے۔

قرآن کریم نے اسی لیے اہل ایمان کو بار بار اخلاص، استقامت، اور آخرت پر نگاہ رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ مومن کی جدوجہد صرف کسی سیاسی تبدیلی یا وقتی فائدے کیلئے نہ ہو بلکہ اُس کی نیت یہ ہو کہ وہ ظلم کو مٹا کر عدلِ الٰہی کو نافذ کرے، وہ جہالت کو ختم کر کے نورِ ہدایت کو پھیلائے، اور وہ اپنے نفس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اللہ کے نظام کو قائم کرے۔ جب مقصد اتنا بلند ہو جاتا ہے تو چھوٹی چھوٹی کامیابیاں یا وقتی

ناکامیاں اُس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں، بلکہ وہ ہر مرحلے کو ایک آزمائش سمجھ کر آگے بڑھتا ہے۔

ہدف کو وسعت دینے کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کیلئے سوچے، قوم، امت اور انسانیت کے وسیع تر مفاد کو پیش نظر رکھے، اور انقلاب کو صرف ایک احتجاج یا نعرہ نہیں بلکہ ایک مسلسل فکری، اخلاقی اور روحانی سفر سمجھے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب انسان کا تعلق صرف حالات سے نہیں بلکہ حق سے ہو، اور اُس کا مرکز صرف مسائل نہیں بلکہ مقاصد ہوں۔ ایسی وسعت فکر ہی اُس کے انقلاب کو دوام بخشتی ہے اور اُسے ارتداد یا مایوسی سے بچاتی ہے۔

عقل و نقل کی نظر میں امام زمانہ عج کا وجود مقدس

جدید دور کی منتشر حالات اور دگرگون کیفیت کے تناظر میں حجتِ خدا کے وجود پر عقلی دلیل سب سے اہم ہے کیوں دنیا کی اقلیت (یعنی شیعہ اثنا عشری) ہے جو صرف ان آیات و روایات کو مانتی ہے جو حجت خدا سے مربوط ہیں اور بہتر ہے کہ ہم عقلی دلائل کو فروغ دیں تا کہ غیر شیعہ و غیر مسلم افراد بھی اس مسئلہ کا ادراک کر سکیں کیونکہ ہم اس دور میں رہ رہے ہیں جہاں دنیا بھر میں افرا تفری، اخلاقی بحران، اور بے سکونی کے حالات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے حجتِ خدا کا تصور انسانی فطرت، کائناتی نظام اور فلسفۂ ہدایت کے لحاظ سے ایک نہایت منطقی، عقلی اور ضروری حقیقت نظر آتا ہے۔

سب سے پہلی دلیل کائناتی نظام کے توازن اور ضرورت سے متعلق ہے۔ کائنات میں ہر چیز ایک مخصوص مقصد کے تحت ترتیب دی گئی ہے، اور ہر موجود کا کوئی نہ کوئی حکمت یا غرض ہے۔ خدا کی سنت کے مطابق، اس کا کوئی بھی عمل بے مقصد یا بے حکمت نہیں ہوتا۔ اگر زمین پر معقولیت اور ہدایت کی کوئی ٹھوس اور مستقل بنیاد نہ ہو، تو سوسائٹی کا نظام بکھر جاتا ہے۔ اگر ہر فرد، ہر حکومت، یا ہر ادارہ اپنی مرضی سے چلنے لگے تو نتیجتاً انسانوں میں اختلافات، جنگیں، اور اخلاقی انحطاط بڑھیں گے۔ اس بحران کے دوران، ایک ایسی حجت کی ضرورت ہوتی ہے جو انسانوں کو ہدایت دے، انہیں توازن قائم رکھنے میں مدد دے، اور اللہ کے قوانین کی پیروی کا صحیح راستہ دکھائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حجتِ خدا کا وجود ضروری

ہے تاکہ رہنمائی اور توازن کے اصول ہر دور میں قائم رہیں، جو خاص طور پر اس وقت کے لیے لازم ہے جب دنیا میں بے شمار مفادات اور نظریات کی موجودگی ہو۔

دوسری دلیل ہدایت کی ضرورت اور انسانی فطرت سے متعلق ہے۔ انسانی فطرت میں سوالات کی بھرمار، اخلاقی انحطاط، اور معنوی بحران کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مکمل رہنمائی کا فقدان ہے۔ انسان جب تک اپنے اصل مقصد (خدا کی رضا) کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اس کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے ایک آسمانی رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہر فرد اپنے ذاتی نظریات پر زندگی گزارتا، تو اس کے نتیجے میں اختلافات جنم لیتے اور معاشرہ کبھی سکون کی حالت میں نہیں آتا۔ ان اختلافات کے حل کے لیے ایک عادل امام یا حجتِ خدا کی موجودگی ضروری ہے۔ اس طرح حجتِ خدا لوگوں کو اس دنیا میں صحیح رہنمائی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ زندگی کو حقیقت میں اس کے حقیقی مقصد کے مطابق گزار سکیں۔

تیسری دلیل انسانوں کی روحانی ضرورت سے متعلق ہے۔ انسان جتنا بھی ترقی کرے، اُس کی بنیادی ضروریات میں انسیت (روحانیت، ہدایت اور ایک مقصد) کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ کسی معاشرے کی ترقی کا ایک اہم پہلو اس کا روحانی توازن ہوتا ہے، جو جدید دنیا میں کہیں نہ کہیں متزلزل نظر آتا ہے۔ معاشرتی اور فردی سطح پر اس خالی پن کو پورا کرنے کے لیے ایک حجتِ خدا کا ہونا لازم ہے تاکہ انسانوں کو حقیقی معنوں میں سکون اور توازن مل سکے۔ جدید دور میں جو پریشانی اور مفادات کا تصادم دکھائی دیتا ہے، وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک کامل رہنما کی ضرورت ہے جو انہیں غلط راستوں سے بچا کر صراط مستقیم کی طرف لے جائے۔

چوتھی دلیل اخلاقی فساد اور اس کی اصلاح سے متعلق ہے۔ دنیا میں جتنے بھی اخلاقی فساد اور نظام کے بحران ہیں، ان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی صحیح رہنمائی فراہم کرنے والا کوئی رہنما موجود نہیں۔ معاشرتی اور فردی سطح پر مروج ہونے والے اخلاقی بحران کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ انسانوں کو سچائی، عدلیہ، اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کے بارے میں صحیح رہنمائی نہیں مل رہی۔ حجتِ خدا کا وجود اس صورت حال کا جواب دیتا ہے کیونکہ وہ نہ صرف انسانوں کو اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے کی ترغیب دیتا ہے بلکہ اس کی رہنمائی سے وہ ظلم، فساد اور انصافی نظام کو درست کیا جاسکتا ہے۔

پانچویں دلیل تاریخی تسلسل اور مذہبی رہنمائی سے متعلق ہے۔ تاریخی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی انسانیت کی فلاح کے لیے کوئی مشکل گھڑی آئی، اللہ نے اپنی حجت کو بھیجا تا کہ لوگوں کو ہدایت دی جائے۔ چاہے وہ حضرت آدم علیہ السلام ہوں، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسی علیہ السلام یاحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہر ایک زمانے میں ایک ہدایت دینے والا (حجت) موجود رہا۔ موجودہ دور میں بھی انسانیت کے اخلاقی، نفسیاتی اور معاشی بحرانوں کے حل کے لیے ایک رہنما کی ضرورت ہے، جو امام مہدی علیہ السلام کی شکل میں موجود ہے، جو ہر دور میں اللہ کے قوانین کی پیروی کرانے والا ہے۔

اس طرح جدید دور میں معاشرتی، اخلاقی، اور روحانی بحرانوں کی موجودگی میں، حجتِ خدا کا وجود ایک فطری اور ضروری حقیقت بن جاتا ہے۔ جب انسان اپنے اندر اور باہر کی بے سکونی کا شکار ہوتا ہے، ایک آسمانی رہنما ہی اسے اس بحران سے نکال کر سچائی اور عدلیہ کی

طرف رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ امام مہدی علیہ السلام کی موجودگی، جو اللہ کی طرف سے حتمی حجت ہے، اس وقت کی ضروریات اور سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

دنیا کے تقریباً تمام ادیان و مذاہب میں "آخر الزمان میں ایک نجات دہندہ (Savior / Redeemer / Messiah)" کے آنے کا تصور موجود ہے۔ ذیل میں مختلف ادیان کی معتبر کتابوں یا ان کے مقدس متون سے اس عقیدے کے حوالے درج کیے جا رہے ہیں:

یہودیت (Judaism)

کتاب: تَناخ – (Tanakh) یہود کی مقدس کتاب) عیسائیوں میں Old Testament)

حوالہ:

یسعیاہ نبی 11:1–4:

" اور یسی کے تنے سے ایک کونپل نکلے گی، اور اس کی جڑ سے ایک شاخ پھوٹے گی... وہ مسکینوں کا عدالت سے انصاف کرے گا، اور زمین کے دُکھوں کے لیے راستی سے فیصلہ کرے گا۔"

تشریح: یہود اس "کونپل" کو "ماشیح (Messiah)" سمجھتے ہیں جو آخر میں آئے گا اور ظلم کا خاتمہ کرے گا۔

عیسائیت (Christianity)

کتاب: انجیل مقدس (New Testament)

حوالہ:

متی 24:30:

" تب ابنِ آدم کا نشان آسمان پر ظاہر ہو گا... اور وہ ابنِ آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ بادلوں پر آتے دیکھیں گے۔ "

تشریح: عیسائی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (ع) دوبارہ واپس آئیں گے اور عدل و امن قائم کریں گے۔

زرتشت مذہب (Zoroastrianism)

کتاب: زند اوستا (Zand Avesta)

حوالہ:

"جب دنیا ظلم و فساد سے بھر جائے گی تب سوشیانت (Saoshyant) آئے گا، جو مردوں کو زندہ کرے گا، اور شیطان کی قوتوں کو مٹا دے گا۔ "

) اوستا– فرگرد 19، یشت 13(

تشریح: سوشیانت نجات دہندہ ہو گا، جو آخر میں ظاہر ہو گا اور حق و راستی قائم کرے گا۔

ہندو مت (Hinduism)

کتاب: بھگوت گیتا اور وشنو پوران

حوالہ:

بھگوت گیتا، باب 4، آیت 7-8:

" جب بھی دھرم کی ہانی اور ادھرم کا غلبہ ہوتا ہے، میں خود کو ظاہر کرتا ہوں... راکششوں کو فنا کرنے اور دھرم کے قیام کے لیے میں یُگ یُگ میں آتا ہوں۔"

وشنو پوران:

" کلکی اوتار سفید گھوڑے پر سوار ہو کر ظاہر ہو گا، جو برائی کو ختم کرے گا اور ستی یُگ واپس لائے گا۔"

تشریح: کلکی اوتار وہ نجات دہندہ ہے جسے ہندو آخری اوتار مانتے ہیں۔

بدھ مت (Buddhism)

کتاب: ددھ بائبل–دِ گھ نکایہ(Digha Nikaya)

حوالہ:

"میں نے بتایا ہے کہ میترِیہ بدھ آئیں گے... جو اس دنیا میں عدل، امن، اور سچائی کو قائم کریں گے۔"

تشریح: میتریہ (Maitreya) کو بدھ مت میں مستقبل کا بدھا مانا جاتا ہے، جو دنیا کو نجات دے گا۔

اسلام(Islam)

کتاب: قرآن و احادیث

قرآنی اشارہ: سورہ قصص 5:

" اور ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا، اور ہم انہیں پیشوا بنائیں، اور وارث قرار دیں۔"

احادیث نبوی:

"اگر دنیا کا ایک دن بھی باقی رہ جائے، تو اللہ اس دن کو اتنا طویل کر دے گا کہ میرا فرزند مہدی(عج) ظاہر ہو، وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا جیسا کہ ظلم سے بھری ہو گی۔"

(مسند احمد، سنن ابو داؤد، صحیح ابن ماجہ)

اہل سنت کی معتبر کتب میں درج ذیل حقائق واضح طور پر ملتے ہیں کہ:

- امام مہدی (عج) کا نام محمد بن حسن العسکری ہے۔

- ان کی ولادت 255ھ میں سامرہ میں ہوئی۔

- وہ امام حسن عسکری (ع) کے بیٹے ہیں۔

علامہ محمد بن یوسف گنجی شافعی کتاب: البیان فی اخبار صاحب الزمان:

" مہدی وہی محمد بن حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب ہیں۔ "

(البیان، باب 25)

یہ صراحت کرتی ہے کہ امام مہدی (عج) حضرت امام حسن عسکری (ع) کے فرزند ہیں، اور ان کی ولادت ہو چکی ہے۔

ابن خلکان (وفات 681ھ) کتاب: وفیات الاعیان:

" ابو القاسم محمد بن الحسن العسکری، امامیہ کے بارہویں امام ہیں۔ ان کی ولادت 255 ہجری میں ہوئی۔ "

(وفیات الاعیان، ج4، ص176)

یہ ایک معتبر تاریخی حوالہ ہے جس میں امام مہدی (عج) کی ولادت سن 255 ہجری میں ہونے کا تذکرہ ہے۔

علامہ سبط ابن جوزی حنفی (وفات 654ھ) کتاب: تذکرۃ الخواص :

" مهدی بن الحسن بن علی بن محمد بن علی الرضا "...

(تذکرۃ الخواص، ص204)

انہوں نے امام مہدی (عج) کو امام حسن عسکری (ع) کا بیٹا قرار دیا ہے، اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ولادت کے قائل ہیں۔

شبلنجی شافعی کتاب: نور الابصار :

" المهدی هو محمد بن الحسن العسکری، وُلد بسامراء فی النصف من شعبان سنة خمس وخمسین ومئتین ".

(نور الابصار، ص342)

یہ اہل سنت کے ایک اور عالم ہیں جنہوں نے امام مہدی (عج) کی ولادت 255ھ میں سامرہ میں بتائی۔

احمد بن حجر مکی شافعی کتاب: الصواعق المحرقة :

" وهو (یعنی مهدی) محمد بن الحسن، وولادته بسامراء "...

(الصواعق المحرقة، ص124)

یہ حوالہ بھی ان کی پیدائش کی گواہی دیتا ہے۔

چند مزید نقلی دلائل کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ان میں بھی یہ موضوع عقل کے نزدیک ہے۔

سورہ بنی اسرائیل، آیت 71: "يَوْمَ نَدْعُو كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا"

"جس دن ہم ہر گروہ کو اُس کے امام کے ساتھ بلائیں گے، پھر جسے اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ خوشی سے اپنا نامہ اعمال پڑھے گا اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہو گا۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کا تعلق کسی امام کے ساتھ ہو گا، جس کی بنیاد پر اس کا حساب لیا جائے گا۔ اگر قیامت کے دن ہر قوم کے ساتھ ان کا امام ہو گا، تو دنیا میں بھی ان کے لیے امام کا ہونا لازمی ہے۔ یہ ہر زمانے میں حجت کی موجودگی کا ایک اشارہ ہے۔

سورہ یٰس، آیت 12-13: "إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ"

"یقیناً ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں، اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا، ہم سب کو لکھتے ہیں، اور ہر چیز کو ہم نے ایک روشن امام میں شمار کر رکھا ہے۔"

یہ "امام مبین" صرف ایک کتابی ریکارڈ نہیں بلکہ ایک زندہ اور ہدایت دینے والی حجت کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ کئی مفسرین خصوصاً اہل بیت علیہم السلام کے ماننے والے مفسرین نے بیان کیا ہے کہ امام مبین سے مراد حجتِ خدا ہے، جو اللہ کی جانب سے علم، ہدایت اور نگرانی رکھنے والا ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ، آیت 124: "وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ"

"اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو اس نے انھیں پورا کر دکھایا، (تب اللہ نے) فرمایا: بے شک میں تجھے انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: کیا میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا: میرا یہ عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔"

یہ آیت امامت کے منصب کو نبوت کے بعد ایک علیحدہ اور اعلیٰ درجہ قرار دیتی ہے۔ اللہ نے امامت کو مخصوص کیا ظلم سے پاک انسانوں کے لیے، اور اس کا عطا کرنا اپنی مرضی و انتخاب کے ساتھ مشروط کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کا ہونا اللہ کی طرف سے ایک لازمی سلسلہ ہے، جو ہر دور میں جاری رہتا ہے تاکہ لوگوں پر اللہ کی حجت قائم رہے۔

نیز

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں بیان فرمایا: "لولا الحجة لساخت الأرض بأهلها"

" اگر روئے زمین پر حجتِ خدا موجود نہ ہو تو زمین اپنے اہل سمیت دھنس جائے۔ "

· اصول کافی – شیخ کلینی (رح): کتاب: الکافی، جلد: 1 باب: أنّ الأرض لاتخلو من حجة، حدیث نمبر: 7 روایت: عن عبد الله بن سنان، عن أبی عبد الله (علیه السلام) قال: "إن الأرض لا تخلو إلا وفیها إمام، کیما إن زاد المؤمنون شیئاً ردّهم، وإن نقصوا شیئاً أتمّه لهم." ثم قال: "لو أنّ الأرض خلت ساعةً واحدةً من حجّةٍ لساخت بأهلها".

· الاحتجاج– شیخ طبرسی (رح): کتاب: الاحتجاج، جلد: 2 صفحہ: 264 سیاق: امام صادقؑ کی گفتگو میں

· بحار الأنوار – علامہ مجلسی (رح): کتاب: بحار الأنوار، جلد: 23 صفحہ: 5 باب: في ضرورة وجود الحجة

امام علی علیہ السلام نے حجت خدا (امام زمانہ عج) کے متعلق فرمایا: "لَيُوَلِّيَنَّ اللهُ هَذَا الأَمْرَ قَوْمًا يَفْرَحُونَ بِهَا، وَيُحْسِنُونَ إِلَى النَّاسِ فِيهَا، فَإِذَا قَادَتْهُمْ فِي وَجْهِهِمْ أَحْدَثُوا فِيهَا قِيَاسًا، وَفَارَقُوا قُرْآنَهُمْ وَأَحْبَابَهُمْ حَتَّى تَكُونَ الْفِتْنَةُ فِي أَطْرَافِهِمْ تَفَجُّ رُؤُوسًا لِرَجُلٍ يَقُودُهُمْ"

وہ خواہشوں کو ہدایت کی طرف موڑے گا جبکہ لوگوں نے ہدایت کو خواہشوں کی طرف موڑ دیا ہو گا اور ان کی آراء کو قرآن کی طرف پھیرے گا جب کہ انہوں نے قرآن کو (توڑ مروڑ کر) قیاس ورائے کے دھڑے پر لگا لیا ہو گا۔ (اس داعی حق سے پہلے) یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ جنگ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی، دانت نکالے ہوئے اور تھن بھرے ہوئے، جن کا دودھ شیریں وخوش گوار معلوم ہو گا، لیکن اس کا انجام تلخ وناگوار ہو گا۔

نہج البلاغہ، خطبہ نمبر 136 (پہلا حصہ)

امام علی علیہ السلام کی اس پیش گوئی میں واضح طور پر امت کے اندر آنے والی مشکلات اور فتنہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ امام نے اس دور کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جب لوگ اپنی خواہشات کو ہدایت پر مقدم کریں گے، قرآن کو اپنے ذاتی مفاد اور قیاس کے مطابق لے آئیں گے، تو اس سے ایک نیا فتنہ جنم لے گا جس کا انجام تلخ ہو گا۔ امام نے اس فتنے کو "جنگ" سے تشبیہ دی ہے جو اپنے پیروں پر کھڑی ہو گی، اس میں شیرینی اور خوش گوار دودھ ہو گا، مگر اس کا نتیجہ تلخ اور ناگوار ہو گا۔

جب دنیا باصلاحیت افراد کی ناقدری کرے۔۔۔!

جو افراد اپنی محنت، اخلاص یا محبت کے بدلے میں لوگوں سے کسی خاص ردِ عمل کی توقع رکھتے ہیں، اور جب انہیں وہ سراہنا، عزت یا پذیرائی نہیں ملتی جس کے وہ امیدوار ہوتے ہیں، تو وہ اکثر مایوسی، غصہ یا ذہنی اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت رفتہ رفتہ انہیں اس حد تک لے جاتی ہے کہ وہ نہ صرف لوگوں سے بدظن ہو جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات خدا سے بھی شکوہ کرنے لگتے ہیں اور حق و حقیقت سے برگشتہ ہونے لگتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر دیکھا جائے تو اس رویے کی جڑ میں ایک ناپختہ اور غیر متوازن "خودی" (ego) کارفرما ہوتی ہے۔ ایسے افراد اپنی قدر و قیمت کو باہر کے عوامل سے مشروط کر لیتے ہیں، یعنی انہیں اس وقت تک اپنی اہمیت کا یقین نہیں آتا جب تک لوگ ان کی تصدیق نہ کریں۔ وہ اپنی شناخت کو دوسروں کی رائے، تائید یا توجہ سے جوڑ دیتے ہیں، جو کہ ایک غیر مستحکم بنیاد ہے۔

جب انسان کی خودی اس طرح دوسروں پر انحصار کرنے لگے تو وہ داخلی طور پر غیر محفوظ، جذباتی طور پر ناتواں اور فکری طور پر مشکوک ہو جاتا ہے۔ وہ نیکی کرے یا سچ بولے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اسے سراہیں، نہ کہ یہ کہ وہ سچائی اور نیکی کے اصول پر قائم رہے۔ چنانچہ جب سچائی کا راستہ اختیار کرنے پر تعریف یا کامیابی نہ ملے بلکہ تنقید یا نظر انداز

کیے جانے کا سامنا ہو، تو اس کی بنیاد ہل جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ حق کی راہ بے فائدہ ہے، کیونکہ اسے وہ دنیاوی نتیجہ نہیں ملا جس کا وہ خواہاں تھا۔

یہ مسئلہ دراصل نیت اور مقصد کے دھندلے پن سے پیدا ہوتا ہے۔ جو عمل خدا کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کے لیے ہو، اس میں وقتی فائدہ تو ممکن ہے، مگر استقامت اور روحانی سکون نہیں ہوتا۔ جب توقعات پوری نہیں ہوتیں تو انسان کو لگتا ہے کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ یا تو دوسروں سے کٹ جاتا ہے، یا بدترین صورت میں خدا سے شکوہ کرنے لگتا ہے کہ "میں نے تو تیری خاطر کیا، پھر ایسا کیوں ہوا؟" حالانکہ درحقیقت وہ "تیرے خاطر" نہیں، لوگوں کی خاطر کر رہا ہوتا ہے۔

ایسے افراد کا دل عموماً شدید جذباتی اُتار چڑھاؤ کا شکار ہوتا ہے۔ وہ بظاہر نیک و متقی دکھائی دے سکتے ہیں، مگر ان کا باطنی توازن دوسروں کے ردعمل پر اتنا منحصر ہوتا ہے کہ جیسے ہی یہ توازن بگڑتا ہے، ان کا اخلاق، سوچ اور یہاں تک کہ ایمان بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات ہمیں سکھاتی ہیں کہ انسان کو اپنے اعمال کا مقصد خالصتاً رضائے الٰہی بنانا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرے تو چاہے دنیا اسے سراہے یا نہ سراہے، وہ اپنی راہ پر قائم رہتا ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "کُن فی الفِتنة کابن اللبون لا ظهر فیرکب ولا ضرع فیُحلب" یعنی فتنوں کے وقت ایسے ہو جاؤ جیسے اونٹنی کا بچہ، جس پر نہ سواری کی جا سکتی ہے نہ دودھ دوہا جا سکتا ہے، یعنی کسی کے ہاتھ کا آلہ نہ بنو۔ یہ وہی نفسیاتی استقلال ہے جو انسان کو لوگوں کی بے قدری، مخالفت یا نظر اندازی کے باوجود حق پر قائم رکھتا ہے۔

پس، جو افراد حق سے برگشتہ ہوتے ہیں وہ دراصل اپنے نفس، جذبات اور توقعات کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی نیت کا جائزہ لینے، اپنے نفس کی تربیت کرنے، اور اپنی قدر و قیمت کو مخلوق کی بجائے خالق کی نظر میں دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ اپنے اندر سکون پا سکتے ہیں، نہ اپنی روحانی شناخت قائم رکھ سکتے ہیں۔

جب لوگ حسد، بغض اور کینے کے باعث ہماری صلاحیتوں کو نہ صرف نظر انداز کریں بلکہ ان کی کوئی قدر نہ کریں، اور نہ ہی ہمیں وہ حوصلہ افزائی دیں جو ہمارا حق ہو سکتی ہے، تو یہ صورتِ حال دل کو ٹھیس پہنچاتی ہے اور انسان فطری طور پر مایوس ہونے لگتا ہے۔ لیکن ایک مومن کے لیے اس مقام پر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی توجہ لوگوں سے ہٹا کر خدا کی طرف کرے۔

جب ہم اپنی نیت کو خالص کر کے قربتاً الی اللہ کام کرتے ہیں تو ہماری اصل توجہ یہ نہیں رہتی کہ لوگ ہمیں سراہیں یا تعریف کریں، بلکہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارا رب راضی ہو جائے۔ اس راہ میں ہمیں امام علی علیہ السلام کی وہ نصیحت یاد رکھنی چاہیے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ "العمل لایُقبل اِلا مع الاخلاص" یعنی عمل اس وقت تک مقبول نہیں ہوتا جب تک وہ خلوص کے ساتھ نہ ہو۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی کوشش کو سراہا جائے، اس کے کام کو پہچانا جائے، مگر جب یہ توقعات مخلوق سے وابستہ ہو جائیں تو دل ٹوٹتا ہے۔ یہی مقام وہ ہے جہاں ہماری روحانی تربیت شروع ہوتی ہے۔ ہمیں یہ سیکھنا ہوتا ہے کہ ہم اپنی کاوشوں کا بدلہ صرف خدا سے چاہیں، اور اگر لوگ ہمیں پہچان نہ سکیں، تب بھی ہمارا اجر ضائع نہیں ہو گا۔

سورہ البقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: * "إِنَّ اللّٰہَ لا یُضِیعُ أجرَ المُحسِنینَ" * یعنی بے شک اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

ایسے موقعوں پر امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں سے رہنمائی لینی چاہیے، خاص طور پر دعائے مکارم الاخلاق میں جب وہ فرماتے ہیں کہ " اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِهِ، وَسَدِّدْنِي لأَنْ أُعارِضَ مَنْ غَشَّنِي بِالنُّصْحِ، وَأَجْزِيَ مَنْ هَجَرَنِي بِالبِرِّ، وَأُثِيبَ مَنْ حَرَمَنِي بِالبَذْلِ" یعنی اے اللہ! مجھے توفیق دے کہ جو میرے ساتھ فریب کرے، میں اس کو نصیحت سے جواب دوں، جو مجھے چھوڑ دے، میں اس کے ساتھ نیکی سے پیش آؤں، اور جو مجھے محروم کرے، میں اسے عطا کروں۔

خلوص نیت یہی ہے کہ انسان کسی بھی کام میں اللہ کو مرکز بنالے۔ جب ایسا ہو جائے تو دنیا کی واہ واہ یا تنقید، دونوں غیر متعلق ہو جاتی ہیں۔ ہمیں ہر حال میں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہمارا رب ہمارے اعمال کو دیکھ رہا ہے، اور وہی سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔

اگر ہم اس نظریے کو اپنالیں کہ ہمارا سفر، ہماری محنت، ہمارا اخلاص، سب کچھ اللہ کی راہ میں ہے تو پھر نہ لوگوں کی بے قدری ہمیں روکتی ہے، نہ ان کی تعریف ہمیں مغرور کرتی ہے۔ ہم استقامت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتے ہیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ * "حسبنا اللہ ونعم الوکیل. * "

خود کو اسی روش پر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسلسل دعا، ذکر اور تفکر کے ذریعے اپنے دل کو جلا دیں۔ اگر ہمارے عمل کا محرک خالص اللہ کی رضا ہو، تو پھر نہ ہم حاسدوں

سے خفا ہوتے ہیں، نہ ان کی رکاوٹوں سے تھمتے ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا کی نگاہ میں ہماری قدر وہی ہے جو ہماری نیت کی گہرائی میں چھپی ہوتی ہے، نہ کہ لوگوں کے ظاہر میں۔

لہٰذا، جب دنیا ہمیں پہچاننے سے انکار کرے، تو ہم خود کو خدا کے حضور پیش کریں، کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر جاننے والا اور سب سے بڑھ کر انصاف کرنے والا ہے۔ اور جس کی قدر اللہ کرے، اُسے کسی مخلوق کی پہچان کی ضرورت نہیں۔

البتہ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں, شاگردوں, اپنے سے نچلے پوزیشنز پر فائز انسانوں کی ناقدری نہ کریں۔ اگر تعریف اور حوصلہ افزائی کے چند بول ان کی زندگی کو جہنم بننے سے روک رہے ہوں تو ہمیں اس میں کنجوسی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ عمل یقیناً صدقہ ہے اور اس کا اجر شاید ایسے باصلاحیت افراد کی زندگی بچانے اور محفوظ بنانے کے برابر تو ہو گا۔ جو تعریف نہیں کر سکتا وہ حسد میں مبتلا ہو سکتا ہے اور جب تعریف و حوصلہ افزائی انسان کے لئے فایدہ مند ہو تو اس میں کوتاہی گناہ ہے۔ چاپلوسی اور جائز تعریف میں فرق ہے، چاپلوسی مذموم جبکہ جائز تعریف حقدار کو حق دینے کے مترادف ہے۔

دین سے غفلت ہر سو رسوائی کا سبب

دین اسلام کو، جو درحقیقت ایک کامل نظامِ حیات ہے، ہم نے اپنی وقتی، محدود اور مادی ضرورتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنالیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام جن کا وجود انسانیت کے لیے مشعلِ راہ اور خدا کی جانب سے ہدایت کا چراغ ہے، اُنہیں ہم نے اپنے ذاتی مفادات، دنیاوی آسائشوں اور مال و دولت کے حصول کی سیڑھی بنا لیا ہے۔ ہم اُن کے در کے درباری بن کر مانگنے والوں کی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں، لیکن بھول گئے ہیں کہ خُدا نے ہمیں ان کے مددگار اور ان کے مقصد کے ہم رکاب بننے کے لیے چُنا تھا۔ ہم نے خود کو اس فکر سے محروم کر دیا کہ محمد و آل محمدؑ کا مشن صرف ہمیں جنت دلوانا نہیں بلکہ دنیا میں عدل و قسط کا نظام قائم کرنا تھا، وہ انسان کو خاک سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے جانے آئے تھے، لیکن ہم نے خود کو صرف خاک کا محتاج بنالیا۔

قرآن ہمیں آواز دے رہا ہے کہ ''إِنَّ اللَّـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ“ یعنی اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ لیکن ہم خود کو بدلے بغیر تقدیر بدلنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ خدا نے ہمیں اختیار و ارادہ دیا، تدبیر و عمل کی طاقت عطا کی، لیکن ہم نے اپنی بے عملی کو تقدیر کا نام دے دیا۔ ہم نے اپنی سستی، کم ہمتی اور دنیا پرستی کو "صبر" کا نام دے کر رسول و اہلبیتؑ سے ایسی عنایات کی توقع رکھ لی جو عمل کے بغیر ممکن نہیں۔

ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ اللہ کی مدد اس وقت آتی ہے جب انسان خود اپنی اصلاح کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ اگر ہم ایک قدم اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہیں تو وہ دس قدم آگے بڑھ کر ہماری مدد فرماتا ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے۔ لیکن جب ہم صرف مانگتے رہیں، محنت نہ کریں، دینی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کریں، تو یہ ہماری کم ظرفی اور دین کے تصور کا محدود فہم ہے۔ دین ہمیں فقیر بنانے نہیں آیا، بلکہ اس نے ہمیں خوددار، باوقار اور صاحبِ اختیار انسان بنانے کی جدوجہد سکھائی ہے۔

ہم نے دین کو روحانیت تک محدود کرکے، اسے ایک مجرد تجربہ بنا دیا ہے، حالانکہ قرآن نے دین کو ایک مکمل "نظام" قرار دیا ہے۔ دین صرف نماز، روزہ، حج اور دعا کا نام نہیں، بلکہ ظالمانہ نظاموں کے خلاف قیام کا نام ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے صرف آنکھیں بند کر کے شب بیداری کی تلقین نہیں کی، بلکہ ظالم کے مقابل قیام کی ترغیب دی۔ امام علی علیہ السلام نے صرف زہد و تقویٰ کی تبلیغ نہیں کی، بلکہ خلافت کی باگ ڈور سنبھالی، عدل کا عملی نمونہ قائم کیا۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ گواہ ہے کہ دین ایک اجتماعی نظام کی تشکیل کا ذریعہ ہے۔ ہمیں خدا نے محض خانقاہوں میں بیٹھنے کے لیے نہیں بلکہ میدانِ جہاد میں عدل وقسط کی حکومت قائم کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

افسوس کہ آج ہم اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے، مدینے کی گلیوں میں گم ہونے کے خواب دیکھتے ہیں، جبکہ دین ہمیں مکہ کی گلیوں میں قیام کا درس دیتا ہے، کوفہ کی محراب میں قربانی کا مفہوم سمجھاتا ہے، کربلا کے میدان میں سرفروشی کی تلقین کرتا ہے، اور سامرہ و نجف, قم و مشہد کے حجرے ہمیں جہادِ علمی و فکری کے راستے دکھاتے ہیں۔ کیا

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ہمیشہ دوسروں کی تہذیب، سیاست، اور معیشت کے پیچھے رہے؟ کیا ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کے ذہن صرف مغرب کی طاقت سے مرعوب رہیں؟ جبکہ خدا نے صاف کہا ہے کہ کفار کی دنیاوی چمک دمک سے مرعوب نہ ہو۔

آج دنیا کی بڑی بڑی ایمپائرز جنہوں نے ہمارے وسائل لوٹ کر اپنی معیشت کو بلند کیا، وہ حقیقت میں ہماری سستی، غفلت اور دینی شعور سے دُوری کا نتیجہ ہیں۔ ہم اس مقام پر ہیں کہ غیروں کی ترقی کو اللہ کی رضا سمجھ بیٹھے ہیں، جبکہ قرآن تو ان کے ساتھ جہاد کا حکم دیتا ہے، چاہے وہ فکری استعمار ہو، ثقافتی غلامی ہو یا معاشی تسلط۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دین کو فقط تعویذ، دعا اور قبر پرستی کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اسے ایک مکمل نظامِ زندگی کے طور پر اپنائیں۔ خود کو دین کا فقیر نہیں بلکہ دین کے علمبردار بنائیں۔ رسول اللہؐ اور اہل بیتؑ نے کبھی غیب سے خزانوں کے نازل ہونے کا انتظار نہیں کیا، بلکہ ہاتھ میں کدال لے کر مزدوری بھی کی، تجارت بھی کی، اور حکومت کے قیام کی کوشش بھی کی۔ یہی ہمارے لیے اسوہ اور راستہ ہے۔

اگر ہم واقعی دنیا و آخرت کی کامیابی چاہتے ہیں تو دینی نظام کے قیام کی ذمہ داری لینی ہو گی، اور ان کوششوں سے گزرنا ہو گا جو رسولؐ و اھلبیتؑ نے کیں۔ روحانیت اور مادیت کو توازن کے ساتھ اپنانے کا راز اسی میں ہے کہ ہم دینی اقدار کو فردی سطح سے بلند کر کے معاشرتی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی نظام میں راسخ کریں۔ جب تک ہم خود کو مدینے و نجف کی گلیوں کا فقیر سمجھتے رہیں گے، تب تک کبھی عزت و غلبہ حاصل نہیں ہو گا۔ عزت صرف اللہ، اس

کے رسول اور مؤمنین کے لیے ہے، بشرطیکہ ہم ان کی راہ پر چلیں اور ان کے مشن کے وارث بنیں۔ تب ہی ہم اس غلامی سے نکل کر حقیقی بندگی کے مقام پر فائز ہو سکیں گے۔

اگر ہم مدینہ و نجف کی گلیوں میں ہاتھ پھیلائے مال وزر کے فقیر بننے کے بجائے ان گلیوں سے اٹھنے والے آسمانی افکار، الہامی حکمتوں اور خدائی دانش کے طالب بن جائیں، تو یہی علم و فہم ہمیں ایسی خودی عطا کرے گا جو نہ صرف روحانی بلندیوں تک لے جائے گا بلکہ ہمیں دنیاوی نکتۂ نظر سے بھی بے نیاز اور غنی بنادے گا۔ سچ یہ ہے کہ فقر وہ نہیں جو پیسوں کی کمی سے پیدا ہوتا ہے، بلکہ فقر وہ ہے جو ذہنی، فکری اور نظریاتی احساسِ کمتری سے جنم لیتا ہے۔

ہم نے نجف اور مدینہ کو تعویذ، دعاؤں اور قبروں کا مرکز تو مان لیا، مگر انہیں علم، بصیرت اور نظامِ زندگی کی بنیاد ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ان مقامات سے تو ایسے علوم پھوٹے جنہوں نے دنیا کو عدل، حکمت اور سیاست کی نئی تعریفیں سکھائیں۔ جب ہم ان دروں سے ملنے والی دانش و بصیرت کو چھوڑ کر صرف مادی دعاؤں کی امید پر درباری بن کر بیٹھ جائیں، تو ہم اپنے کردار اور مقصد کو کھو دیتے ہیں۔ اہلبیتؑ کا پیغام کبھی یہ نہیں تھا کہ لوگ ان کے در پر صرف مانگنے آئیں، بلکہ ان کا اصل پیغام یہ تھا کہ لوگ ان کے مشن میں شامل ہو کر ان کے علم، حکمت اور قیادت کے سچے مددگار بنیں۔

ہم نے مشرکین، منافقین اور کفار کے مال و زر سے مرعوب ہو کر اپنی عزتِ نفس، فکر و عقیدہ اور دین کی خودداری کو گروی رکھ دیا۔ حالانکہ خدا نے تو واضح طور پر فرمایا کہ ان کے مال و اولاد سے مرعوب نہ ہو، یہ محض دنیاوی آزمائش و امتحان کا ذریعہ ہیں۔ ہمیں ان کے نظام سے مرعوب ہونے کے بجائے، اُن کی علمی ترقی، سائنسی اصولوں، منظم سوچ، اور

تخلیقی حکمتِ عملی سے سیکھنے کی ضرورت ہے — وہی عناصر جنہیں اصل میں ہمارے دین نے صدیوں پہلے بنیاد بنایا تھا۔ مغرب کی کامیابی کا راز اُس دینی اصول پر عمل کرنے میں تھا جسے ہم نے چھوڑ دیا، اور ان کے زوال کا آغاز اسی دن ہوا جب انہوں نے مادیت کو مقصدِ حیات بنالیا۔ ہمیں بھی اپنے مقاصد کو آخرت کے تناظر میں معین کرنا ہوگا ورنہ مغرب اور ماضی کی دیگر قوتوں کی طرح زوال پذیر ہو جائیں گے۔

آج مغرب کے زوال کی گونج ہمیں خبردار کر رہی ہے کہ اگر ہم بھی صرف دولت کو مقصد بنائیں گے، احساسِ کمتری کا شکار رہیں گے اور مال وزر کے حصول کو زندگی کی معراج سمجھیں گے، تو ہمیں بھی وہی انجام دیکھنا ہوگا جو ہر مادی اور ظالم تمدن کو آخرکار دیکھنا پڑتا ہے۔ ہمیں اس سوچ سے باہر نکلنا ہوگا کہ اہلبیتؑ صرف ذاتی نفع وضرر کے لیے ہیں۔ ہمیں ان کے علم وہدایت، ان کی سیاسی و سماجی قیادت، اور ان کے عدل و قسط کے نظام کے قیام میں شریک کار بننا ہوگا۔ ہمیں ان کے صرف زائر نہیں بلکہ ان کے سپاہی بننا ہوگا، ان کے در کے فقیر نہیں بلکہ ان کے مشن کے فکری و عملی علمبردار بننا ہوگا۔

یہ وہی حقیقی فقر ہے جسے مولا علیؑ نے فرمایا: "الفقر فخری" یعنی وہ فقر جو خودداری، ایمان، علم اور عمل کا نام ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مغرب کی ظاہری ترقی کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے رب کے نازل کردہ علم کی طرف رجوع کریں، اس علم کو سیکھیں جو قرآن واہل بیتؑ کے سینے سے جاری ہوا، جو انسان کو دنیا و آخرت میں کامیابی دیتا ہے، جو دلوں کو مطمئن کرتا ہے اور معاشروں کو عدل و انصاف سے مزین کرتا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود کو صرف دعاؤں کا محتاج ثابت کرنے کے بجائے ان دعاؤں کے اثر کو اپنی محنت، قربانی، اور عملی کوششوں سے مکمل کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خدا، رسولؐ اور اہل بیتؑ کے دست و بازو بن کر دنیا کے سامنے یہ گواہی دیں کہ ہم ان کی امامت کو ماننے والے ہیں، محض زبانی دعویدار نہیں۔ ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم اُن کے مشن، اُن کے نظام، اور اُن کے راستے کے حقیقی پیروکار ہیں، جو دنیا میں بھی قیادت کے اہل ہیں اور آخرت میں بھی کامیابی کے مستحق۔ یہی وہ فکر، یہی وہ جہاد، اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں "فقیری" سے نکال کر "ولایت" کی سربلندی کی طرف لے جاتا ہے اور ایک زمہ دار دیندار بناتا ہے۔

کمتر ثواب سے عظیم ثواب کے حصول تک

آج کے دور میں دین سے وابستگی دو بڑے رجحانات میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک طرف وہ افراد ہیں جو دین پر عمل کو محض ذاتی نجات، ثواب کمانے، اور آخرت کے انفرادی حساب کتاب تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کی عبادات، صدقات، روزے، مجالس، ذکر و دعا سب کچھ اس نیت سے ہوتا ہے کہ انہیں جنت ملے، ان کا عذاب دور ہو، ان کی مغفرت ہو جائے۔ یہ سوچ اپنی جگہ ایک فطری آغاز ہے، لیکن اگر انسان صرف اسی مرحلے میں رک جائے اور دین کے اعلیٰ تر اہداف تک نہ پہنچے تو وہ اس پیغامِ وحی کے ساتھ انصاف نہیں کرتا جو انسان کو فقط نیک بننے کے لیے نہیں بلکہ "صالح" بننے کے لیے آیا ہے — یعنی وہ شخص جو اپنے ماحول میں اصلاح لانے کی طاقت و جرأت رکھتا ہو۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کو محض ذاتی نجات کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ ایک نظامِ عدل کے قیام، اجتماعی بیداری، اور فاسد طاقتوں کے مقابلے میں ایک نظریۂ حیات کے طور پر اپنایا ہے۔ ان کے لیے عبادت صرف نماز کی ادائیگی نہیں بلکہ طاغوت کے خلاف قیام بھی ہے۔ ان کے روزے فقط بھوک پیاس کا نام نہیں بلکہ دنیاوی خواہشات اور استعماری نظام سے کنارہ کشی کا عہد ہیں۔ ان کی دعائیں فقط مغفرت کے لیے نہیں بلکہ امت کی نجات اور حق کی حکومت کے قیام کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ثواب کو اپنی منزل نہیں بلکہ راہ کے

ایک ذریعہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کا نصب العین وہ معاشرہ ہے جہاں امام مہدیؑ کا نظام نافذ ہو، جہاں ظلم نہ ہو، اور جہاں انسان، انسانیت کے ساتھ جیے۔

انفرادی عبادات سے وابستہ افراد کا دائرہ اکثر "میں" کے گرد گھومتا ہے: میری مغفرت، میری نماز، میرا روزہ، میرے اعمال۔ جبکہ اجتماعی شعور رکھنے والے افراد "ہم" کی زبان بولتے ہیں: ہماری امت، ہمارا معاشرہ، ہماری ذمہ داری، ہمارا امام۔ یہی فرق دین کی گہرائی اور اس کے سطحی فہم کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ امام حسینؑ کربلا میں فقط اپنے لیے جنت نہیں چاہتے تھے، وہ ایک فاسد نظام کو للکارنے، امت کو جگانے، اور عدل کو قائم کرنے نکلے تھے۔ اگر اُن کے پیروکار صرف ثواب کے طلبگار بن کر رہ جائیں تو وہ درحقیقت اُن کے پیغام کو محدود کر رہے ہیں۔

جو لوگ صرف انفرادی نجات کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں، وہ اکثر دشمن کے نظام کو پہچاننے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ اپنی عبادات میں مشغول رہ کر سمجھتے ہیں کہ وہ دین کی اصل روح کو زندہ رکھے ہوئے ہیں، لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ دشمن ان کے معاشروں، افکار، نسلوں، اور معیشت پر قابض ہو چکا ہے۔ وہ طاغوت کو فقط تاریخی قصے کی حد تک سمجھتے ہیں، حالانکہ طاغوت آج بھی زندہ ہے، مختلف روپ میں، مختلف اداروں میں، اور عالمی نظام کی شکل میں۔ ان سے مختلف وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کو زمانے کے تناظر میں سمجھا ہے، جو جانتے ہیں کہ امام مہدیؑ کا ظہور ایک عالمی نظام عدل کے قیام سے مشروط ہے، اور وہ اس کے لیے خود کو تیار کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ دعا اور عمل، انتظار اور قیام، عبادت اور بغاوت، سب کو ایک ساتھ چلنا ہو گا۔

لہٰذا، صرف انفرادی ثواب کی نیت رکھنے والا شخص اگر دین کے اجتماعی پہلو سے غفلت برتتا ہے تو وہ دین کی آفاقی روح سے محروم رہتا ہے۔ جبکہ وہ لوگ جو دین کو فقط نجاتِ فردی کا راستہ نہیں بلکہ نجاتِ انسانی کا ضابطہ مانتے ہیں، وہی اصل میں دین کے وارث ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مشہور حدیث کہ "جو شخص مسلمانوں کے امور کی فکر نہیں کرتا، وہ مسلمان نہیں "نہ صرف اسلامی معاشرت کی بنیاد کو بیان کرتی ہے بلکہ ان تمام فرد پرستی کے رجحانات کو بھی رد کر دیتی ہے جنہوں نے دین کو صرف ذاتی نجات اور فردی عبادات تک محدود کر دیا ہے۔ اس حدیث میں اسلام کی وہ اجتماعی روح جھلکتی ہے جس کے بغیر ایمان کامل ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص اپنی نماز، روزہ، دعا، تسبیح، زیارت اور توسل میں مشغول ہو مگر مسلمانوں کی معاشرتی، تعلیمی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زبوں حالی کی طرف سے آنکھ بند کیے رکھے، وہ دراصل دین کے صرف ایک پہلو کو تھام کر باقی پہلوؤں کو نظر انداز کر رہا ہے، اور ایسا دین ادھورا ہے، ناقص ہے، اور روحِ اسلام سے خالی ہے۔

اسلام ایک جامع دین ہے جو صرف روحانیت، خلوت، اور انفرادی ریاضت کا دین نہیں بلکہ ایک زندہ معاشرہ قائم کرنے کا نظامِ حیات ہے۔ دین کا مزاج یہ ہے کہ وہ انسان کو نہ صرف تقویٰ سکھاتا ہے بلکہ اسے ایسا صالح فرد بناتا ہے جو دنیا میں عدل، اصلاح، خدمت اور قیادت کے لیے کھڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عبادت کا مفہوم صرف نماز و روزہ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ تعلیم، عدالت، صحت، ثقافت، کھیل، معیشت اور حکومت جیسے شعبوں میں بھی کام کو عبادت کا درجہ دیا ہے بشرطیکہ وہ اخلاص اور امت کی بھلائی کے جذبے کے ساتھ کیا جائے۔

درحقیقت، مسلمانوں کی اجتماعی فلاح اور نظامِ عدل کے قیام کے لیے کی جانے والی کوشش، انفرادی عبادات سے کہیں زیادہ وزنی اور اہم ہے۔ ایک شخص اگر پوری رات شب بیداری کرے، دعائیں کرے، توسل کرے، اور تہجد کے نوافل ادا کرے، لیکن وہ کسی ظالم نظام کے خلاف خاموش رہے، کسی فاسد حکومت کی طرف سے مظلوموں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر لب کشائی نہ کرے، یا تعلیم، صحت، اور معیشت جیسے میدانوں میں امت کی زبوں حالی پر کوئی اقدام نہ کرے، تو اس کی عبادت میں وہ تاثیر کہاں ہوگی جو ایک مصلح اور قائد کی جدوجہد میں موجود ہے؟ جب امام حسینؑ نے میدانِ کربلا میں قیام کیا تو وہ نماز بھی تھی، دعا بھی تھی، اور قربانی بھی، لیکن اس کے مرکز میں حکومتِ الٰہیہ کا احیاء اور ظلم کے نظام کا انکار تھا۔ یہی قیام، دراصل نماز کی روح تھا۔ چنانچہ نماز میں "قیام" کا جو عمل ہے، وہ فقط جسمانی سیدھ کا نام نہیں بلکہ طاغوت کے خلاف قیام کا استعارہ ہے۔ شیطان کے خلاف یہ عملی قیام اس وقت حقیقت بنتا ہے جب مسلمان صرف تسبیح کے دانے نہ گنیں بلکہ زمانے کے ابلیسی نظاموں کے خلاف اپنی طاقت مجتمع کریں۔

اسلامی حکومت دراصل وہ بنیادی ستون ہے جو تمام دیگر معاشرتی اداروں کو منظم کرتا ہے۔ ایک عادل، مومن، اور الہی حکومت تعلیم کو ہدایت سے جوڑتی ہے، معیشت کو ظلم و استحصال سے بچاتی ہے، ثقافت کو فحاشی اور اغیار کی تہذیب سے محفوظ رکھتی ہے، اور صحت و کھیل جیسے میدانوں کو انسانی ارتقاء کا ذریعہ بناتی ہے۔ پس جو شخص اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کوشش کرتا ہے، وہ صرف ایک سیاسی عمل میں شریک نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت عبادت میں مصروف ہے۔ یہ کوشش نماز، روزہ، زکات، حج اور جہاد کا عملی امتزاج بن جاتی

ہے، کیونکہ وہ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ امت کی فلاح، نسلوں کی رہنمائی، اور دینِ خدا کے نفاذ کی سعی کر رہا ہے۔

لٰہذا وہ لوگ جو دین کو صرف فردی عبادات اور ثواب تک محدود سمجھتے ہیں، وہ نہ صرف دین کے اجتماعی پیغام سے محروم ہیں بلکہ اس عظیم اجر و ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں جو امت کی خدمت اور نظامِ حق کے قیام میں پوشیدہ ہے۔ دین کے سچے پیروکار وہی ہیں جو انفرادی طہارت کے ساتھ اجتماعی طغیان کا بھی مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ "اقیموا الصلوٰۃ" کا حقیقی مفہوم اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب نماز صرف عبادت نہ ہو بلکہ ایک انقلاب کا پیش خیمہ بنے، جب مسجد صرف سجدے کی جگہ نہ ہو بلکہ فکر و بیداری کا مرکز بنے، اور جب دین فقط قبر تک نہ ہو بلکہ حکومت تک پہنچے۔ یہی دین کی اصل روح ہے، یہی رسولؐ کا پیغام ہے، اور یہی امام مہدیؑ کے ظہور کی تمہید ہے۔ ایسے لوگ جو سماجی نظاموں اور ان کے مرکزی نظام سیاست و حکومت کیلئے جد و جہد کرتے ہیں امام مہدیؑ کے سچے منتظر کہلانے کے حقدار ہیں، کیونکہ وہ ظہور کے لیے فقط دعائیں نہیں مانگتے بلکہ زمین پر اس کے لیے راہ بھی ہموار کرتے ہیں۔

صوفی ازم اور اسلام ناب محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسلام ایک مکمل، جامع اور متوازن نظام حیات ہے جو نہ صرف انسان کی روحانی بالیدگی کو اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کے مادی، سماجی، سیاسی اور تمدنی پہلوؤں کو بھی یکساں اہمیت کے ساتھ منظم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت یعنی دنیا سے مکمل کنارہ کشی، گوشہ نشینی، ازدواجی و سماجی تعلقات سے فرار، اور صرف انفرادی روحانی ریاضت میں مشغول رہنے کو سختی سے منع کیا ہے۔ قرآن و سنت میں صوفی ازم کی اس انتہا پسند صورت، جس میں دنیا کو ترک کر دینا اور فقط باطنی طہارت و مراقبہ کو دین کا اصل سمجھنا شامل ہو، کی واضح تردید موجود ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لا رھبانیة فی الإسلام" یعنی "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"۔ یہ حدیث اسلامی مزاج اور اصولِ حیات کا خلاصہ ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ خلافتِ الٰہیہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا کے تمام امور میں الٰہی ہدایت کی روشنی میں فعال کردار ادا کرے—چاہے وہ معیشت ہو یا سیاست، تعلیم ہو یا صحت، عدل ہو یا امن۔ ایک مسلمان کا مقصد صرف اپنی روح کو پاک کرنا نہیں بلکہ دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دینا ہے۔ اس مشن کی تکمیل ایک فعال، اجتماعی، اور بیدار انسان سے ہی ممکن ہے، نہ کہ کسی گوشہ نشین درویش یا خانقاہی مرید سے جو دنیا کو فانی اور لاحاصل کہہ کر اس سے فرار اختیار کرتا ہے۔

صوفی ازم کی بعض شکلیں، خاص طور پر وہ جنہوں نے اسلامی تعلیمات کو ہندو دھرم، عیسائی رہبانیت، یا یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر بدل دیا، دین کی اصل روح سے متصادم ہو گئیں۔ ان میں دنیا کو فریب کہنا، شریعت سے بے نیازی کا دعویٰ کرنا، بیوی بچوں سے قطع تعلق کرنا، حتیٰ کہ بعض اوقات نماز، روزہ اور دیگر فرائضِ شرعیہ کو محض عوام کے لیے قرار دینا عام ہو گیا۔ ان عقائد اور رویوں نے دین کی اجتماعی بنیاد کو کمزور کیا اور ایک ایسی صورتِ دین پیدا کی جو بظاہر روحانیت سے بھرپور مگر حقیقت میں عمل سے خالی تھی۔

اسلام میں روحانیت ضرور ہے، لیکن وہ روحانیت جو دنیا سے منہ موڑنے کی نہیں بلکہ دنیا کو سدھارنے کی طاقت دیتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود سب سے بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ ریاست مدینہ کے بانی، جنگوں کے سپہ سالار، قاضی، مربی، شوہر، باپ، اور سیاسی قائد بھی تھے۔ ان کی زندگی میں کوئی ایک گوشہ ایسا نہ تھا جسے روحانیت کی آڑ میں ترک کیا گیا ہو۔ انہوں نے دنیا کو "مزرعۃ الآخرۃ" یعنی "آخرت کی کھیتی" کہا، اور اس کھیتی کو آباد کرنے کی ترغیب دی۔ اگر دنیا سے بھاگ جانا ہی مقصد ہوتا تو رسولؐ خود پہاڑوں میں جا بسنے کو ترجیح دیتے، لیکن انہوں نے مدینہ میں رہ کر نظامِ عدل قائم کیا، مسجد کو سماجی مرکز بنایا، اور ریاست کو عبادت گاہ میں تبدیل کر دیا۔

اسی طرح تمام انبیاء اور ائمہ معصومین خاص طور پر امام علیؑ، نہ صرف شب زندہ دار اور عابد تھے بلکہ ظلم کے خلاف قیام کرنے والے، حکومت چلانے والے اور میدانِ جنگ کے شیر بھی تھے۔ ان کی زندگی اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ اسلام ترکِ دنیا کا نام نہیں بلکہ دنیا میں رہ کر اسے اللہ کی رضا کا مظہر بنانے کا نام ہے۔

صوفی ازم کی افراط نے دین کو فردی سطح پر محدود کر دیا۔ اس نے امت کے اجتماعی شعور کو مضمحل کر دیا اور مسلمان قوم کو خانقاہوں، مراقبوں، ذکر و شغل کی دنیا میں گم کر دیا۔ وہ اقوام جو کبھی جہاد، عدل، اور اقامتِ دین کے لیے میدانِ عمل میں سرگرم تھیں، اب مزاروں، حلقہ ذکر، وجد، اور ریاضت میں پناہ لینے لگیں۔ نتیجتاً اسلامی تمدن زوال کا شکار ہوا، اور استعماری قوتوں نے نہ صرف ہماری زمینوں پر قبضہ کیا بلکہ ہمارے اذہان پر بھی غلبہ پا لیا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب مسلمان ظاہری زہد و تقویٰ کو اصل دین سمجھنے لگے اور دنیاوی نظاموں کو طاغوت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

اسلام رہبانیت کو اس لیے بھی رد کرتا ہے کہ یہ فطرتِ انسانی سے متصادم ہے۔ اللہ نے انسان کو جسم و روح کا مرکب بنایا ہے، اور دونوں کی ضروریات کو متوازن طریقے سے پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ شادی، تجارت، سماجی میل جول، تفریح، اور حکومتی امور، سب انسان کی فطری ضروریات ہیں، اور اسلام نے انہیں دین کے دائرے میں شامل کیا ہے۔ جو دین فطرت کے مطابق نہ ہو، وہ دین الٰہی نہیں ہو سکتا۔ صوفی ازم کی انتہائیں اکثر فطری زندگی سے انکار کرتی ہیں، جس کے نتیجے میں دین ایک الگ تھلگ، غیر حقیقی اور زندگی سے کٹا ہوا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔

اسلام میں رہبانیت حرام ہے کیونکہ یہ دین کی جامعیت، فطرت، اور اس کے مشن سے متصادم ہے۔ دین نہ صرف تزکیہ نفس چاہتا ہے بلکہ تزکیۂ معاشرہ بھی۔ نہ صرف فرد کی نجات، بلکہ امت کی فلاح بھی۔ نہ صرف آخرت کی کامیابی، بلکہ دنیا میں عدل و قسط کا قیام بھی۔ اور ان تمام اہداف کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان دنیا سے فرار

نہیں بلکہ دنیا میں قیام، قیادت، اور خدمت کو شعار بنائے۔ یہی اسلام کا توازن ہے، یہی اس کا اعجاز ہے، اور یہی اس کی روح۔

صوفی ازم، خصوصاً وہ صورت جس نے دنیا سے کنارہ کشی، گوشہ نشینی، سماجی و سیاسی عمل سے لاتعلقی، اور صرف انفرادی روحانی تجربات پر زور دیا، صدیوں سے اسلامی معاشروں میں ایک مخصوص مزاج پیدا کرتا رہا ہے۔ اگرچہ اس کے ابتدائی مراحل میں تزکیۂ نفس، خلوص اور زہد جیسی صفات غالب تھیں، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ایک ایسے رجحان کی شکل اختیار کرلی جس نے اجتماعی ذمہ داریوں، سیاسی شعور، اور ظلم و طاغوت کے خلاف جدوجہد کو دین سے کاٹ دیا۔ یہی وہ خلا ہے جسے استعماری قوتوں اور صہیونی منصوبہ سازوں نے نہایت چالاکی سے استعمال کیا اور صوفی ازم کو اسلامی بیداری کے مقابل ایک متبادل "پرامن"، "مراقبہ پسند"، اور "غیر سیاسی" دین کے طور پر فروغ دیا۔

صوفی ازم کا وہ رخ جو عوام کو فقط ذکر، وجد، مزاروں کی زیارت، پیری مریدی، اور دنیا کی بے ثباتی پر وعظ دیتا رہا ہے، عملی طور پر مسلمانوں کو زندگی کے اصل میدانوں، جیسے سیاست، معیشت، تعلیم، اور دفاع سے دور لے گیا۔ جب قومیں اجتماعی سطح پر اپنے مسائل کے حل کے لیے اقدام کرنے کے بجائے خانقاہوں میں بیٹھ کر "اللہ بس، باقی ہوس" کا ورد کرنے لگیں تو وہ استعماری اور صہیونی قوتوں کے لیے ایک نرم ہدف بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی دور میں برطانوی، فرانسیسی، اور ڈچ استعمار نے انہی صوفی سلسلوں کو پسند کیا جو حکومتِ وقت سے ٹکراؤ کے بجائے صبر، خاموشی، اور دعا کی تعلیم دیتے تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں وہ مدارس اور خانقاہیں جنہوں نے جہاد یا بیداری کی بات کی، انہیں دبایا گیا، لیکن وہ صوفی درگاہیں جو فرار اور خاموشی کی تلقین کرتی تھیں،

ان کی مالی سرپرستی کی گئی۔ حتیٰ کہ بعض صوفی مزارات کو ریاستی تحفظ دیا گیا تاکہ عوام ان کی طرف مائل رہیں اور سیاسی مزاحمت کے میدان سے دور رہیں۔

صہیونی ایجنڈے کی کامیابی کا انحصار بھی مسلم امت کی بے عملی، فکری جمود، اور قیادت سے محرومی پر ہے۔ جب مسلمان قوم ایک عالمگیر نظام کے قیام کی بجائے ذاتی تزکیہ اور روحانی تجربات میں مشغول ہو جائے تو وہ اس قابل نہیں رہتی کہ وہ استعمار کے پیچیدہ نظام، جیسے سرمایہ دارانہ مالیاتی ادارے، میڈیا کی فکری یلغار، یا تعلیمی نظام کی تہذیبی آلودگی، کا مقابلہ کر سکے۔ صوفی ازم کے زیرِ اثر پیدا ہونے والا دین کا انفرادی و غیر سیاسی تصور، مسلمانوں کو ایک ایسی روحانیت میں الجھا دیتا ہے جو ظاہری طور پر نورانی، لیکن باطنی طور پر بے اثری اور سستی کا شکار ہوتی ہے۔ ایسے معاشروں میں انقلاب کی چنگاری بجھ جاتی ہے، قیادت کا جذبہ دم توڑ دیتا ہے، اور ظلم کے خلاف مزاحمت کو "دنیا سے محبت" یا "نفسانی غصہ" کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔

صہیونی قوتیں جو دنیا میں ایک غیر منصفانہ اور شیطانی نظام قائم رکھنا چاہتی ہیں، کبھی بھی ان مسلمانوں سے نہیں ڈرتیں جو مزاروں پر چراغ جلاتے ہیں، دھمال ڈالتے ہیں، یا فقط حلقہ ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ ان سے ڈرتی ہیں جو دین کو ایک نظامِ عدل کے طور پر سمجھتے ہیں، جو دنیاوی اداروں میں خدا کی حاکمیت نافذ کرنا چاہتے ہیں، اور جو "ظہور مہدیؑ" کو ایک عالمی الٰہی انقلاب کی تمہید مان کر اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ، مغربی تھنک ٹینکس، اور صہیونی منصوبہ ساز، اسلام کی انقلابی اور اجتماعی روح کو "انتہا پسندی" کہہ کر بدنام کرتے ہیں، اور اس کے مقابلے میں "صوفی اسلام" کو ایک پرامن، برداشت پسند، اور دنیا سے الگ تھلگ دین کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ اور یورپی

یونین جیسے ادارے بھی "صوفی اسلام" کی تشہیر کرتے ہیں تاکہ مسلمان اپنی اجتماعی اور انقلابی شناخت کو بھول جائیں اور استعمار کے لیے خطرہ نہ بنیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں صوفی ازم کا مخصوص رخ، چاہے غیر ارادی طور پر ہی سہی، صہیونی عزائم کی تکمیل میں غیر مستقیم معاون بن جاتا ہے۔ یہ روحانیت کے لبادے میں ایک غیر سیاسی، غیر انقلابی، اور بے ضرر مسلمان پیدا کرتا ہے جو دنیا کے ظلم و فساد کو محض خدا کی آزمائش یا قضا و قدر کا نتیجہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ وہ نہ طاغوت کو پہچانتا ہے، نہ اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، نہ امت کی قیادت کا خواب دیکھتا ہے، اور نہ ہی امام مہدیؑ کے ظہور کے لیے حقیقی زمینہ سازی کرتا ہے۔ ایسی حالت میں امتِ مسلمہ کی حالت زوال سے نکل کر جمود میں داخل ہو جاتی ہے، اور یہی وہ کیفیت ہے جو استعمار اور صہیونیت کی سب سے بڑی خواہش ہے۔

لہذا، اسلام میں رہبانیت اور اس سے ملتا جلتا صوفی ازم اس لیے قابلِ اعتراض ہے کہ یہ امت کو اس کے اس عظیم مشن، یعنی زمین پر خدا کے نظام کے نفاذ، سے غافل کر دیتا ہے۔ اور جب امت اپنا مشن بھول جائے تو دشمن کا مشن با آسانی مکمل ہو جاتا ہے۔ اس لیے آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان روحانیت کے ساتھ شعور، عبادت کے ساتھ قیام، اور ذکر کے ساتھ عمل کو جوڑیں۔ تاکہ وہ دین کے اصل روحانی و اجتماعی پیغام کو زندہ کر کے نہ صرف خود بیدار ہوں بلکہ امت کی بیداری کا ذریعہ بنیں، اور ظلم کے عالمی نظام کو للکار سکیں۔ یہی امام مہدیؑ کے ظہور کی حقیقی تیاری ہے، اور یہی استعمار و صہیونیت کی شکست کا نقطۂ آغاز۔

تصوف، رہبانیت اور عرفان

صوفی ازم، رہبانیت اور عرفان تینوں وہ اصطلاحات ہیں جو بظاہر روحانیت، باطنی سلوک اور خدا کی طرف رجوع کے تصورات سے جڑی ہوئی ہیں، لیکن حقیقت میں ان کے معانی، مقاصد، طریقہ کار اور اسلامی تعلیمات سے تعلق میں نمایاں فرق موجود ہے۔ ان تینوں تصورات کو ایک ہی ترازو میں تولنا دین کی فہم میں شدید غلطی کا باعث بنتا ہے، کیونکہ اگرچہ یہ سب کسی نہ کسی شکل میں قربِ الٰہی کی جستجو سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کے راستے، نتائج اور اثرات یکسر مختلف ہیں۔

صوفی ازم یا تصوف کی ابتدا اسلام کے ابتدائی دور میں زہد اور تقویٰ کے جذبے سے ہوئی۔ بعض صحابہ اور تابعین نے دنیا کی چکاچوند اور مال و دولت سے گریز کرتے ہوئے سادہ زندگی، عبادات، اور نفسانی خواہشات کے خلاف جدوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ یہ جذبہ دین کی روح سے ہم آہنگ تھا اور قرآن و سنت میں اس کی بنیاد موجود تھی۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ تصوف میں کئی غیر اسلامی عناصر شامل ہوتے چلے گئے۔ یونانی فلسفہ، ہندو مت کے باطنی نظریات، اور عیسائی رہبانیت کے اثرات نے اس کو رفتہ رفتہ خالص اسلامی بنیادوں سے ہٹا کر ایک ایسے نظام میں تبدیل کر دیا جس میں پیر و مرید کا کلیدی تعلق، مزاروں پر سجدے، وجد و رقص، اور بعض اوقات شرعی احکام سے ماورا ہونے کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ تصوف کے مختلف سلسلوں نے بعض اوقات اسلام کے اجتماعی، سیاسی اور

سماجی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے دین کو محض انفرادی باطنی تجربے اور روحانی مشقوں تک محدود کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا وہ جہاد جو نظامِ باطل کے خلاف قیام کا نام ہے، وہ خاموشی، برداشت، اور دنیا سے بے رغبتی کے نام پر پسِ پشت چلا گیا۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں صوفی ازم عملاً استعماری قوتوں کے لیے معاون بن گیا، کیونکہ یہ انسان کو دنیاوی تبدیلی اور ظلم کے خلاف مزاحمت سے غافل رکھتا ہے۔

رہبانیت اس سے بھی آگے بڑھا ہوا تصور ہے جو عیسائیت اور بدھ مت جیسے مذاہب میں پوری شدت سے رائج رہا ہے۔ رہبانیت میں انسان مکمل طور پر دنیا سے منقطع ہو کر خانقاہ، غار یا جنگل میں رہنے لگتا ہے۔ وہ نکاح، اولاد، معاشرت، سیاست اور روزمرہ زندگی کے تمام دینی و دنیاوی امور کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا سے قرب حاصل کرنے کے لیے دنیا سے کنارہ کشی اور جسمانی مشقت لازم ہے۔ اسلام نے اس تصور کو مکمل طور پر رد کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔" آپؐ نے خود نکاح کیا، تجارت کی، جنگیں لڑیں، حکومت قائم کی، عدل نافذ کیا اور ایک فعال معاشرہ تشکیل دیا۔ آپؐ کی سیرت اس بات کا عملی نمونہ ہے کہ دین، دنیا سے بھاگنے کا نام نہیں بلکہ دنیا میں رہ کر حق کے قیام کی جدوجہد کا نام ہے۔ رہبانیت نہ صرف انفرادی زندگی کو بے توازن کرتی ہے بلکہ اسلامی معاشرے کو اجتماعی ذمہ داریوں سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

اس کے برخلاف، اسلامی عرفان ایک ایسا تصور ہے جس کی جڑیں قرآن، سنت، اور عقل و فطرت میں پیوست ہیں۔ عرفان کا مقصد خدا کی معرفت حاصل کرنا ہے، لیکن یہ معرفت صرف کشف، خواب، وجد یا وجدان سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ علمی تدبر، قرآنی فہم، نفسی

مجاہدہ، اخلاقی تربیت اور معاشرتی شعور سے حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی عرفان دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے: نظری عرفان، جو فلسفیانہ سطح پر خدا، انسان، کائنات اور وجود کے درمیان تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے؛ اور عملی عرفان، جو انسان کو تقویٰ، تواضع، انکسار، خدمت خلق، اور حق کی نصرت کے ذریعے خدا سے قریب کرنے کا راستہ فراہم کرتا ہے۔ عرفان کا سچا مسافر دنیا سے بھاگتا نہیں بلکہ دنیا میں رہ کر نفس سے جہاد کرتا ہے، مظلوم کا ساتھ دیتا ہے، ظالم سے برسرپیکار ہوتا ہے، اور اللہ کی رضا کے لیے ایک منصف معاشرے کے قیام کی کوشش کرتا ہے۔

اسلامی عرفان اور تصوف میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ عرفان دین کے تمام پہلوؤں کو ایک وحدت میں دیکھتا ہے — فردی عبادات، اجتماعی عدل، نظامِ سیاست، معیشت، تعلیم، ثقافت، سب کچھ خدا کی اطاعت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جب کہ تصوف کی عمومی روش اکثر دین کو فرد کی باطنی کیفیت تک محدود کر دیتی ہے۔ اسی طرح، رہبانیت خدا کی محبت کے نام پر دنیا سے فرار کی ترغیب دیتی ہے، جبکہ عرفان دنیا کو ایک امتحان گاہ مان کر اس میں رہتے ہوئے خدا کی رضا کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ عرفان میں ولایت، قیادت، امامت، اور اصلاحِ معاشرہ جیسے مفاہیم کو عبادت کا درجہ حاصل ہے، جبکہ رہبانیت اور صوفی ازم میں ان مفاہیم کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے یا دنیاوی امور سمجھ کر ترک کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا، صوفی ازم، رہبانیت، اور عرفان تین مختلف زاویے ہیں۔ رہبانیت صریحاً اسلام کے منافی ہے اور صوفی ازم میں جزوی طور پر غیر اسلامی اثرات شامل ہو چکے ہیں جو بعض اوقات دین کے اجتماعی اور انقلابی پہلو کو کمزور کر دیتے ہیں۔ جبکہ عرفان، اگر صحیح اسلامی

بنیادوں پر ہو، تو وہ ایک متوازن اور ہمہ جہت دین فہمی کا ذریعہ ہے، جو نہ صرف انسان کو اپنے رب سے جوڑتا ہے بلکہ اسے دنیا میں عدل، قیادت، اور خدمت کے لیے بھی آمادہ کرتا ہے۔ یہی وہ عرفان ہے جو اہل بیتؑ کی تعلیمات اور قرآن کی روح کے مطابق ہے، اور جو امام مہدیؑ کے عالمی نظام عدل کے قیام کی تمہید بن سکتا ہے۔

تاریخِ اسلام میں "عرفان" ایک اہم روحانی، فکری اور اصلاحی میدان کے طور پر ہمیشہ موجود رہا ہے، لیکن اس کی تعبیرات مختلف ادوار میں بدلتی رہیں۔ عرفان کا مفہوم، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، خدا کی معرفت، نفس کی اصلاح، اور عالمِ ہستی میں الٰہی نظم کو پہچاننے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جو لوگ اس راستے پر چلے، ان میں بعض افراد واقعی اعلیٰ عرفانی مقام تک پہنچے اور دین کے فہم، امت کی رہنمائی، اور روحانی اصلاح میں مثالی کردار ادا کیا۔ البتہ کچھ افراد نے عرفان کے نام پر ایسے نظریات و اعمال کو فروغ دیا جو اسلام کی اصل تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

تاریخ کے معتبر عرفاء میں پہلا اور سب سے اعلیٰ مقام خود اہل بیت علیہم السلام کو حاصل ہے۔ حضرت علیؑ سے لے کر امام زین العابدینؑ، امام صادقؑ اور امام باقرؑ تک، ان ہستیوں نے نہ صرف معرفتِ الٰہی کی بلند ترین تعلیمات دیں بلکہ عملی طور پر امت کو عدل، علم، اور روحانیت کی راہ پر گامزن کیا۔ ان کا عرفان محض باطنی مشاہدات یا وجدانی تجربات پر مشتمل نہ تھا، بلکہ علم، عدل، تقویٰ، اور اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

اس کے بعد قرونِ وسطیٰ میں بعض ایسے عرفاء سامنے آئے جنہوں نے اسلامی عرفان کو فلسفہ، عقل، اور وحی کی روشنی میں منظم کیا۔ مثلاً شیخ شبستری، خواجہ عبد اللہ انصاری، سید

حیدر آملی اور بالخصوص صدر الدین شیرازی (ملا صدرا) جنہوں نے "حکمتِ متعالیہ" کے نام سے ایک ایسا فکری نظام تشکیل دیا جس میں عقل، وحی اور عرفان کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں عرفان صرف باطنی واردات نہیں بلکہ وجودی فلسفہ ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ابن عربی کا نام بھی تاریخی عرفاء میں بہت مشہور ہے، تاہم ان کی تعلیمات میں وحدت الوجود کے ایسے نظریات پائے جاتے ہیں جن پر علماء اسلام، بالخصوص مکتب اہل بیتؑ کے فقہاء اور متکلمین نے تنقید کی۔ ابن عربی کے بعض افکار میں تائیدِ ظالم اور تقویہ طاغوتی نظام جیسے خطرناک عناصر موجود ہیں جو صوفی مزاج سے متاثرہ عرفان کی انحرافی صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے معتبر مراجع اور اسلامی مفکرین نے ان کے بعض نظریات کو رد کیا ہے۔

جدید دور میں اسلامی عرفان کے میدان میں چند ایسے افراد ابھرے جنہوں نے نہ صرف باطنی تربیت پر زور دیا بلکہ دین کی سیاسی، اجتماعی اور تمدنی جہات کو بھی نمایاں کیا۔ ان میں امام خمینیؒ سب سے درخشاں مثال ہیں۔ وہ بیک وقت فقیہ، مجتہد، عارف، اور انقلابی قائد تھے۔ ان کے ہاں عرفان کا مفہوم صرف "خدا کی معرفت" تک محدود نہیں بلکہ "نظامِ طاغوت کے خلاف قیام"، "امت کی بیداری"، "نظامِ ولایت" اور "ظہورِ مہدیؑ کے لیے راہ ہموار کرنے" تک پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے اسلامی عرفان کو صوفی ازم اور رہبانیت سے ممتاز کر کے ایک ہمہ جہت، علمی اور انقلابی روح عطا کی۔ ان کی کتاب "شرح دعائے سحر"، "آداب الصلاۃ" اور "مصباح الہدایہ" عرفانِ اسلامی کی اعلیٰ مثالیں ہیں، لیکن ساتھ ہی

انہوں نے اسلامی حکومت کا قیام عملاً کر کے یہ ثابت کیا کہ حقیقی عرفان کا تقاضا ہے کہ انسان خدا کی معرفت کے ساتھ ساتھ زمین پر اس کے نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کرے۔

اسی طرح آیت اللہ بہجتؒ، آیت اللہ قاضی طباطبائیؒ، اور آیت اللہ حسن زادہ آملیؒ بھی ایسے معاصر عرفاء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے طہارتِ نفس، مجاہدۂ باطن، اور خالص دینی علم کے ذریعے عرفان کو فروغ دیا۔ ان میں سے بعض کا انداز زیادہ باطنی اور خلوت پسند تھا، مگر ان کی علمی میراث عرفانِ نابِ محمدی کے اصولوں پر قائم تھی۔

اہم بات یہ ہے کہ اسلامی عرفان اپنی اصل میں نہ دنیا گریزی کا نام ہے، نہ جذباتی وجد و حال کا، اور نہ ہی فلسفیانہ ابہام کا۔ یہ ایک زندہ، باعمل، اور عقل و نقل پر مبنی فہمِ دین ہے، جو فرد کو اصلاحِ نفس کے ساتھ ساتھ اصلاحِ معاشرہ، نفیِ طاغوت، اور ظہورِ امام مہدیؑ کی تیاری کا شعور دیتا ہے۔ جو عرفان انسان کو معاشرتی، سیاسی، تعلیمی اور تمدنی ذمہ داریوں سے غافل کر دے، وہ نہ اسلامی عرفان ہے اور نہ اہل بیتؑ کے عرفان کا نمائندہ۔ اسلامی عرفان کا حقیقی وارث وہی ہے جو شب بیداری میں اللہ سے راز و نیاز کرے، دن کو امت کے درد میں جیئے، اور زمانے کے فرعونوں کے خلاف بے خوف ہو کر کھڑا ہو۔ یہی عرفان کی روح ہے، یہی تاریخ کے سچے عرفاء کا پیغام ہے، اور یہی مہدوی انقلاب کے لیے فکری و عملی تیاری کا راستہ ہے۔

About Author: S. Jahanzaib Abidi is a distinguished author known for his extensive collection of articles covering a wide range of subjects, including philosophy, religion, education, politics, economics, media, and society. His prolific writings showcase a deep understanding and insightful analysis across diverse topics, making him a notable figure in the realm of article series.

With a keen intellect and a penchant for thorough exploration, Abidi's contributions offer readers a nuanced perspective on various issues, establishing him as a respected writer whose work resonates across different spheres of thought and discourse. His thought-provoking articles contribute significantly to the intellectual landscape, fostering a deeper understanding of complex subjects.